”چہارسُو“

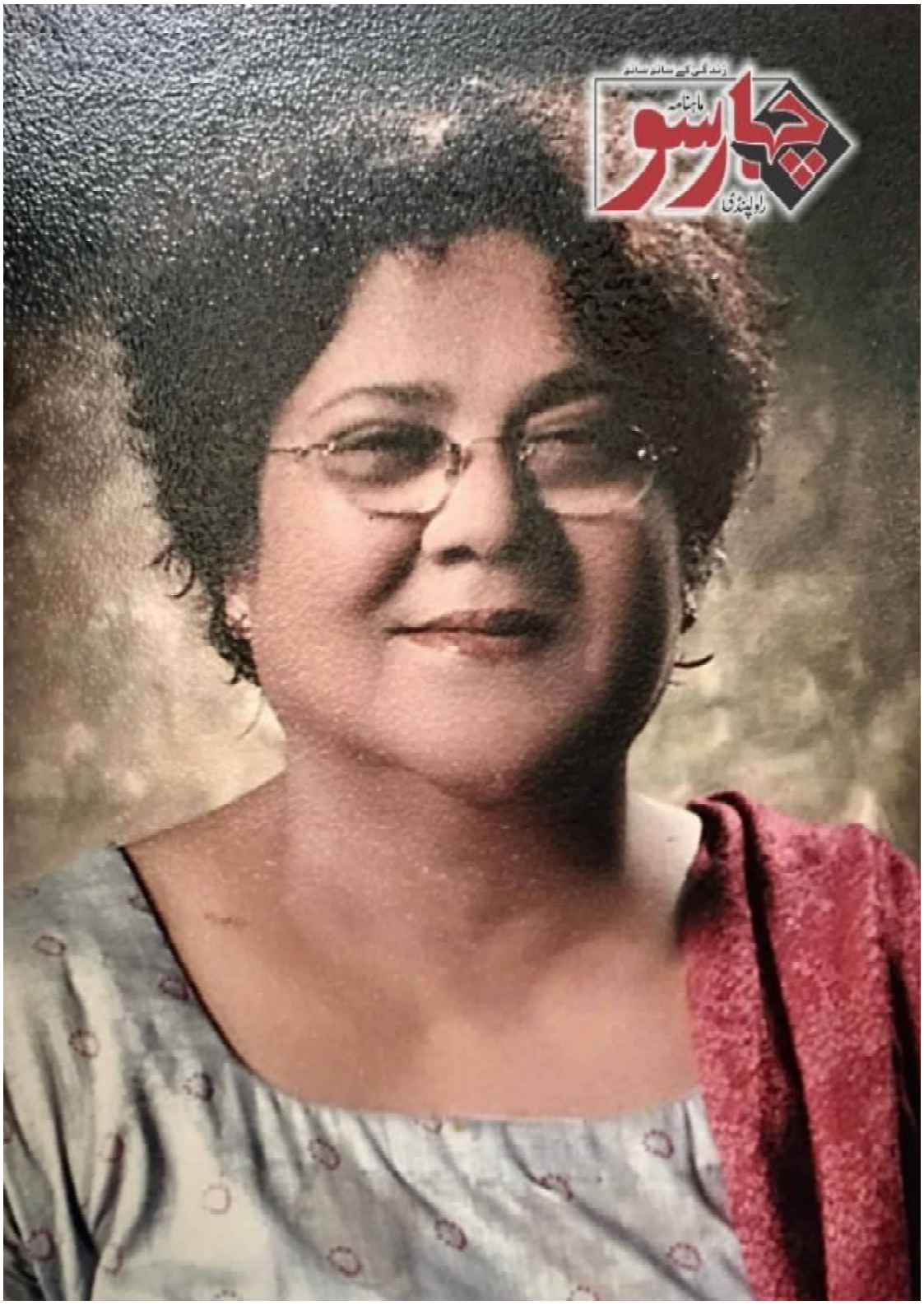

..... میں لاہور ہوں .....

ملکہ نور جہاں نے کہا تھا کہ میں اپنی جان فروخت کر کے اگر لاہور خرید لُوں تو پھر بھی یہ ایک سستا سودا ہوگا۔۔۔

میں نے بھی دنیا کے ایسے بڑے بڑے شہر چھوڑے ہیں جہاں لوگ آباد ہونے کو ترستے ہیں، میں نے نہ صرف وہ شہر چھوڑے بلکہ کُچھ عشق بھی چھوڑے، اُن عشقوں سے بے وفائی کی لیکن میں نے ہمیشہ لاہور سے وفا کی اور اس جادوئی شہر کے بام و در میں واپس آ گیا۔۔۔اور یہ ایک سستا سودا تھا۔اس شہر کی فضاؤں میں ایسے طلسم سرگوشیاں کرتے ہیں کہ کسی نے بھی انہیں سُنا تو وہ ہمیشہ کے لیے اس شہر بے مثال کا ہو گیا۔

آپ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، امرتا پریتم، خوشونت سنگھ، پران، اوم پرکاش، دیو آنند اور کامنی کوشل سے پوچھیے کہ جب مجبوراً انہیں لاہور چھوڑنا پڑا تو اُن پر کیا گزری؟ کنہیالال کپور لاہور سے نکلے تو نابھہ میں جا مقیم ہوئے، کسی نے پوچھا کہ آپ کسی بڑے شہر میں جا کر کیوں آباد نہیں ہوئے؟ کہنے لگے جب کوئی شہر لاہور جیسا ہوگا تو چلا جاؤں گا۔ کیول دھیر کی کتاب ''میں لاہور ہوں'' میں یہی لاہور ان کے لفظوں میں سانس لے رہا ہے۔اس میں کیا شک کہ وہ ایک بڑے لکھنے والے ہیں اور یہ انہوں نے ایک بڑی کتاب لکھی ہے۔ کیول دھیر کو دھیرے دھیرے پڑھتے آپ بھی لاہور کے طلسم میں گرفتار ہو جائیں گے۔

..... مستنصر حسین تارڑ

اشاعت:۲۰۲۱، قیمت:۸۰۰ روپے، دستیابی: علم و عرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

..... مشرف عالم ذوقی کا فکشن .....

ڈاکٹر کامران شہزاد کی مرتب کردہ کتاب ''مشرف عالم ذوقی کا فکشن'' ایک اہم ناول اور افسانہ نگار ادیب کی تفہیم کے لیے ایک اہم کتاب ہے۔مشرف عالم ذوقی ہمارے عہد کے ایک نمائندہ افسانوی نثر نگار ہیں۔ ہمارے ہاں عموماً نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے والی کتب مرتب کرنے کا رواج ہے کیونکہ اس سے دنیاوی منفعت کا حصول ممکن ہے اگر کوئی علم دوست ظاہری فوائد کے حصول کو نظر انداز کر کے محض علم و ادب کے فروغ کے لیے کام کرتا ہے تو یقیناً قابل مبارکباد ہے۔ ہمیں ڈاکٹر کامران شہزاد کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے ایک اعلیٰ پائے کے فکشن نگار کو سمجھنے کے لیے بہترین مضامین کا انتخاب ہمیں فراہم کیا ہے۔مشرف عالم ذوقی کو عام طور پر ایک منفرد ناول نگار کے طور پر جانا جاتا ہے اور ان کے افسانوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں وہ افسانہ نگار کے طور پر زیادہ قابلِ توجہ ہونے چاہیے کیونکہ انہوں نے بعض افسانے ایسے لکھے ہیں جو اپنے موضوع اور پیش کش دونوں حوالوں سے اردو کے بہترین افسانوں میں شامل ہونے کے لائق ہیں۔ انہوں نے بعض ناول ایسے بھی تخلیق کیے ہیں جو ان کے مخصوص اسلوب اور تخلیقی تجربے کے امین ہیں۔ڈاکٹر کامران شہزاد اردو کے ابھرتے ہوئے فکشن کے پارکھ ہیں۔قبل ازیں وہ ''فکشن اور تنقید کا تازہ اسلوب'' کے نام سے لکھی ہوئی اپنی کتاب سے اہلِ ادب کی توجہ حاصل کر چکے ہیں۔اس مجموعے میں انہوں نے ذوقی صاحب کے اہم ناولوں پر نمایاں لکھنے والوں کے مضامین کو جمع کیا ہے، جن میں سے چند شائع شدہ لیکن غیر مدوّن صورت میں بکھرے ہوئے تھے۔لیکن اس کی اصل خوبی یہ ہے کہ بیشتر مضامین انہوں نے ایسے ادیبوں سے خود تحریر کروائے ہیں جن کی فکشن کی سوجھ بوجھ پر انہیں اعتبار تھا یا جو خود اعلیٰ درجے کے فکشن نگار ہیں۔ایسے لکھنے والوں میں علی احمد فاطمی، محمد حمید شاہد، محمد حامد سراج، رحمان عباس، اقبال خورشید، حمید قیصر اور یونس خان کے نام نمایاں ہیں۔اس مجموعے میں ذوقی صاحب کے فکر و فن پر مضامین کے ساتھ ان کے ناولوں آتشِ رفتہ کا سراغ، لے سانس بھی آہستہ، نالۂ شب گیر، مرگ انبوہ، مردہ خانے میں عورت اور مسلمان کے خصوصی مطالعات بھی شامل ہیں۔اس مجموعے میں شامل ان کے اپنے تین مضمون ان کے فکشن کے متعلق تجزیے اور تفہیم کی عکاسی کرتے ہیں۔امید ہے وہ فکشن کی تنقید میں اسی طرح اضافہ کرتے رہیں گے۔

..... پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الحسن

اشاعت:۲۰۲۱، دستیابی: مثال پبلشرز، امین پور بازار، فیصل آباد

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد ۳۱،شمارہ:جنوری،فروری ۲۰۲۲ء

بانی مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِ سالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

○☆○

مدیرانِ معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

رابطہ: 537/D-1، گلی نمبر 18، ویسٹریج-III، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون: 8730433-8730633-51-(92+)

موبائل: 0558618-336-(92+)

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

۔ متاعِ چہارسو ۔

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی

تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عظمیٰ رشید

کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

میز پر رکھے ہاتھ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عذرا عباس ۶

کوئی لوٹا دے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عذرا عباس ۸

میں لائن کھینچتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عذرا عباس ۱۴

براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۶

حیرت کے اُس پار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عذرا عباس ۲۱

قسطوں میں بٹی محبتیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سلیم الرحمٰن ۲۳

نیند کی مسافتیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔افتخار جالب ۲۵

تانیثی حیثیت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر تنویر انجم ۳۰

ناقابلِ تسخیر تجسس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ثمینہ رحمٰن ۳۳

جب بیزاری آتی ہے۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر طاہرہ کاظمی ۳۵

شاعری کے دیوتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد حنیف ۳۷

اندھیروں کی سرگوشیاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔عذرا عباس ۳۸

گرگٹ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عذرا عباس ۴۰

بھیڑ میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عذرا عباس ۴۱

میں اور موسی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عذرا عباس ۴۳

نشاطِ زیست

نسیم سحر، شازیہ اکبر۔ ۴۸

افسانے

رخصتِ سحر گاہی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔شہناز خانم عابدی ۴۹

سرد موسم کی تپش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسرار گاندھی ۵۱

تعزیت کی سافٹ کاپی۔۔۔۔۔۔۔جمیل احمد عدیل ۵۴

ادھورا نِروان ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ذاکر فیضی ۵۷

کندھا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ ۶۰

برقِ ستم

وحیدہ نسیم، عبداللہ جاوید، آصف ثاقب، زاہد سعید، فیصل راجہ، نذیر قیصر، احمد سوز، نسیم سحر، ارشد سعید، مبارک صدیقی، ۶۱

افسانے

ریچھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فرخندہ شمیم ۶۵

لمحوں نے خطا کی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید احمد قادری ۶۶

دھوپ چھاؤں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رعنا کوثر ۶۸

ادھورے چہرے کے نقوش۔۔۔۔۔۔افتخار بلوچ ۷۱

عشق کا معیار

ڈاکٹر ریاض احمد، شاہد صدیقی، عمر قیاز قائل، تصور اقبال، جنید آزر، برجیش عنبر، ڈاکٹر نزہت شاہ، انجم جاوید، شیوشران بندھو، جاوید زیدی، محبوب خان اصغر، ڈاکٹر انیس الرحمٰن۔ ۷۴

ناول

خاکِ شفا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پیرزادہ آلِ انوار ۷۸

اُفق کے اُس پار

خوش باش شہزادہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فیروز عالم ۸۵

سماعت کے دریچے

عبداللہ جاوید، رضیہ اسماعیل، فیصل عظیم، ولاء جمال العسیلی، سمیرا سلیم کاجل، جمیل عثمان، رؤف خیر، سلیم انصاری، فرح کامران، انجم جاوید۔ ۸۸

آئینۂ فن

جدیدیت کے علمبردار۔۔۔۔۔ڈاکٹر صالحہ صدیقی ۹۳

پاپی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فیصل عظیم ۹۶

نشانِ راہ

کھائیومت فریب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سلیم شہزاد ۹۸

مجلسِ چہارسو

ڈاکٹر ماہ نظیر سے مکالمہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۱۰۶

ایک صدی کا قصہ

وجے بھٹ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۳

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔۔وجیہ الوقار ۱۱۷

☆

عذرا عباس ایک پاکستانی شاعرہ، افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ روزمرہ زندگی کے تجربات کی عکاسی، عام بول چال کے اسلوب، بے تکلف اظہار اور نثری نظموں سے دلچسپی کے حوالے سے جدید شعری ادب میں عذرا عباس کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ وہ کراچی میں پیدا ہوئیں اور کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا۔ عذرا عباس کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ہوا۔ ان کی طویل نظم ''نیند کی مسافتیں'' ۱۹۸۱ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ اس نظم کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور اسے اردو کی نثری نظم کی بنیادی کتابوں میں سے ایک تسلیم کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں عذرا عباس کی نظموں کے پانچ مجموعے ''میز پر رکھے خواب'' (۱۹۹۸ء)، ''میں لائنیں کھینچتی ہوں'' (۱۹۹۶ء)، ''حیرت کے اُس پار'' (۲۰۰۶ء)، ''اندھیرے کی سرگوشیاں'' (۲۰۱۶ء)، ''بھیڑ میں'' (۲۰۱۸ء) کے نام سے سامنے آ چکے ہیں۔ نظم کے ساتھ ساتھ عذرا عباس نثر میں بھی ایک منفرد انداز کی حامل ہیں۔ ''میرا بچپن'' ان کی پہلی نثری تصنیف ہے جو ان کی خودنوشت کا ایک حصہ ہے ''راستے مجھے بلاتے ہیں'' کے نام سے ان کا ایک افسانوی مجموعہ بھی منصۂ شہود پر آ چکا ہے اور ان کا ناول ''میں اور موی'' اور یادداشتیں ''درد کا محلِ وقوع'' بھی شائع ہو چکی ہیں۔

میز پر رکھے ہاتھ (۱۹۸۸ء)

بجھن

میں نے زندگی کو دو حصوں میں
تقسیم کر دیا ہے
ایک وہ حصہ جہاں میرا جسم
تند ہواؤں میں مدہوش ہو کر
تجھ سے گفتگو کرے گا
ایک وہ حصہ جہاں تو نے
میرے پاؤں گاڑ دیے ہیں
جو میں نے تجھ سے نصب کر دینے کی خواہش میں
صدیوں کی
التجاؤں میں گزارا
وہ حصہ میں نے آزاد کر دیا ہے
سیڑھیاں آہستہ آہستہ چڑھتے ہوئے
میرا جسم
ہچکولے کھانے لگا ہے
شب بیداری
تیری آنکھوں میں بھی ہو گی
میری آنکھیں
بند ہونا بھول گئیں
خوشبوؤں کے درمیاں
سوتے جاگتے
اور بچھڑتے ہوئے لمحوں میں
جب ساکت پانیوں کے نصیب
سو جاتے ہیں
مجھے تیرا لمس یاد نہیں رہتا
اور میں بے قراری کے بوجھ تلے
دب کر
سسکیاں لیتی ہوں
یہ سارے فاصلے
جو صدیوں میں
بچھے ہوئے ہیں
میرے پیغامبر کے بازوؤں میں
جھول رہے ہیں
میرا جسم کانٹوں میں
الجھ گیا ہے
وہ کشتی جو میں نے
اپنے ہاتھوں کو زخمی کر کے
سالہا سال کی طوالت سے
تیار کی تھی
موجوں کے بے رحم حوالوں میں
الجھ گئی ہے
زمین کا راستہ کس سرنگ سے گزرتا ہے
میرے بازوؤں میں سکت پیدا ہو جائے
پھر ایک بار پانیوں کی طرح
بدل جائے
تو میں اس دن کے روشن اشارے پر
مڑ جاؤں
جہاں میں نے تجھ سے
پہلی بار
معاہدہ کیا تھا

ایک روٹی تک پہنچنے کے لیے

ایک روٹی تک پہنچنے کے لیے
ہم اپنے خواب بیچ دیتے ہیں
اپنے رنگ دھوڈالتے ہیں
اپنی خوشبو اڑا دیتے ہیں
اپنی آنکھیں دھندلی کر لیتے ہیں

اور اپنے جسموں کو صدہا سال سے
چلتی ہوئی چکی میں
پیس ڈالتے ہیں
اور کیا کرتے ہیں؟
اور کیا نہیں کرتے!
ہمیں کوئی بھی اختیار نہیں
بس ایک روٹی تک
پہنچنے کے لی

کہیں سے کوئی نقطہ آ جائے

کہیں سے کوئی نقطہ ایسا آ جائے
جو کسی بھی لفظ پر
نہ لگایا جا سکے
اور وہ نقطہ
علیحدہ
الگ تھلگ
کھڑا رہے
کسی بھی گمان کے سہارے
اس انتظار میں
کہ کوئی ایسا لفظ آ جائے
جس پر اسے لگایا جائے
یہ بھی ہو سکتا ہے
وہ نقطہ
صدیوں اس لفظ کا
انتظار کرتا رہے
یہ بھی ہو سکتا ہے
صدہا سال گزر جانے کے بعد
یہ سارے لفظ بوسیدہ ہو جائیں
اور گل سڑ کر
تحلیل ہو جائیں
اور کچھ باقی نہ رہے
صرف وہ نقطہ رہ جائے

○

ہاتھ کھول دیے جائیں

میرے ہاتھ کھول دیے جائیں
تو میں
اس دنیا کی دیواروں کو
اپنے خوابوں کی لکیروں سے
سیاہ کر دوں
اور قہر کی بارش برساؤں
اور اس دنیا کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر
مسل دوں
میرا دامن خوابوں کے اندھیرے میں
پھیلا ہوا ہے
میرے خواب پھانسی پر چڑھا دیے گئے
میرا بچہ میرے پیٹ سے چھین لیا گیا
میرا گھر قہر خانوں کے اصطبل کے لیے
کھول دیا گیا
مجھے بے زین گھوڑے پر
اندھیرے میدانوں میں اتار دیا گیا ہے
میری زنجیر کا سرا کس کے پاس ہے؟
قیامت کے شور سے پہلے
میں اپنی دھجیوں کو سمیٹ لوں
اپنے بچوں کو آخری بار غذا فراہم کر دوں
اور زہر کا پیالہ پی لوں
میری زنجیر کھول دی جائے
اس کا سرا کس کے ہاتھ میں ہے؟

○

کوئی لوٹا دے

عذرا عباس

کہانی شروع کرنے سے پہلے یادداشت پر قابو پانا ضروری ہے۔

ایک ہلکی سی روشنی میرے سامنے۔ وہ بہت پہلی صبح ہے۔ چھوٹے سے کمرہ نما برآمدے میں ہمارے سامنے چائے کے پیالے رکھے ہیں۔ ہم سب ایک دری پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں اور گرم گرم پھلکوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ذرا فاصلے پر ایک پیڑے پر چولھے کے سامنے بیٹھی ہماری ماں چمٹے سے کھٹ سے روٹی پکڑتی ہے اور توے سے اتار کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔ وہیں کہیں ہمارا باپ بھی بیٹھا ہے۔ ماں کا اس وقت کا سانولا چہرہ، جس پر بڑی بڑی آنکھیں رکھی ہوتی تھیں، مجھے دھندلا سا یاد ہے۔ مجھے یہ وقت شاید اس لیے یاد رہ گیا کہ روٹی اور چائے کا مزہ جو اس وقت میرے منہ میں آ رہا تھا، آج تک باقی ہے۔

پھر اس کے بعد بالکل ایسے جیسے دن نکلتا جاتا ہے اور چیزیں روشن ہوتی جاتی ہیں۔ میری یادداشت اس سے پہلے کی میرے پاس نہیں ہے۔ ہاں شاید اس کے آس پاس کچھ کچھ۔۔۔ جیسے ایک منظر میں مَیں ایک کونے میں کھڑی اپنی چھوٹی بہن کو ننگ دھڑنگ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ مجھے یاد آ رہا ہے، وہ پہلی بار سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

شام کو بالکونی میں کھٹولے پر کھڑے ہو کر بگلوں کا بسیرا کرنے جاتے دیکھ کر چپکے چپکے ہاتھوں کے انگوٹھوں کو ایک دوسرے پر رگڑتے ہوئے آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ کہنا ''بگلے بگلے دودھ لے سونے کی کٹوری دے۔'' مجھے یاد نہیں یہ میں نے کس سے سیکھا تھا۔

پھر بالکل اسی گھر میں ایک دن علی الصبح دھیمے دھیمے شور کی آواز میرے کان میں پڑتی ہے۔ میں جاگ جاتی ہوں۔ دوسرے کمرے میں پانی گرنے کی آوازیں اور میری ماں کی کراہوں کی آوازیں، پھر ایک ننھے بچے کی باریک سی چیخ۔ میرے لیے وہ یاد بھی بہت دنوں تک ملگجی سی روشنی میں چیزیں ڈھونڈنے کی طرح رہی۔

مجھے یاد نہیں اس گھر میں کیسے سیڑھیوں سے نیچے جاتے تھے اور کیسے چھت پر، اور کیسے میں اپنی چھت سے دوسری بلڈنگ کی سیڑھیاں اتر جاتی تھی۔ ایک منظر میرے سامنے ہے۔ میں چھت پر چوکیدار سے کہہ رہی ہوں ''دلّی دکھا دو'' میری کنپٹیوں پر اپنی ہتھیلیاں رکھ کر وہ اونچا کر دیتا ہے۔ میں دور تک دیکھتی ہوں۔ اس وقت مجھے پتا نہیں تھا دلّی کیا ہے۔

پھر میں سیڑھیاں اتر رہی ہوں جو دوسری بلڈنگ میں جاتی ہیں، جہاں پہلی سیڑھی ختم ہوتے ہی ایک لڑکی اپنے گھر کے دروازے پر ایک وہیل چیئر پر بیٹھی ہے۔ اس واقعے کو گزرے کتنے سال گزر گئے تھے، نہیں معلوم۔ لیکن میری یاد میں وہ لڑکی کبھی چھت سے ٹنگے جھولے پر بیٹھی ملتی اور کبھی وہیل چیئر پر، اور اس کی آنکھوں کا انتظار بھی مجھے یاد ہے۔ وہ میری کنگھی کر رہی ہے، مجھے گود میں سلا رہی ہے۔ میں وہاں سے جب گھر جاتی ہوں تو میری ماں مجھے مار رہی ہے۔ کہاں گئی تھی؟ پتا نہیں وہ خود مجھے کیوں نہیں روکتی تھی۔ میں کیسے وہاں چلی جاتی تھی اور کب تک جاتی رہی۔

مجھے یاد آ رہا ہے بارش کے پانی میں کھیلتے ہوئے اچانک آہستہ آہستہ جاتی ہوئی گاڑی کے پیچھے لٹک جانا۔ گاڑی تیز ہوتی ہے، میں پیچھے لٹکی ہوں۔ لوگ جا رہے ہیں۔ بارش کا پانی چاروں طرف جھپ جھپ ہو رہا ہے۔ لوگ گاڑی رکوا رہے ہیں۔ گاڑی رکتی ہے اور میں سڑک پر کھڑے پانی میں جھٹکے سے گر جاتی ہوں اور غوطے کھانے لگتی ہوں۔ شور مچ رہا ہے۔ کوئی میرا ہاتھ پکڑ کر لے جا رہا ہے۔ ابھی مرتے مرتے بچی ہے۔ پتا نہیں وہ میرا باپ تھا یا بھائی۔

ایک سڑک سے گزرتے ہوئے میں ایک ٹھیلے کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہوں۔ ٹھیلے کے اوپر چھجا سا بنا ہے۔ رنگ برنگے کپڑے پر، جو اس ٹھیلے کے چاروں طرف لپٹا، آدھے شیر اور آدھے آدمی کی تصویر بنی ہے۔ کوئی چلّا رہا ہے، آدھا آدمی آدھا شیر۔ بھیڑ لگی ہے۔ میں ٹھیلے کے نیچے گھس جاتی ہوں۔ آدھے شیر کی کھال لٹک رہی ہے۔ مجھے جانے کیا سوجھتا ہے۔ آدھے شیر کی کھال دونوں مٹھیوں سے زور سے گھسیٹتی ہوں اور ٹھیلے سے باہر بھاگتی ہوں۔ بہت سے لوگ ہنس رہے ہیں۔ کچھ لوگ میرے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ پتا نہیں میں نے کب وہ کھال چھوڑی اور کیسے گھر پہنچی۔

ایک اور منظر میرے سامنے ہے۔ میں ٹائلٹ میں بیٹھی ہوں۔ میرے سامنے اوپر دیوار پر ایک چھپکلی چپکی ہوئی ہے۔ میں اس چھپکلی سے باتیں کر رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ چھپکلی میری باتیں سن رہی ہے۔ باہر ٹائلٹ کا دروازہ پیٹا جا رہا ہے۔ مجھے یہ منظر ایک بار کا یاد ہے، لیکن ایسے یاد ہے جیسے میں بہت دنوں تک اس چھپکلی سے باتیں کرتی رہی ہوں۔

یادداشتیں بالکل اس طرح ہیں جیسے چیزیں اندھیرے میں پڑی ہوں اور آپ ٹارچ کی روشنی میں ٹٹول رہے ہوں۔ بعض دفعہ یہ ایک دم بھک سے روشنی میں اس طرح آ جاتی ہیں جیسے سو پاور کا بلب جل جائے اور سب کونوں کھدروں میں پڑی ہوئی مل جائیں۔ بعض دفعہ دھندلی، یا ایک دم اندھیرے میں۔ میں انہیں اندھیرے میں ٹٹول رہی ہوں۔ کچھ تو یوں سامنے پڑی ہیں اور مجھے حیرت میں ڈال رہی ہیں اور خود مجھے دریافت کرنے میں میری مدد کر رہی ہیں۔ کن کن چیزوں نے مجھے مل کر بنایا ہے۔

مجھے اس دن بہت تیز بخار ہے۔ میرا باپ میرے پائنتی بیٹھا ہے اور کپڑے سے میرے پاؤں کے تلوے مل رہا ہے۔ کمرے میں دھندلکا سا ہے۔ میرے بہن بھائی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ میرا باپ مجھ سے پوچھ رہا

''چہارسُو''

ہے''کیسی ہو؟ کیا چاہیے؟ کیسا لگ رہا ہے؟''میں کبھی کبھی آنکھیں کھولتی ہوں،اور سامنے کھڑکی میں ٹنگے پنجرے کی طرف دیکھتی ہوں۔تین چار دن ہوئے میرے بھائی نے نیا پنجرہ اور ایک چڑیا خریدی ہے۔چڑیا پنجرے میں اِدھر اُدھر پھدک رہی ہے۔مجھے اپنی اس وقت کی کوئی بھی کیفیت یاد نہیں۔صرف اتنا کہ میں اپنے باپ سے پنجرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہوں''اسے اڑا دو''مجھے اپنے بھائی کی حالت بھی اس وقت کیا ہوئی یاد نہیں لیکن میں دیکھ رہی ہوں، وہ مجھے بہلانے کے لیے سارے کمرے کی کھڑکیاں، دروازے بند کرتے ہیں اور چڑیا کو پنجرے سے میرے سامنے نکال دیا جاتا ہے۔چڑیا بعد میں میری آنکھوں سے بچا کر دوبارہ پنجرے میں ڈال دی جائے گی۔لیکن چڑیا روشن دان کے چھوٹے سے ٹوٹے ہوئے شیشے سے باہر نکل جاتی ہے۔مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ اسی دن میرا بخار اتر گیا تھا۔

ایک اور منظر اکثر میری نگاہ میں اپنی یاد کے ساتھ آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ میں رات میں اچانک نیند سے اٹھتی ہوں۔گھر میں سناٹا ہے۔میں چاروں طرف دوڑ کر اپنے گھر والوں کو ڈھونڈ رہی ہوں۔مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا۔میں باہر بالکونی سے لٹک کر سیڑھیوں کو دیکھتی ہوں۔میں رو رہی ہوں اور اپنی ماں کو آواز دے رہی ہوں۔پھر میں دیکھتی ہوں کہ میری ماں، باپ اور بہن بھائی سیڑھیوں سے اوپر چڑھتے ہوئے آ رہے ہیں۔شاید وہ مجھے سوتا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔انہوں نے مجھے اکیلا کیوں چھوڑ دیا، مجھے یہ پتا نہیں چلا۔میں نے اکثر اپنی ماں سے اس کے بارے میں پوچھا بھی لیکن وہ خاموشی سے مجھے تکنے لگتی تھی۔مجھے آج بھی یاد ہے میں پہلی دفعہ کسی خوف سے ملی تھی۔

دوسرا خوف مجھے اس ریڈیو کی آواز کا یاد رہ گیا ہے جب میں اپنے برابر والے گھر میں کھیل رہی ہوں۔ریڈیو بج رہا ہے۔اچانک اس میں سے کسی بچے کی آوازیں آنے لگتی ہیں،''بچاؤ، بچاؤ''وہ بچہ پانی میں ڈوب رہا ہے لیکن اس کی ماں گھر میں تیار ہو رہی ہے۔بچہ ماں کو آوازیں دیتے دیتے ڈوب جاتا ہے۔ ماں بچے تک نہیں پہنچتی۔ان آوازوں سے مجھے یہی کہانی سمجھ میں آتی تھی۔میں وہاں زور زور سے رونے لگتی ہوں۔وہ لوگ مجھے بہلا رہے ہیں۔وہ خوف میری پیٹ میں بھر گیا تھا۔

ایک اور منظر جب اس بلڈنگ میں برابر والے گھر کے چھوٹو سے میری لڑائی ہو جاتی ہے۔اس دن چھوٹو نے مجھے بہت مارا تھا۔میں روتی ہوئی اپنے باپ کے پاس گئی تھی۔میرا باپ پان چباتے ہوئے میری ماں سے باتیں کر رہا تھا جو اس کے قریب سروتے سے چھالیہ کتر رہی تھی۔میرے رونے پر میرے باپ کو اچانک بہت غصہ آیا۔جو منظر مجھے یاد ہے اس میں چھوٹو کا باپ دروازے کی جالیوں کے پیچھے کھڑا ہوا دروازے کو تختی سے بند کر رہا ہے اور میرا باپ ان جالیوں سے اپنے پان کی پیک اس کے جھانکتے ہوئے چہرے پر پھینک رہا ہے۔بعد میں مَیں اور چھوٹو دونوں دوست بن گئے تھے۔لیکن میرے باپ کی چھوٹو کے باپ سے بات چیت بند ہو گئی تھی۔میرا باپ میری بعد میں ہونے والی لڑائیوں پر اکثر پہلی لڑائی یاد کر کے مجھے سناتا رہا۔

میں سیڑھیاں چڑھ رہی ہوں۔میری ماں میرے آگے سیڑھیاں چڑھ رہی ہے۔میں اپنی ماں کے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے قدم دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیوں پر قدم رکھ رہی ہوں۔وہ میرا پہلا دن ہے جب مجھے اسکول لے جایا جا رہا ہے۔مجھے اپنی ماں کے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے قدم آج بھی یاد ہیں جو مجھے پہلی دفعہ اسکول لے جا رہے تھے۔

ایک یاد میرے ذہن میں بہت واضح ہے۔یہ کوئی نئی جگہ ہے۔اب وہ بلڈنگ نہیں ہے۔میرے سامنے دور تک پھیلا ہوا میدان ہے اور اندھیرے میں کوارٹروں سے ذرا فاصلے پر بچھی ہوئی چارپائیاں جن پر ہم لیٹے ہوئے ہیں۔میں اپنے باپ کے ساتھ لیٹی ہوئی ہوں۔بہت دور کسی سڑک پر گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ وہ گاڑیاں میدان کی طرف رخ کر کے مڑتی ہوئی کہیں دور چلی جاتی ہیں۔لیکن میدان میں مڑتے ہوئے دور سے ان کی روشنی مجھے ایسی لگتی ہے جیسے یہ روشنیاں میرا پیچھا کر رہی ہیں اور میں خوف سے دیر تک جاگتے جاگتے جانے کب سو جاتی ہوں۔

ایک اور منظر ہے۔میں علی الصبح اٹھ کر کوارٹروں سے ملی ہوئی گلی میں گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہوں۔اچانک ایک کوارٹر کے پاس مجھے ایک عجیب سی خوشبو کا احساس ملتا ہے۔میں رک جاتی ہوں اور اس کے دروازے کے جھری سے ناک لگا کر دیر تک کھڑی رہتی ہوں۔پھر یہ روز ہونے لگتا ہے۔سب منع کرتے ہیں۔میری پھوپھی جو مجھے اکثر اس گھر میں نظر آتی ہے، مجھ پر کڑی نگاہ رکھتی ہے۔لیکن میں روز سب کو سوتا چھوڑ کر اور کبھی سب کی نظروں سے بچ کر اس کوارٹر کے دروازے کی جھری میں ناک دے کر دیر تک کھڑی رہتی ہوں۔ایک دن وہ دروازہ کھل جاتا ہے۔میں اچانک دروازہ کھلنے سے اندر جا گرتی ہوں۔ایک عورت مسکرا کر مجھے دیکھتی ہے، جیسے وہ میری اس حرکت کو جان گئی ہو۔خوشبو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی ہے۔میں زور زور سے سانس لے رہی ہوں۔اس عورت کی آنکھوں میں حیرت بھی ہے۔مجھے یاد نہیں اس کے بعد میں کب تک وہاں جاتی رہی۔

میں ایک مکتب میں بیٹھی ہوئی ہوں۔بہت بڑا میدان پار کر کے مجھے وہاں پہنچایا گیا ہے۔سرخ مٹی کی سیڑھیاں، اس کے ایک چبوترے پر ٹاٹ پر بہت سے بچے بیٹھے ہیں۔وہ ایک آواز میں ایک ہی جملہ دہرا رہے ہیں۔مجھے بیٹھنے سے پہلے بستہ اور تختی دی جاتی ہے۔میں وہیں ٹاٹ پر بیٹھ جاتی ہوں۔ ہمارے برابر بھی ایک کلاس ٹاٹ پر بیٹھی ہے۔وہ بچے بھی ایک ہی آواز میں ایک جملہ دہرا رہے ہیں''ہری ہری ٹہنیوں پر ہرے ہرے طوطے بیٹھے ہیں''سامنے بیٹھی ہوئی استانی مجھے خاموش کرتی ہے۔میں سہم جاتی ہوں۔میرے ساتھ بیٹھے ہوئے بچے بھی سہمے ہوئے ہی ہیں۔میں اپنے چاروں طرف ہری ہری ٹہنیاں اور ہرے ہرے طوطے ڈھونڈتی ہوں لیکن وہاں ہمارے چاروں طرف صرف دھوپ سے بھرا چبوترا ہے۔کھلے ہوئے چبوترے پر ٹاٹ بچھے ہوئے ہیں۔اس دن

''چہارسُو''

اسکول سے واپسی پر مجھے تختی اور تختی پر پوتنے کی مٹی دی جاتی ہے۔

مجھے یاد ہے تختی پوتنا مجھے بہت برا لگتا تھا۔ اس دن بھی میں تختی پوت کر نہیں لے گئی تھی۔ کلاس کی سب سے بڑی لڑکی جو مجھے اچھی نہیں لگتی تھی میرے سر پر کھڑی مجھ سے پوچھ رہی تھی، ''تختی کیوں پوت کر نہیں لائی؟'' مجھے اس کا چہرا بھی تختی کی طرح سپاٹ لگا تھا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ مجھے یاد آ رہا ہے میں تختی اس کے سر پر مار رہی ہوں اور اپنا بستہ اور جوتے چھوڑ کر بھاگ رہی ہوں۔ میں اس کے بعد اس اسکول میں نہیں گئی۔ مجھے اس اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔ لیکن وہ اسکول مجھے یاد رہ گیا ہے۔ میرے کانوں میں کبھی کبھی یہ آواز گونجتی ''ہری ہری ٹہنیوں پر ہرے ہرے طوطے بیٹھے ہیں۔''

بہت سے ایسے منظر جنہیں شاید نہیں بھلانا چاہیے تھا، ہو سکتا ہے میں بھلا بیٹھی ہوں۔ لیکن جو یاد رہ گئے ہیں وہ کیوں یاد رہ گئے ہیں مجھے پتا نہیں۔

ایک بار پھر اک اسکول میں جہاں مجھے ''بابا بلیک شیپ ہو یو انی وول'' یاد کرائی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ٹیچر ہر لائن پر ایک حرکت بھی کرتی جا رہی ہے۔ اس کی نقل ہم سب بچوں کو کرنا پڑ رہی ہے۔ مجھے نظم سے زیادہ حرکت اچھی لگ رہی ہے۔ شاید ان حرکات کی نقل میں نے اچھی کی تھی۔ مجھے نرسری سے پہلی کلاس میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ جہاں میری بڑی بہن بھی بیٹھی ہے۔ میں نے خود کو اپنی بڑی بہن سے چھوٹا نہیں سمجھا۔ میں بہت خوش ہوں۔ میری بڑی بہن چپ چپ سی مجھے دیکھ رہی ہے۔

منظر بہت سے میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ لیکن بعض کے وقت کا تعین نہیں کر پا رہی ہوں۔ وہ پہلے کے ہیں یا بعد کے۔ مجھے جو یاد آتا جا رہا ہے اسی تسلسل سے لکھ رہی ہوں۔

ایک وہ یاد جب میں اپنے باپ اور بہنوں کے ساتھ ٹرام پر جا رہی ہوں۔ میرے سامنے وردی میں ایک سفید آدمی بیٹھا ہے جو مجھے گھور رہا ہے۔ میرے ذہن میں اس کا نوجوان چہرہ آتا ہے، بڑی بڑی کشادہ آنکھیں۔ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں اس کے گھورنے پر تھوڑی تھوڑی دیر میں اس کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ میرا باپ بالکل میرے برابر میں بیٹھا ہے۔ وہ شخص اچانک میری طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ میں فراک جھٹک کر اس کی گود کی طرف بڑھتی ہوں۔ پھر وہ شاید میرا نام پوچھ رہا ہے۔ میں اس وقت سب کو نظر انداز کیے ہوئے ہوں۔ مجھے اپنے باپ کے تاثرات یاد نہیں، صرف اتنا یاد ہے کہ ٹرام رکتی ہے اور وہ شخص مجھے گود میں لیے لیے اترتا ہے۔ ہم سب کو بھی شاید وہیں اترنا تھا۔ سامنے ٹھیلے پر چیزیں بیچنے والا کھڑا ہے۔ وہ ٹھیلے کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے اور گلابی بُندے میرے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ باقی مجھے کچھ یاد نہیں، ابا کا سلوک، اور یہ کہ وہ شخص کہاں گیا۔ بس اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی کیفیت اور اپنی ہمک جو اس کے ہاتھ پھیلانے پر میرے اندر پیدا ہوئی تھی۔

شاید بہت دنوں کے بعد، یا انہیں دنوں کے اردگرد، میں ایک خواب دیکھ رہی ہوں۔ وہی شخص ایک بہت اونچے گھوڑے پر ہمارے تین منزلہ فلیٹ کی بالکونی سے لگا کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ اس کا چہرہ ایک بڑے چوڑے گول تھال کی طرح بالکونی کی دیوار سے جھانک رہا ہے، جس پر وہی بڑی بڑی کشادہ آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ میں خوف سے بھاگ کر باہر کے دروازے کی طرف جاتی ہوں۔ دروازہ کھولتی ہوں تو ان گنت بچوں کی بھیڑ دروازے سے اندر داخل ہونے لگتی ہے جو مجھے باہر جانے کا راستہ نہیں دیتے۔ دہشت سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ نہ جانے اس خواب کا حقیقت سے کیا تعلق ہے، مجھے آج تک پتا نہیں چل سکا۔

ایک منظر میرے گھر میں ایک بوڑھے کا اضافہ ہوتا ہے۔ سرخ و سفید چہرے والا بوڑھا جس کو میں دادا ابا کہتی ہوں۔ دادا ابا جو مجھے یاد ہیں، ہر وقت میرے پیچھے پڑے رہتے تھے، ''چپل پہنو، منہ دھو، پاؤں دھو'' مجھے ننگے پیر پھرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ جب میں ان کے سامنے گرد و غبار سے بھرے پاؤں لے کر کھڑی ہوتی تو دادا ابا کا چہرہ اور سرخ ہو جاتا۔ ''مُر دی تو باز نہیں آئے گی'' میرے سارے بہن بھائی مجھے یاد نہیں کبھی ننگے پیر رہنے پر دادا ابا کی چھڑی سے پٹے ہوں۔ دادا کی اور میری جنگ جاری رہتی۔ وہ مجھے راتوں کو اٹھا کر نماز پڑھواتے، سخت سردی میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے ہوئے میں شور مچا مچا کر روتی، لیکن ایک چھڑی میرے سر اور کمر پر رینگتی۔ باقی گھر والے دم سادھے جانے کیا کر رہے ہوتے۔

ایک دن دادا مجھ سے گرم پانی سے پاؤں دھلوا رہے ہیں۔ میں ان کے پاؤں دھو رہی ہوں اور روتی بھی جا رہی ہوں۔ میں کیوں رو رہی تھی، مجھے یاد نہیں۔ دادا کا مسکراتا ہوا چہرہ میرا غصہ بڑھا رہا ہے۔ پھر وہ میرے پاؤں دھلوا رہے ہیں۔ ''یہیں دھو۔ میرے سامنے'' میں پاؤں دھو کر پاؤں میں کھڑاؤں ڈالتی ہوں اور کھڑ کھڑ کر کے دادا کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہیں۔ ''دادا ابا!'' وہ سر اٹھاتے ہیں۔ ''یہ دیکھیں!'' میں اپنی کھڑاؤں ایک ایک کر کے پاؤں سے اچھالتی ہوں، اور ان کے سامنے ننگے پیر بھاگتی ہوئی باہر نکل جاتی ہوں۔ پھر بڑی دیر تک ان کی چھڑی میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔

ایک دن وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں، ''دو پیاز لاؤ۔'' میں پیاز لا کر دیتی ہوں۔ ''انہیں اپنی بغلوں میں رکھ کر باہر صحن میں دھوپ میں لیٹ جاؤ۔'' مجھے یاد نہیں میں نے کوئی خطا کی تھی۔ اس دن میرے پاؤں میں کھڑاؤں بھی تھی۔ ''پھر کیا ہوگا؟'' میں پوچھتی ہوں۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہیں۔ ''پھر تمہیں بخار چڑھ جائے گا۔'' ''پھر؟'' ''پھر کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ سب تمہاری خاطر کریں گے۔'' میں جھٹ بغل میں پیاز رکھ کر جلتی زمین پر دھوپ میں لیٹ جاتی ہوں۔ مجھے یاد ہے میری ماں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ادھر سے اُدھر پھرتی نظر آتی ہیں لیکن دادا کا سفید چہرہ مجھے دروازے کی اوٹ سے گاہے گاہے مسکرا مسکرا کر دیکھتا ہوا نظر آتا۔ میں جانے کب تک پڑی رہتی ہوں۔ لیکن مجھے بخار نہیں چڑھتا۔ مجھے آج بھی دادا کا دروازے کی اوٹ سے مسکراتا ہوا چہرہ نظر

''چہارسُو''

آتا ہے جس پر شرارت بھری ہوئی تھی۔

جب تک دادا گھر میں رہے وہ میرے اردگرد منڈلاتے ہی رہے، یا پھر اپنے پاس بلا کر سزا کے طور پر بٹھا لیتے اور جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے جو میری سمجھ سے اکثر باہر ہوتیں۔ مجھے یاد ہے وہ مجھ سے کہتے ''چل، لفظ بنا۔ ح، جگہ خالی۔ ی، بیچ سے جگہ خالی۔ ت۔ وہ مجھ سے ایسے بے شمار لفظ بنواتے ہیں، جو کبھی بوجھ لیتی ہوں، کبھی مجھے لگتا ہے وہ یہاں بھی مجھے سزا دے رہے ہیں۔ میں شور مچا رہی ہوں، رو رہی ہوں۔ لیکن ان کے الفاظ ختم ہو کر نہیں دے رہے ہیں۔

مجھے اکثر دادا کی آواز اپنے باپ سے لڑتی ہوئی سنائی دیتی ہے ''اس کو مت پڑھواؤ۔ دیکھو پچھتاؤ گے۔'' میرا باپ انہیں کیا جواب دیتا ہے، مجھے یاد نہیں۔ لیکن بعد کی میری حرکتوں پر میرا باپ اکثر مجھے یہ کہتا ہوا سنائی دیا۔ ''میرے باپ نے کہا تھا اس کو پڑھوانا مت۔''

اس دن اسکول میں ایک کھیل ہو رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی پریاں بنائی جاتی ہیں۔ ان سب کے بیچ میں مَیں بھی ایک پری بنی ہوئی ناچ رہی ہوں۔ اچانک دادا کی آواز آتی ہے۔ اسکول کے گیٹ پر وہ کھڑے چیخ رہے ہیں، ''نکالو اس مُردی کو باہر۔'' میں ناچتے ناچتے ایک لمحے کے لیے رکی ہوں لیکن تیز میوزک نے مجھے رکنے نہیں دیا۔ ناچ ختم ہوتا ہے۔ میں باہر بھاگ کر دادا کے پاس آتی ہوں۔ اس دن اسکول کے اس کھیل میں رات ہو گئی تھی۔ دادا کی چھڑی مجھے ڈھونڈتی ہوئی اسکول پہنچ گئی۔ اور پھر دیر تک دادا میں اور میرے باپ میں کچھ باتیں ہوتی رہیں۔

پھر مجھے اسکول سے اٹھا لیا گیا۔

دادا کی بڑھتی ہوئی شرارتوں نے مجھے بھی عاجز کیا ہوا تھا۔ اگرچہ میں نے اکثر ماں کو یہ کہتے سنا ''تم نے بہت ستایا تھا اپنے دادا کو'' مجھے یاد ہے اس دن میرے بڑے بھائی اور بہن نے روزہ رکھنا تھا۔ سب سحری میں اٹھ گئے ہیں۔ میں بھی اٹھ بیٹھی ہوں۔ ماں بھائی کو خوب ٹھنسا رہی ہے۔ میری بڑی بہن بھی کچھ نہ کچھ کھا رہی ہے۔ میں چپکے چپکے کڑھ رہی ہوں۔ کوئی مجھے نہیں پوچھ رہا۔ میں دادا سے کہتی ہوں ''میں بھی روزہ رکھوں گی۔'' دادا ابا دستر خوان پر بیٹھے ہیں۔ ''ہاں کیوں نہیں۔'' وہ ایک شرارتی مسکراہٹ سے مجھے دیکھتے ہیں۔ ایک دم یہ طے ہو جاتا ہے، میں روزہ رکھوں گی۔ امّاں پھر بھی مجھے کچھ نہیں کھلاتی۔ وہ بھائی کو ہی کھلائے جا رہی ہیں۔ میں بھی حرص میں کھائے جا رہی ہوں اور جلدی جلدی ہاتھ مار رہی ہوں۔ لیکن پھر اپنے آگے کی دودھ جلیبی بھی مجھ سے نہیں کھائی جاتی۔ میرا پیٹ پھول جاتا ہے۔ مجھے روزے کی نیت کروائی جاتی ہے۔ دادا ابا مجھے اپنے ساتھ نماز پڑھواتے ہیں۔ پھر میں سو جاتی ہوں۔ صبح میری آنکھ کھلتی ہے۔ میری چھوٹی بہنیں اس دودھ جلیبی کے پیالے کو ہاتھ میں لیے بیٹھی ہیں جو میں نہیں کھا سکی تھی۔ میں بستر سے کود کر اپنی دودھ جلیبی چھینتی ہوں اور ایک دو گھونٹ میں صاف کر جاتی ہوں۔ دادا ابا سامنے کھڑے ہیں ''ارے مُردی، تیرا روزہ تھا۔'' مجھے اپنے روزے کے خاتمے کا پتا چل کر افسوس ہوتا ہے، لیکن دادا ابا تسلی دیتے ہیں ''کوئی بات نہیں۔ بھول معاف ہے۔'' میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ سب کھا پی کے بھی میرا روزہ ہے۔ لیکن دادا ابا کی آواز آتی ہے ''دیکھ پاخانے میں جا کر پانی نہ لینا، روزہ ٹوٹ جائے گا۔'' کیا؟ میرے کان کھڑے ہوتے ہیں۔ پانی پاخانے میں بھی پیا جا سکتا ہے! پھر جب میں پاخانے کی طرف جاتی، دادا روکتے ''خبردار پانی نہ پی لینا۔'' روزہ رکھنے اور توڑنے کا مجھے کچھ پتا نہ تھا لیکن یہ پتا چل گیا تھا کہ چوری چھپے پاخانے میں پانی پیا جا سکتا ہے اور میں نے یہی کیا۔ دادا ابا کے بار بار کہنے کے باوجود بھی مجھے پیاس لگی اور میں تیر کی طرح پاخانے گئی اور نل سے غٹا غٹ پانی پیٹ بھر کے پیا۔ لیکن اس کے باوجود شام ہوتے ہی میں نڈھال ہو رہی تھی۔ میرے بہن بھائی جن کو روزہ رکھوایا گیا تھا ان کو کوئی خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ روزے کے وقت آ کر میری ماں بھی میرے ہی گرد منڈلا رہی تھی۔ دادا بھی پریشان ہو رہے تھے لیکن روزہ کھولنے کے بعد دادا ابا نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا ''بتا پاخانے میں پانی تو نہیں پیا تھا؟'' ''بھولے سے پیا تھا، ایک بار'' میں نے اپنا شربت بھرا پیٹ پھلا کر انہیں جواب دیا تھا۔

دادا ابا کا گنجا گول سر اُن کے سرخ و سفید چہرے پر چھوٹی سی پیشانی سے شروع ہوتا تھا اور ایک چمکدار گولے کی طرح نظر آتا تھا۔ مجھے دادا ابا کا وہ گول سر بہت اچھا لگتا تھا جس کی وجہ میری سمجھ میں یہی آتی تھی۔ وہ ہر جمعے کو گھر سے باہر پلنگ یا کرسی پر بیٹھ کر نائی سے اس گول سر کو اور گنجا کرواتے تھے اور پھر اس پر کوئی ایسی چیز پھیری جاتی، جو ان کا سر دور سے چمکتا ہوا نظر آتا۔ میں اپنے بالوں سے عاجز ہونے لگی تھی۔ بال دھلنے کے بعد سلجھتے نہیں تھے۔ اور میری ماں کو اتنی فرصت کہاں تھی۔ میں نے ایک دن دادا سے کہہ دیا ''دادا ابا میرے بھی بال کٹنا چاہئیں'' دادا اچھل پڑے۔ ''ہاں کیوں نہیں'' انہوں نے نائی کو اشارہ کیا اور پھر آناً فاناً میں مَیں اپنے گھنے گھنگریالے بالوں سے نجات پا چکی تھی۔ میں نے نائی کے آئینے میں دیکھا۔ میرا گول چکنا سر میرے چہرے پر برا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن جب میں امّاں کو اپنا سر دکھانے کے لیے گئی تو اس کے دو ہتڑوں نے میرا حشر کر دیا۔ اور دادا ابا باہر کے دروازے سے اپنا گنجا سر نکال کر ہنس رہے تھے۔ مجھے یاد ہے جب تک دادا ابا ہمارے گھر میں رہے، میں اور دادا دونوں ہر جمعے کو اپنا سر گنجا کرواتے رہے اور میری ماں ہر بار چیختی رہی۔

دادا ابا کے زمانے کی باتیں بس اتنی ہی روشنی میں آتی ہیں اور صرف ایک ہی خیال ابھرتا ہے کہ ایک بوڑھا تھا جو مجھ سے لڑ کر اور مجھے ستا کر خوش ہوتا تھا۔ شاید میں بھی اس لڑائی میں برابر کی شریک تھی۔ اس وقت مجھے پتا نہیں تھا دادا کہاں چلے گئے تھے لیکن اس کے بعد دادا ابا کبھی میرے گھر میں نظر نہ آئے۔ کافی دنوں کے بعد ایک دن دونوں وقت ملتے ہوئے ہمارے گھر کے صحن میں اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ میرا باپ ایک پلنگ پر بیٹھا رو رہا تھا اور ماں بھی کسی کونے میں کھڑی شاید رو رہی تھی، تو مجھے پتا چلا کہ دادا مر گئے ہیں۔ موت کا کوئی بھی بھیانک تاثر اس وقت تک میرے ذہن میں نہیں تھا، بس سوائے اس کے کہ دادا ابا کبھی

''چہارسُو''

میرے گھر نہیں آئیں گے۔لیکن اس دن کے بعد بہت دنوں تک دادا مجھے یاد آتے رہے اور میں بات بات پر رو دیتی تھی۔

مجھے نئے اسکول میں لے جایا جا رہا ہے، جہاں میرا بڑا بھائی میرا داخلہ کروانے کے لیے لے گیا ہے۔ میرے ہاتھ میں نئی پنسل اور ایک نئی کاپی ہے۔ مجھ سے کچھ لکھوایا جاتا ہے۔ ایک استانی میری کاپی دیکھتی ہے۔ استانی میرے بھائی سے کچھ کہہ رہی ہے۔ اس سے مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کل سے مجھے اسکول میں آنا ہے۔ میں اپنی نئی پنسل استانی کی میز پر بھول جاتی ہوں۔ اپنے بھائی کے ساتھ باہر جانے کے لیے سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے اپنی پنسل یاد آتی ہے۔ میں واپس بھاگ کر اپنی پنسل لینے استانی کے پاس جاتی ہوں اور اس سے اپنی پنسل اٹھا کر لے جانے کے لیے پوچھتی ہوں۔ ایک زوردار طمانچہ میرے منہ پر پڑتا ہے ''کون سی پنسل؟'' پنسل سامنے میز پر پڑی ہے۔ میں پنسل کو گھورتی ہوئی واپس بھائی کے پاس آ جاتی ہوں، جو باہر میرا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔

دوسرے دن میں اسکول جا رہی ہوں۔ میری کتابیں اور کچھ کاپیاں خریدی گئی ہیں۔ یہ میرا پہلا دن اس اسکول کا ہے، جس میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسکول ٹیچر نے میرے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ مجھے نئی دوات، نئی سلیٹ بھی لے کر دی گئی ہے۔ رات بارش ہوئی تھی۔ صبح بہت چمکیلی اور صاف ہے۔ میرا دل اسکول جاتے ہوئے جھوم رہا ہے۔ میں ساری کتابوں اور سلیٹ اور اپنی روپہلی دوات اپنے ہاتھوں کی کہنیوں اور بازو پر لٹکائے جھومتی چلی جا رہی ہوں۔ میرے راستے میں میرے ساتھ ساتھ ایک چوڑی پانی کی نالی شور مچاتی ہوئی بہہ رہی ہے۔ بارش کا گدلا پانی شوں شوں کی آواز کے ساتھ غلغلاتا ہوا بہہ رہا ہے۔ وہ صبح اور اسکول کا پہلا دن اور کتابوں پر رکھی میری روپہلی دوات، میں اتراتی ہوئی اسکول کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ نہ جانے کب میری دوات کتابوں سے پھسل کر بہتی ہوئی نالی میں جا گرتی ہے۔ میں جھومتی ہوئی جا رہی ہوں۔ اچانک میری نگاہ اپنی کتابوں پر پڑتی ہے۔ روپہلی دوات نہیں ہے۔ میں دوڑنے لگتی ہوں۔ کبھی پیچھے کی طرف کبھی آگے کی طرف۔ ''کہاں گری میری دوات؟'' میں رو رہی ہوں۔ اور اس دوات کو نالی کے بہتے ہوئے پانی کے ساتھ ڈھونڈنے لگتی ہوں۔ شاید میری دوات آگے جا کر مل جائے۔ میں دوڑتی رہی، دوڑتی رہی یہاں تک کہ وہ نالی چوڑی سڑک پر جا کر پھیل جاتی ہے۔ میں وہیں بیٹھ گئی۔ مجھے یقین تھا، مری دوات نالی کے پانی کے ساتھ بہہ کر آ رہی ہو گی۔ پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ دوات نہیں پہنچی۔ میں اسکول بھی نہیں پہنچی۔ لیکن جب آدھا دن گزر جانے کے بعد میں تھکی ماندی گھر میں گھسی تو سب نے مجھے ایسا دیکھا جیسے ان کی کوئی کھوئی چیز مل گئی ہو۔ لیکن ان سب نے اپنا غصہ مار پیٹ کر نکالا۔ میں بہت دنوں تک اسکول کے راستے میں اس نالی میں اپنی دوات ڈھونڈتی ہوئی جاتی۔ اس کی روپہلی چمک بہت دنوں تک میری آنکھوں میں گھسی رہی۔

چھوٹی گلی کے بیچ میں وہ گھر جہاں بیری کے پیڑ سے بیر جھڑتے تھے۔ جس رات ہوائیں چلتیں ڈھیر سارے بیر گلی میں بکھر جاتے۔ میں بہت سارے بچوں کے ساتھ ان بیروں کو چننے جاتی اور اپنی فراک کے دامن میں بیر بھر کر گھر لاتی۔ ایک دن جانے مجھے کیا سوجھی۔ اس رات ہوائیں تیز چل رہی تھیں۔ میرا باپ تہجد کی نماز کے لیے اٹھا تھا۔ میری بھی آنکھ کھل گئی۔ میں دبے پاؤں تیز سے دروازہ کھول کر اندھیرے میں پتلی گلی میں نکل گئی۔ چاند کی روشنی میں گلی میں ڈھیروں بیر میرے سامنے چمک رہے تھے۔ بیر چنتے چنتے میری فراک کا دامن وزنی ہو گیا تو میں گھر کی طرف بھاگی۔ گھر میں آہستہ سے دروازہ کھول کر گھستے ہوئے باہر صحن میں تسبیح پڑھتے ہوئے میرے باپ نے مجھے دیکھ لیا۔ شاید میرے باپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''اندھیرے میں گئی تھی اکیلی؟'' وہ میری دونوں چوٹیوں کو اپنی مٹھیوں میں گھسیٹتے ہوئے پوچھ رہا تھا ''اندھیرے میں تجھے خوف نہیں آیا؟'' بیر میری فراک کے دامن سے آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ مجھے جلدی تھی، پٹائی سے جان چھوٹے تو میں بیر چھپاؤں۔ کہیں میرے بہن بھائی ان بیروں کو نہ دیکھ لیں۔

اس وقت میری ماں میرے ہاتھوں سے مٹی جھاڑتی جا رہی ہے اور منہ ہی منہ میں پتا نہیں مجھے کیا سنا رہی ہے۔ میں اپنی فراک میں ننھی سیپیاں بھرے بیٹھی ہوں، جو گھر سے باہر تارکول کی سڑک سے ذرا فاصلے پر کچی مٹی کے گھروں کی دیواروں پر چپکی ہوئی تھیں۔ میں اکثر کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے یا ان سیپیوں کو، جو بھربھری کچی مٹی کی دیواروں میں دھنسی ہوتی تھیں اور دور سے سفید سفید چمکتی ہوتیں، ایک ایک کر کے نکالتی جاتی اور اپنی فراک کے دامن میں جمع کرتی جاتی۔ کبھی کبھی میں ماں کے سوئی دھاگے سے انہیں پرونے بیٹھ جاتی۔ اپنے اس کھیل میں مَیں کسی کو شریک نہیں پاتی۔ مجھے یاد ہے اس وقت میرے ساتھ کوئی نہیں ہوتا تھا۔ میں اکیلی چلچلاتی دھوپ میں اکثر تنہا کھڑی یہ سیپیاں بٹور رہی ہوتی اور اکثر اپنی ماں کی مار کھاتی۔ لیکن جب میں تنہا ہوتی تو ان دیواروں کے پاس جا کھڑی ہوتی جن کی سیپیاں مجھے اکثر اشارے کر کے بلا لیتی تھیں۔

مجھے نہیں یاد، وہ کون سی چیز تھی جو مجھے باہر پتلی گلی میں اکیلے چلنے پر مجبور کرتی تھی۔ میں اس پتلی گلی میں دور تک چلتی چلی جاتی اور رنگ برنگے ننھے کانچ کے ٹکڑے اور ریت میں دھنسے ہوئے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے چنتی ہوئی چلتی رہتی۔ مجھے اس بات کا احساس بھی نہ رہتا کہ میں کتنی دور نکل آئی ہوں۔ واپسی پر امّاں میری درگت بنانے کے انتظار میں بیٹھی ملتی۔ ''جانے کیسی بدروح ہے!'' وہ روہانسی ہو رہی ہوتی۔ ''بچے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ یہ مٹی سے کانچ کے ٹکڑے چنتی ہے۔'' لیکن امّاں کو کیا بتاتی، ریت سے ان ٹکڑوں کو کھوجنے میں مجھے کتنا مزہ آتا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ یہ ٹکڑے دور دور تک صرف میرے انتظار میں ریت میں چھپے ہوئے پڑے ہیں۔

مجھے یاد ہے، جب ہم سب بھائی بہن صبح اسکول جاتے ہوئے امّاں کے پاس باورچی خانے میں آ کر بیٹھ جاتے۔ امّاں دودھ کے پیالے بھر بھر کر میرے بھائیوں کے آگے رکھتی اور ایسی آنکھوں سے انہیں دیکھتی جاتی ہے جیسے وہ بہت بڑا کام کرنے جا رہے ہیں اور ہم بہنوں کے سامنے چائے کے پیالے رکھ

دیتی ہے۔ مجھے یاد آ رہا ہے اس دن سے پہلے میں ہمیشہ کڑھتی جاتی تھی اور چائے پیتی جاتی تھی۔ لیکن اس دن مجھے جانے کیا ہو گیا۔ امّاں نے جیسے ہی دودھ کے پیالے میرے بھائیوں کے سامنے رکھے، میں کھڑی ہو گئی اور ایک ہی لات میں دونوں کے پیالے لڑھکا دیے۔ ''روز دودھ پیتے ہو!'' میں شاید چیخی بھی تھی۔ سب ہکّا بکّا مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی حرکت کرتا، میں امّاں کے کوسنے کی آوازوں کے درمیان اپنا بستہ اٹھا کر دروازے سے باہر بھاگ گئی۔

مجھے اپنی ماں کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کی آنکھوں میں کبھی میرے لیے غصہ نظر آتا اور کبھی وہ خوف زدہ ہو کر مجھے دیکھتی۔ کبھی کبھی ایسے لگتا جیسے وہ میری حرکتوں پر مجھے خاموش داد دے رہی ہے۔ تمام شور شرابے اور میرے خلاف بولنے کے باوجود یہ دوہری کیفیت مجھے اکثر اس کی آنکھوں میں نظر آتی تھی۔

یہ سب کچھ صرف لکھتے وقت ہی یاد نہیں آ رہا ہے۔ یادداشتوں کے منظر اکثر میرے اردگرد ہی رہتے ہیں۔ اور میں کسی بھی نئے منظر کے ساتھ کسی پرانے منظر کا سرا پکڑ لیتی ہوں۔ میں اکثر اپنی یہ یادیں دوسروں کو سناتی رہی ہوں۔ جن میں مَیں کبھی خوش ہو جاتی ہوں اور کبھی افسردہ۔

ایک وہ یاد جو کہانی سی بن گئی ہے۔ جب ٹیچر پہلی بار مجھے کلاس میں میرا نام لے کر پکارتی ہے۔ وہ سب سے کہہ رہی ہے۔ ''کون سی بچی اس دھن پر ناچے گی؟'' کوئی ٹیبلو ہونے جا رہا ہے۔ وہ ڈیسک بجا کر دھیمی آواز میں گنگناتی ہے ''جھمکا گرارے بریلی کے بازار میں'' سب لڑکیاں دم سادھے بیٹھی ہیں۔ میں اس کے ہاتھوں کے ڈیسک پر بجتے ہی اٹھ کر اس کی طرف بڑھنے لگتی ہوں۔ وہ مجھے پکارتی ہے اور پھر کلاس سے باہر لے جاتی ہے۔ گول برآمدے میں وہ اس گانے پر جو اُس نے اپنی آواز میں تیار کیا ہے، میرا ناچ دیکھتی ہے۔ میں اس کو دیکھے بغیر اس آواز کی لے پر جھوم رہی ہوں۔ ''بہت اچھا کرتی ہو۔ کل تم آؤ گی۔ سفید فراک پہن کر۔ صبح سویرے۔'' وہ تاکید کرتی ہے۔ میں راضی ہوں۔ رات گئے اچانک یاد آتا ہے میں اپنی فراک اتار کر دھوتی ہوں۔ صبح اٹھ کر دیکھتی ہوں وہ سوکھی نہیں۔ رات کی اوس نے اسے سوکھنے نہیں دیا۔ میں جلدی جلدی استری کرتی ہوں۔ مجھے یاد ہے میرے گھر میں کوئلوں کی استری ہوتی تھی۔ پہلے وہ کوئلے گرم ہوتے تھے، اس کے بعد استری۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ وقت گزر رہا ہے۔ میں گیلی ہی فراک پہن کر اسکول بھاگتی ہوں۔ فراک، کالر اور گھیر کے جوڑے سے بہت گیلی ہے۔ اسکول سے باہر میدان میں ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ میں اس میدان میں ہوا کے ساتھ گھومنے لگتی ہوں۔ ''جھمکا گرارے۔۔۔ جھمکا گرارے۔۔۔'' پتا نہیں کتنا وقت گزر جاتا ہے۔ لوگ مجھے حیران ہو کر دیکھتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ فراک، کالر اور گھیرے سے نہیں سوکھتی۔ پتا نہیں کب اسکول لگتا ہے، کب گھنٹی بجتی ہے۔ ناچتے ناچتے مجھے سناٹے کا احساس ہوتا ہے۔ اسکول لگ گیا۔ میں دوڑتی ہوں۔ برآمدے میں اسٹیج بنا ہے۔ اس کے سامنے لوگ کھڑے ہیں۔ ایک بچی ناچ رہی ہے ''جھمکا گرارے۔۔۔'' میں لوگوں کو ہٹاتی ہوئی اندر گھستی ہوں۔ میری ٹیچر سامنے کھڑی ہے، اس کے چہرے پر بیزاری اور گھبراہٹ ہے۔ مجھے باہر کھینچ کر لے جاتی ہے، اور میرے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دیتی ہے ''کہاں مر گئی تھی؟ مجھے ذلیل کر دیا'' میری سمجھ میں نہیں آیا میں کیا بتاؤں۔ مجھے اپنا قصور نظر نہیں آیا۔ میں خود بہت رونا چاہتی ہوں۔ میری جگہ دوسری لڑکی ناچ رہی ہے۔ میوزک جاری ہے ''جھمکا گرارے۔۔۔'' میں آج بھی یاد کرتی ہوں، اپنی فراک کا سکھانا اور وہ ناچ، ہلکی اور دھیمی دھوپ میں جو میدان میں پھیلی ہوئی تھی اور وہ گانا ''جھمکا گرارے بریلی کے بازار میں۔''

پاپولر فکشن

پاپولر فکشن لکھنے والے میرے جیسے رائٹر کا ایک مسئلہ recognition ہوتی ہے۔ ہمیں اور ہماری تحریروں کو شائد لاکھوں لوگ پڑھتے اور جانتے ہوں گے مگر ادبی حلقوں میں کبھی ہماری تحریروں پر بات نہیں کی جاتی۔ جیسے بڑوں کی محافل میں بچوں کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ادب اور اس سے متعلقہ لوگوں نے ہمیں اپنی صفوں سے نکال کر ہمارے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دیں۔ اس نے ہمیں عام لوگوں کے قریب کر دیا۔ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ عام آدمی آج مجھے اور میرے جیسے رائٹر کی تحریروں کو پڑھتا ہے اور انہی کے کرداروں کے ساتھ خود relate کرتا ہے۔ وہ ہماری تحریروں سے سیکھتا ہے وہ ہماری تحریروں سے بدلتا ہے اس کے ہونٹوں پر نمودار ہونے والی مسکراہٹ پاپولر فکشن لکھنے والوں کی مرہونِ منت ہوتی ہے اس کی آنکھوں سے چھلکنے والی نمی کا باعث بھی یہی تحریریں ہوئی ہیں۔ پاپولر فکشن لکھنے والے رائٹر کی تحریریں بھی اتنی ہی معیاری اور غیر معیاری ہوتی ہیں جتنی مستند ادیبوں کی تخلیقات۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں کہ پچھلے بیس سالوں میں پاپولر فکشن لکھنے والوں نے اپنی تحریروں میں جو ورائٹی اور نیا پن دیا ہے وہ ''ادب'' تخلیق کرنے والوں نے نہیں دیا۔ مجھے یہ بھی کہنے دیں کہ قوموں کی تاریخ کے نازک اور مشکل مراحل میں اگر ادبی تخلیقات مشعلِ راہ ثابت ہوتی ہیں تو اکیسویں صدی کے پاکستان میں یہ کردار ''پاپولر فکشن لکھنے والوں'' کی ''تحریریں'' ادا کریں گی ''ادیبوں'' کی ''تخلیقات'' نہیں۔

عمیرہ احمد

میں لائن کھینچتی ہو (۱۹۹۴ء)

جب بیزاری آتی ہے

بے زاری آتی ہے
میں سارے کام چھوڑ دیتی ہوں
کھانا، پینا، حتیٰ کہ نہانا بھی
میل لدے پرلدے میرے جسم پر
چڑھنے لگتا ہے
دل چاہتا ہے کسی درخت کی
اونچی شاخ پر بیٹھ کر
لوگوں کو گزرتے ہوئے دیکھوں
اور جب
وہ نیچے سے گزریں
ان کے سروں پر تھوکتی جاؤں
بے زاری یوں آتی ہے
جیسے
بہت مضبوط ہاتھوں سے کوئی
مجھے نچوڑ رہا ہو
گول گول
پھر میں کھلنے لگتی ہوں
الگنی پر پھیلنے والے کپڑوں کی طرح
بیزاری میرے گھٹنوں اور انگلیوں
کی پوروں میں گھس کر
مجھے چھیڑتی ہے
میرا دل چاہتا ہے
چاروں ہاتھ پاؤں سے چلوں
اور بھونکنے لگوں
اور چلتے ہوئے راہ گیروں کو
کاٹ کھاؤں

یہ بے زاری چھین لیتی ہے
میری ہنسی
جو میں اپنی جیسی عورتوں میں بیٹھ کر
ہنستی ہوں
اور وہ رونا
جو میری جیسی عورتیں روتی ہیں
یہ بے زاری
مجھ سے چھین لیتی ہے
کولھے مٹکا مٹکا کر چلنا
جو میں دوسروں کو دیکھ کر
چلنا چاہتی ہوں
بس یہ چاہتی ہے
میں کسی درخت کی شاخ پر
بیٹھ کر آنے جانے والوں کے
سروں پر تھوکتی رہوں
اور گم سم رہوں
کسی کو نظر نہ آؤں

ایک موت ضروری ہے

اگر یہ زندگی ایسی نہ گزرتی
تو تمہیں کیسے پتا چلتا
ایک زندگی ایسی بھی گزرتی ہے
لیکن ایک زندگی تو کافی نہیں
سب کچھ جاننے کے لیے
کئی زندگیاں گزاری جائیں
اور ہر بار
ایک زندگی گزارنے کے لیے
ایک موت ضروری ہے

اکیسویں صدی کی عورت

آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتی
اپنے خوابوں کی تصویر کاغذ پر
نہیں بناتی ہے
اور نہ اپنے محبوب کا پورٹریٹ
وہ اپنے دکھڑے شاعری میں
نہیں روتی
وہ نہ بستر پر سرِ شام
ڈھے جاتی ہے
اکیسوی صدی کی عورت
اپنے چاہنے والوں کو
خط نہیں لکھتی
وہ اک سوٹ کیس کی تیاری میں
چند منٹ صرف کرتے ہوئے
گھر سے باہر نکل جاتی ہے
اس کے گھر سے نکل جانے کے بعد
اغوا کی خبر نہیں چھپتی
کسی بھی ساحل پر
کوئی فوٹو گرافر اس کی سن باتھ
لیتے ہوئے
تصویر بناتا ہے
اور سوچتا ہے
کیا اکیسویں صدی کی عورت
آزادی کا مطلب جان گئی

○

زندہ کیسے رہا جاتا ہے

کون نہیں جانتا زندگی کیا ہے
جو زندہ ہے
وہ جانتا ہے
زندہ کیسے رہا جاتا ہے
زندہ رہنے کے لیے
کیا نہیں کرنا پڑتا
زندگی مکڑی کا جال ہے
جس میں مکھی کی طرح
ہمیں پھانس لیا جاتا ہے
نکلنے کا راستہ صرف
ایک ہے
صرف ایک
یعنی
شاید آپ کی سمجھ میں آ جائے
شاید نہ آئے
شاید اس وقت
جب اس مکھی کی طرح
آپ اپنی آخری کوشش میں
مبتلا ہوں
اس جال سے نکلنے کے لیے

نفرت شرط ہے

ایک جنگ کے لیے
دو نفرتوں کا ہونا ضروری ہے
دو نفرتوں کے لیے ایک جنگ
لڑی جا سکتی ہے
آقا ہو یا غلام
ظالم ہو یا مظلوم
جس کی نفرت زیادہ ہو گی
وہی فاتح ہو گا

براہِ راست

کسی بھی موضوع اور شخصیت پر قطعیت اور کلیّت سے بات کرنا مشکل بھی ہے اور ناممکن بھی۔ وطنِ عزیز کی نصف آبادی کا جب جب ذکر ہوگا تب تب شرمندگی اور ندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ صنفِ نازک کے مسائل کو سمجھنے اور اُن کی آواز میں آواز ملا کر نمایاں اور اُجاگر کرنے کے لیے جن خواتین قلم کاروں نے خود کو وقف کیا اُن میں محترمہ عذرا عباس کا نام نمایاں تر ہے۔ اس کڑے سفر میں عذرا عباس صاحبہ نے کیا کچھ سہا، کیا کچھ تیا گنا پڑا۔ داغ صاحب کی زبانی سنیے:

لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

آج کی نشست میں کوشش کی گئی ہے کہ محترمہ عذرا عباس صاحبہ کے قلمی کارناموں اور عملی مساعی کو چہارسو کے توسط سے اختصار کے ساتھ آپ کے روبرو پیش کیا جائے تاکہ موجودہ اور آنے والے وقت کو ہماری طرح کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے!!!

گلزار جاوید

☆ پنگوڑے اور پالنے سے لے کر گلی محلے تک کی بیشتر باتیں آپ نے اپنی یادداشتوں میں تفصیل سے تحریر کی ہیں پھر بھی گھر چن کے طور پر حافظے میں کچھ بچا ہو تو ہمارے قارئین سے شیئر کیجیے؟

☆☆ بچا ہوا یاد آیا تو ضرور لکھ دوں گی مجھے بھی یہ یادیں جب میرے پاس آتی ہیں مزا آتا ہے

☆ تعلیمی ایّام بالخصوص یونیورسٹی کے دنوں کو یاد کر کے آپ کے احساسات کس نوعیت کے ہوا کرتے ہیں اور کون کون سے چہرے نظروں کے سامنے نمایاں ہو جاتے ہیں؟

☆☆ یہ تو ان چہروں پر ہے اکثر لپک لپک کر جو میرے سامنے آتے ہیں اکثر بھول جاتے ہیں

☆ ادیب بننا آپ کی چوائس تھی تو کیوں اور نہیں تھی پھر بھی بہت سے سوالیہ نشان بنتے ہیں جتنے کا جی چاہے جواب دے دیجیے؟

☆☆ ہمارے ہاں مغرب کی طرز پر بچے کا نفسیاتی تجزیہ نہیں کیا جاتا لہٰذا جس کے جہاں سینگ سماتے ہیں وہاں فِٹ ہو جاتا ہے۔ معاملہ مواقع اور حالات کا بھی ہے۔ سو اردو پڑھتے پڑھتے اردو لکھنا اچھا لگا اور آہستہ آہستہ بہت اچھا لگنے لگا اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

☆ ابتدائی دنوں کی دشواریوں اور رکاوٹوں کو دور کرنے میں کس طرح کی ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ اگر کچھ لوگ معاون رہے ہوں تو اُن کا ذکر بے وجہ نہ ہوگا؟

☆☆ آپ خود ادیب ہیں آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ والدین اپنی اولاد کو نفع بخش شعبہ میں بھیجنا پسند کرتے ہیں جیسے ڈاکٹر، انجینئر، وکیل وغیرہ۔ سو میرے ساتھ لڑکی ہونے کی پخ بھی شامل تھی تو اس طرح کے بہت سے مسائل کا سامنا رہا جن کا فرداً فرداً ذکر کا یہ محل نہیں بس یوں جانیے ہر موقع اور محل پر میرے والدین میری ڈھال بن کر میرے ساتھ کھڑے تھے اور میری ہر خواہش کو پوری کرنا اپنا فرض جانتے تھے سو اُن کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر میں نے ادیب بننے کا فیصلہ کیا۔

☆ کچھ روشنی اُن مناظر پر ڈالئے جو آپ بھلا بیٹھی ہیں یا دانستہ یاد کرنا نہیں چاہتیں؟

☆☆ یادوں کی تو بات نہ کریں ہر وقت کودتی پھاندتی رہتی ہیں زندگی ایک مسخرے کے لباس کی طرح نظر آنے لگتی ہے بھلانا تو مشکل ہے اور بھول جانا اس سے زیادہ مشکل۔ وقت کے تیور بھولی بھٹکی بھی جمع کر لیتے ہیں۔

☆ فکشن اور سوانح کے درمیان حدِ فاصل قائم رکھنا مشکل۔ سبب، جواز اور اڑچن پر روشنی ڈالنا ضروری ہے؟

☆☆ لکھنے کے لئے پہلے سے دماغ اپنا راستہ پکڑ لیتا ہے۔ زیادہ تر تو میرے حساب سے سوانح کا راستہ اذیت پر آمادہ رہتا ہے اگر ہم خاموشی سے نکل جائیں اپنے آپ کو بچتے بچاتے گناہ گاروں کی فہرست کو بڑھاتے ہوئے۔

☆ سوانح پر بے اعتباری کی نوبت کب اور کیوں آن پڑی۔ کبھی آپ کو اپنی رائے سے رجوع کرنے کا خیال نہیں آیا؟

☆☆ میرا تو خیال ہے کہ اب تک نہیں آئی جو طاقت سے لکھ سکتا ہے وہ اپنی طاقت استعمال کرتا ہے اور یہی اسکی طاقت استعمالی ہوتی ہے جو اس کو کریڈیو بیٹی کے بہاؤ میں لے جاتا ہے جب ہم اسے پڑھتے ہیں بے پناہ خوش ہوتے ہیں۔ اس سوانح اور بے اعتباری میں ہم نے چناؤ کر لیا

☆ آپ کے ہاں جو اُلجھن، فکر اور اندیشے سر اٹھاتے ہیں آج کی نشست میں ہمارے قاری سے شیئر کر ہی ڈالیے؟

☆☆ اس سوال میں آپ کے ہاں جو الجھن، فکر اور اندیشے سر اٹھاتے ہیں ان کو دیکھ کر میں بھی خوش ہوتی ہوں کہ آج کی نشست میں میرے قاری نے کچھ تو مجھ سے شیئر کیا اور اس میں میرا ساتھ دیا اور میری اس بے باکی اور خود پسندی کو لکھنے کی چہل پہل کو برداشت کیا۔

☆ کہنے والے کہتے ہیں کہ آپ نے خود کو چھپائے بغیر دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا مگر یہ عمل اس قدر عجلت میں ہوا جیسے کوئی بے چینی، بے قراری یا اضطرار آپ کے فراق میں ہو؟

☆☆ ہرانسان کی خواہش ہوتی ہے کہ ہمیں دیکھا جائے، پڑھا جائے، سمجھا جائے۔شروع شروع میں ناصر عباس نیئر سے جب رابطہ ہوا تو اُن کی بہت سی باتیں مجھے سمجھ میں آتی تھیں مگر جب میں نے اُن کے جوابات توجہ سے پڑھے تو میں نے انہیں کہا کہ ناصر عباس نیئر آپ کی باتیں مجھے سمجھ آ رہی ہیں۔ میں چیزوں کو بڑے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں اور اس میں مجھے کامیابی بھی مل رہی ہے۔

☆ اوّل آپ کے ہاں خاص قسم کا حزن دوئم خستہ حالی کا چرکہ، اس پہ طرّہ Domesticated Misrey کا لیبل۔ ایک، دو نہیں، تین سوالوں کا موجب بن رہے ہیں؟

☆☆ آپ نے سوال کو تین حصّوں میں تقسیم کر کے میرے دماغ کو الجھن سے دو چار کر دیا ہے۔ میں آپ سے سوال کرتی ہوں کہ تیسری دنیا کے اُس شخص سے ملا دیجیے جسے کسی طرح کے حزن وملال یا Domesticated Misrey کا سامنا نہ ہو۔

☆ آپ کے سر ایک الزام مردوں کے خیالات میں دخل اندازی کا بھی ہے۔ کب کب اور کہاں کہاں آپ نے مردوں کے اختیارات میں دخل اندازی کی اور اس کی ضرورت کیوں آن پڑی؟

☆☆ دیکھئے! جہاں جہاں میں نے پڑھایا میرے ساتھی مرد بھی ہوا کرتے تھے۔ سو مردوں کے خیالات، مردوں کے روّیے اور روز مرہ کے معاملات سبزی ترکاری سے لے کر بال بچوں تک کی دیکھ بھال میں مردوں کا عمل دخل زیادہ ہوا کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مرد Dominate ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ میں اکثر بہت سے فورم پر اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہوں اور کچھ باتیں کہہ بھی دیتی ہوں اور کچھ باتیں مصلحتاً نہیں کہتی۔ شاید میری کہی ہوئی باتیں مرد کے خیال میں میرے حدود سے تجاوز ہوں تو ہوا کریں میں کسی آزار میں نہیں پڑنا چاہتی۔

☆ آپ کی ادبی زبان کو بوجھل، استعارے اور تشبیہہ غیر فعال کیوں بتلائے جاتے ہیں؟

☆☆ میں نہیں جانتی کہ کون سے ادبی استعارے بوجھل ہیں اور کون سے سکون بخش۔ میں نے اکثر اپنے قاری کو پڑھنے کے بعد آنکھیں کھولتے دیکھا ہے اور میں خود بھی نامور ادیبوں شاعروں کے درمیان جب ہوتی ہوں تو میرے احساسات میں کسی طرح کا احساسِ کمتری کا کمپلیکس نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ میں خود کو بہتر محسوس کر رہی ہوتی ہوں۔ شاید یہ اعتماد میری تحریر نے مجھ کو دیا ہے جو میرا اعزاز بھی ہے اور سرمایہ بھی۔

☆ آپ کو چالاک اور مشّاق قصائی سے تشبیہہ دینے والے آپ کی کس خوبی کو اُجاگر کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں؟

☆☆ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کو معلوم نہیں ہوتیں جیسے مجھے نہیں پتا کہ میں چالاک ہوں اور مشاق بھی ہوں۔ میں ان کو الزامات تو نہیں کہوں گی بلکہ خوبیوں سے تشبیہہ دوں گی اور آئندہ زندگی میں چالاک اور مشّاق بن کر زندہ رہنے کی کوشش کروں گی۔

☆ قید کے خوف کی نشان دہی کرنے والے کس قید کو نشان زد کر رہے ہیں؟

☆☆ پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ کونسی قید ہے اور کس قید میں آپ کو رکھا گیا ہے اور اس قید سے آپ کس طرح بچ رہے ہیں یا نہیں بچ سکے ہیں۔ جب ہم معاشرے میں زندگی بسر کرتے ہیں تب ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قید کیا ہے اور اس قید کا جبر کیا ہے جس نے اس قید کو سہا ہو وہی اس کو بیان کر سکتا ہے۔ جہاں تک میرے اردگرد لوگوں کا سوال ہے کچھ تو بہت ہشاش بشاش ہیں اور کچھ لفظوں کا سہارا لے کر خود کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

☆ وہ کون لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے جسم کے ساتھ جنسی تجربے کرتے اور آپ ان تجربات کی نسبت کیا رائے رکھتی ہیں؟

☆☆ اس سوال کا جواب دینا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ تین تین چار چار سال کی معصوم بچیاں تو نہیں چاہیں گی کہ اُن کے جسمانی اعضا کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جائے مگر بہت سے لوگ ہیں جو یہ سب کچھ کرنے کے باوجود پارسائی کا مکھوٹا چڑھائے رہتے ہیں اور سوسائٹی میں بیٹھ کر اس حساس موضوع کو اپنے دانشورانہ انداز میں بیان کر کے مختلف شخصیات کو موردِ الزام ٹھہرا کر معاشرے میں اپنا سر بلند کرتے ہیں۔

☆ چھوٹی عمر کی لڑکیوں کے وہ کون سے بھوت ہیں جنہیں آپ زندہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں؟

☆☆ اس سوال پر مجھے غصّہ آ رہا ہے جب بچپن میں گلی کے شور پر میں نے دریافت کیا کہ یہ کیسا شور ہے تو میرے بڑے نے بتایا کہ ایک پاگل آدمی نے ایک معصوم بچی کو خراب کر دیا ہے۔ خراب کر دیا ہے، آنکھ پھوڑ دی ہے، کان توڑ دیا ہے یا بازو مروڑ دیا ہے۔ میں تو سیدھی امّاں کے پاس گئی اور اُن سے یہ سوال پوچھا کہ لڑکی کا کیا خراب کر دیا ہے۔ میری بات سن کر امّاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہم جو تمہیں منع کرتے ہیں کہ اکیلے گھر سے مت باہر نکلا کرو اسی لیے منع کرتے ہیں کہ خراب لوگ بچیوں کو خراب کر دیتے ہیں۔ میں نے تنگ کر کہا ''کیا خراب کر دیتے ہیں'' امّاں نے جواب میں کہا ''وہ جو ہم تمہیں خوبصورت فراک پہناتے ہیں، وہ چھین کر لے جاتے ہیں''

☆ معاشرتی اقدار کو تلپٹ کرنے کا الزام لگانے والے آپ کے کس فعل پر جز بز دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ بھیّا آپ تو بڑی بڑی باتیں کر رہیں کہ معاشرے میں جو بڑی بڑی باتیں ہو رہی ہیں میں اُنہیں تبدیل کرنا چاہتی ہوں۔ میرے خیال میں معاشرتی اقدار تبدیل کرنا بڑا مہلک کام ہے جن لوگوں کے مفاد پر زد پڑتی ہے وہ تبدیلی لانے کے خواہش مندوں کو چیونٹی کی طرح مسلنا خوب جانتے ہیں۔ جہاں تک سوال میری ذات کا ہے میں اگر اس کارِ خیر میں ماری جاؤں تو اس سے بہتر میرے لیے اور کیا ہو سکتا ہے۔

☆ ڈاکٹر طاہرہ کاظمی ادب برائے ادب یا ادب برائے تاریک راہوں کی تصویر کشی کا سوال اُٹھا کر کس سمت اشارہ کر رہی ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں یہ سوال بہت بوسیدہ ہو چکا ہے۔ اس کا جواب آپ بھی جانتے ہیں اور تھوڑا بہت مجھے بھی پتا ہے اور قاری تو یقیناً ہوتا ہی ذہین ہے وہ تو پڑھنے والی لائن سے آگے کی بابت بھی سوچ رہا ہوتا ہے۔

☆ اگلا سوال ڈاکٹر طاہرہ صاحبہ نے بیزاری اور چڑچڑے پن کے حوالے سے PMS کی نسبت اُٹھا کر بحث کے نئے زاویے وا کرنے کی کوشش کی ہے؟

☆☆ اس حوالے سے نئے اور پرانے زاویے وا کرنے سے حاصل کیا ہو گا۔ یہ خواتین کے حوالے سے مخصوص ایاّم میں طبّی کیفیت کا ذکر ہے اور چونکہ ڈاکٹر طاہر میڈیکل ڈاکٹر ہیں اس لیے انہوں نے اس سوال کو اپنے مضمون میں تفصیل سے بحث کا موضوع بنایا اور میں اس میں مزید اضافہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔

☆ آپ کی خودنوشت کے سنّاٹوں کو میر، غالب، نظیر، بودلیئر، لورکا، جان پرس اور کافکا کے مماثل کیوں گردانا گیا؟

☆☆ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ اتنے بڑے اور عظیم لوگوں کے بیچ میں مجھے کیوں ڈال دیا گیا ہے۔ جب آپ سنّاٹوں کی بابت جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ عذرا عباس ان کے بیچ گھری ہوئی ہے۔ اس حوالے سے افتخار جالب صاحب نے کافی ہاتھ پاؤں مارے ہیں اور میرے دوست حنیف نے بھی اپنی سی بہت کوشش کی ہے لیکن میرے لیے اس حوالے سے کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ میں نے اپنی نظم میں لکھا ہے:

میری سوچ نے مجھے پالا ہے
میری سوچ نے مجھے بنایا ہے

اُس وقت لوگوں نے مجھے بہت طعنے دیے بلخصوص خواتین نے۔ اُس کے بعد میں نے ''اپنا بچپن'' لکھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں اُس وقت کہاں کھڑی تھی۔ میں اُن سنّاٹوں میں غرق تھی۔

☆ آپ کے ہاں ایک سے زائد بار مرد مار عورت کی اصطلاح نظر سے گزری، سچ پوچھیے تو کھلی بھی بہت مگر آگے چل کر دوسروں کے خواب چرانے والی عورت کے بارے جان کر تو اشتیاق بلّیوں اُچھلنے لگا؟

☆☆ اب اس سوال کا جواب دینے میں، میں کاہل ہو رہی ہوں۔ جو لوگ میری شاعری پڑھتے ہیں یا میرے ناول اور افسانے وہ یہ پوچھتے ہیں کہ میں مردوں کی طرز پر کیوں نہیں لکھتی؟ مردوں سے دبی ہوئی کیوں نہیں ہیں؟ مردوں کی ہاں میں ہاں کیوں نہیں ملا رہی ہوں؟ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اب کافی تھک گئی ہوں۔ جو لوگ خود کچھ نہیں کر سکتے وہ دوسرے پر الزام لگا کر اپنی اَنا کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ ایک ایسی عورت کے بارے میں ''مرد مار عورت'' کا الزام لگاتے ہیں جو مرد سے پیار کرتی ہے، مرد کے بچے پال رہی ہے اور مرد کا گھر بار سنبھال رہی ہے۔ اس سے آگے کیا کہوں:

تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

☆ قلم میں روانی، ارادوں اور مرادوں میں جولانی کے باوجود آپ نے اُس قدر فکشن نہیں لکھا جس قدر قاری آپ سے توقع لگا بیٹھا تھا؟

☆☆ قلم تو خدا کا ایک عطیہ ہے جس کے وسیلے سے آپ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو کاغذ پر منتقل کر کے نہ صرف لوگوں کی تہذیب کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ اپنا آپ بھی صحیح انداز میں دیکھنا سیکھ جاتے ہیں۔

پریس کلب میں میرے بچے گیند سے کھیل رہے تھے کہ اچانک گیند درخت میں پھنس گئی ہے اور کچھ دیر بعد گیند کے بجائے درخت سے گرگٹ گر جاتی ہے، بچے اُسے گیند سمجھ کر کھیلنے لگتے ہیں۔ کچھ دیر بعد جھاڑیوں میں چھپی گیند سوچ رہی ہے کہ یہ بچے گرگٹ کو گیند سمجھ کر کھیل رہے ہیں۔ اسے کہتے ہیں تڑکا جو آپ کی ذہنی صلاحیتوں کو آگے بڑھاتا ہے۔ بعض اوقات میرے پاس آمد نہیں ہوتی تو میں لکھنا چھوڑ دیتی ہوں اور اُس وقت تک نہیں لکھتی جب تک میرے اندر لکھنے کی تحریک پیدا نہ ہو۔

☆ ردیف، قافیہ، بحر، اوزان سے گریز، تن آسانی کے زمرے میں آتی ہے یا اس کا سبب کچھ اور ہے؟

☆☆ بات یہ ہے کہ ردیف، قافیہ، بحر، اوزان سے میں واقف تو تھی مگر مہارت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میر، غالب، نظیر کو پڑھنے کے بعد خود میں اتنی ہمت نہیں پائی کہ ویسا وزن، ویسی بندش اور ویسی بحر میں شعر کہوں۔ سو بہتر یہ جانا کہ میں اپنے خیالات کو اپنے انداز یا یوں کہہ لیجیے کہ سادہ طریق پر پیش کروں۔ اب اس ترکیب کو آپ کیا نام دیتے ہیں یہ میں آپ پر چھوڑتی ہوں۔

☆ آپ کی نظموں کا آہنگ وقت، مزاج اور ماحول کے ساتھ تبدیل ہونے کی وجوہات کا پتہ لگانا وقت کی اہم ضرورت ہے؟

☆☆ اصل میں وقت بڑی چیز ہے اور جس تیزی سے وقت بدل رہا ہے اُس تیزی سے انسان خود کو نہیں بدل پا رہا۔ میں گئے وقت اور حاضر وقت کی بابت سوچتی ہوں تو بڑی حیران ہوتی ہوں کہ باوجود کوشش کے میں خود کو وقت کے سانچے میں کیوں نہ ڈھال پائی۔ اب یہ میں نہیں جانتی کہ یہ صرف میرا مسئلہ ہے یا ہر اُس آدمی کا مسئلہ ہے جو سوچ، فکر اور خیال رکھتا ہے۔

☆ آپ کی نظموں میں بغاوت اور نافرمانی کی نشان دہی اگر درست ہے تو کس کے خلاف؟

☆☆ ہر چند محلے کے بچوں سے میں گالیاں سیکھ گئی تھی مگر اماں ابا کے ڈر سے کبھی میری زبان پر کسی طرح کی گالی نہیں آئی۔ مگر جب محلے کا گٹر ابلتا تھا اور معصوم بچے اُس میں گر جاتے تھے تو میرا دل چاہتا تھا کہ میں کوئی موٹی سی گالی دوں مگر خواہش کے باوجود اُس وقت بھی میں اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی مگر جب عملی زندگی میں قدم رکھا اور بڑے بڑے خوبصورت لوگوں کے بدصورت کرتوت دیکھے تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ خاندانی تربیت کے باعث غلیظ گالیاں تو میری زبان پر نہیں آئیں البتہ میری اڑان ''کتے کا بچہ'' اور ''کنکھجورے کا بچہ'' تک محدود رہی۔

☆ آپ کی نظم ''نیند'' کو منٹو اور بیدی کا اجتماع ضدین کن وجوہ کی بنا پر

ٹھہرایا گیا؟

☆☆ دیکھئے! جب یہ کتاب میں نے لکھی تو اُس وقت میری عمر اکیس یا بائیس برس ہوگی۔ میرے اندر اُس وقت بے پناہ شوخی اور شرارت بھری ہوئی تھی۔ ٹھہراؤ نام کی کوئی چیز نا ہونے کے برابر تھی بلکہ یوں کہیں کہ ایک طرح کی بغاوت کچھ کرنے پر اکسا رہی تھی۔ جہاں تک سوال فکشن کا ہے تو منٹو اور بیدی جیسے بڑے لکھنے والوں کے سوالات بہت بھرپور ہوتے ہیں اور ہم تک پہنچتے پہنچتے سوالات چھوٹے ہونے کے باوجود اُن کے معنی اور مفہوم کسی طور کم نہیں ہوتے۔ منٹو اور بیدی تو میرے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں میں نے تو پچھلے دنوں سارتر کو پڑھا اور میرا ذہن پھر سے قلابازیاں کھانے لگا۔ سو انسانی ذہن زندگی کے کس حصے میں ٹھہراؤ کا شکار ہوتا ہے یا ہونا چاہیے اس کی بابت کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہے۔

☆ ایک صاحب ٹی ایس ایلیٹ کی احتیاط کا ذکر کرنے کے بعد جہانِ ناپید کو وجود میں لانے کا کریڈیٹ بھی آپ کو دے رہے ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں تو یہ سوال ہی بہت عظیم ہے۔ پہلے تو میں اس پر تالی بجالوں۔ ایک طرح سے یہ میری خوش نصیبی ہے کہ اُن صاحب کو میرے چاروں طرف ایک اچھی صورت حال کا اندازہ ہو رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ سلسلہ اسی طرح جاری وساری رہے اور پروردگارِ عالم کا اسی طرح مجھ پر کرم اور فضل بنا رہے۔

☆ سارہ شگفتہ اور عذرا عباس کے اسلوب اور تلمیحات میں مماثلت بتلانے والے کس امر کی جانب اشارہ کر رہے ہیں؟

☆☆ سارہ شگفتہ میری ہم عصر اور اچھی شاعرہ تھی۔ میں نے ہمیشہ اُسے جی جان سے چاہا اور سراہا۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کی جانب سے ردِعمل میری توقع کے برعکس ہی رہا۔ میں اب تک حیران ہوں کہ سارہ شگفتہ نے اپنے لیے اتنے مختلف راستے کیوں چنے اور اُس کے سبب مشکلات بلکہ بے پناہ درد والم بھی اُس کا مقدر بنا۔

☆ آپ کے ہاں ڈی۔ ایچ۔ لارنس سے دانستہ یا غیر دانستہ قرب کس نوعیت کا ہے اور آپ کی تخلیقات میں اُس کا اظہار کس رنگ میں نظر آتا ہے؟

☆☆ سچی بات تو یہ ہے کہ میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے پاس سے کبھی گزری بھی نہیں ہوں اگر اس کے باوجود احباب کو کسی طرح کی مماثلت میری تخلیقات میں نظر آتی ہیں تو اسے میں اُن کے حسنِ نظر ہی سے تعبیر کروں گی البتہ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے بارے میں یہ ضرور کہوں گی کہ وہ بڑا لکھنے والا تھا، ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

☆ اگر اس رائے سے اتفاق کر لیا جائے کہ جدلیاتی طرزِ احساس کی تشکیل آپ نے متعارف کرائی ہے تو اس کا ماخذ اور جواز جاننا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے؟

☆☆ جناب گلزار جاوید صاحب! آپ نے میرے سامنے اس طرح کے سوالات کھڑے کر دیے ہیں کہ جن کا جواب دینا میرے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ لہجے میں بھی خم ٹھوک کر میدان میں آ گئی اب کسی کو پسند ہو یا نہ ہو۔ دیکھئے بات یہ ہے کہ جب میں نے بیچلر اور ماسٹر کیا تو اُن دنوں میں بہت سے لوگ جدلیاتی طرزِ احساس پر تنقید بھی کر رہے تھے اور بہت سے لوگ اپنی تحریروں میں اس طرزِ احساس کو برت بھی رہے تھے جن میں افتخار جالب کا نام میرا حافظہ بتلا رہا ہے۔ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ میں بس اسٹاپ پر کھڑی تھی اور کچھ لوگ انگریزی کی کتاب اٹھائے میرے پاس آئے اور اُس میں نشان زد کیے صفحے پر انگلی رکھ کر کہنے لگے کہ آپ نے یہ یہ خیال یہاں سے چُرایا ہے۔ جب میں نے اُن کو بتلایا کہ مجھے اردو زبان کے علاوہ کوئی زبان نہیں آتی تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

☆ بات اگر فکشن کی ہو تب بھی تنقید کے حوالے سے ہُو کا عالم ہے۔ نظم وہ بھی نثری کے باب میں صورت حال کس نوعیت کی ہے؟

☆☆ یہ جو ہمارا تخلیقی کام ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو بھی بُرا بھلا ہمارے ذہن میں آتا ہے ہم لکھتے رہیں۔ ہمیں یہ نہیں دیکھنا کہ وقت کا عمل کس طرح کا ہے وہ ریت میں ڈھک گیا ہے یا پانی میں ڈوب گیا ہے۔ وہ غریبوں کو پیس رہا ہے یا امیروں کو چکا چوند چاندنی میں نہلا رہا ہے۔ سو ادیب کا کام کسی کو بڑا چھوٹا بنانا ہرگز نہیں۔ یہ کام وقت کا ہے اور ہمیں اُسی پر چھوڑ دینا چاہیے۔

☆ ناصر عباس نیئر استعاراتی پرت کے ضمن میں جن غیر مانوس حیرت و استعجاب اور کشف کی صورت کو منکشف یا دریافت کرنے کی بات کرتے ہیں اُس کی بابت قاری کنفیوژن کا شکار ہے؟

☆☆ اگر قاری کو ادیب کا لکھا سب کچھ ہی پسند آ جائے تو میرے خیال میں یہ تو ایک طرح کا کنفیوژن ہے۔ میں نے بہت عرصہ پہلے ناصر عباس نیئر کو پڑھا تو میرے دل نے کہا یہ تو بہت عجیب آدمی ہے سمجھ سے بالکل باہر مگر جب میں نے سنجیدگی کے ساتھ دل لگا کر پڑھا تو میری ناصر عباس نیئر سے دوستی ہو گئی اور مجھے یہ لگا کہ یہ پانی کی سطح پر بہتا ہوا لکڑی کا ایک ٹکڑا نہیں بلکہ بذات خود علم وادب کا ایک دریا ہے جس کا ہاتھ نہ صرف وقت کی نبض پر ہے بلکہ قاری کے دل اور دماغ کی دھڑکنیں بھی بخوبی سنتا اور سمجھتا ہے اور اُس کو صحیح راستہ بھی دکھلاتا ہے۔

☆ سیاست بھی آپ کا موغوب موضوع رہا ہے اور اس پر آپ معذرت خواہ بھی نہیں، آپ کے مزاج اور مذاق کو کس قسم کی سیاست بھاتی اور بہلاتی ہے؟

☆☆ کوئی بھی لکھنے والا پہلے ایک انسان ہوتا ہے۔ کسی ملک کا ذمہ دار شہری بھی ہوتا ہے تو پھر وہ سیاست سے الگ کیونکر رہ سکتا ہے۔ سیاست تو خالا اور پھپھو کی لڑائی میں بھی دیکھی جا سکتی ہے اور سیاست اُن بلند بانگ دعوں میں بھی نظر آتی ہے جن میں کوئی ملک ڈوبنے کی بات کرتا ہے تو کوئی سہانے خواب دکھلا کرتا بناک مستقبل کے سپنے دکھاتا ہے۔ ادیب کا کام ان سب باتوں کو اپنی عینک سے دیکھ کر قاری کو بتلانا ہے کہ وہ ڈوب رہا ہے یا تیر رہا ہے اُس کی آنے والی نسلوں کا مستقبل روشن ہے یا تاریک اگر کوئی لکھنے والا اس عمل سے روگردانی کرتا ہے تو میرے خیال میں اس سے بڑا کوئی جرم نہیں۔

☆ آپ نے جس زمانے میں لکھنا شروع کیا اُس وقت بات کہنے،

سننے بلکہ سمجھنے کا مادّہ معاشرے میں پایا جاتا تھا جبکہ صورت حال آج قطعی برعکس ہے؟

☆☆ سوال یہ بھی آپ کا کُلی طور پر سیاسی ہے اور اسے ہماری بدقسمتی کہہ لیجیے کہ مسائل بھی ہو بہو وہی ہیں جیسے میں نوعمری یا نوجوانی میں اپنے حالات کی بابت سوچتی اور اپنے ماں باپ کے چہروں پر نظر دوڑاتی تو میں ضبط کے باوجود اپنے آنسو نہ روک پاتی۔ آپ بھی دل پر ہاتھ رکھیے اور سوچیے کہ جب آپ اپنے چاروں طرف مفادات کی اینٹیں بچھی ہوئی دیکھتے اور قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں تو کیا اُس وقت آپ کی آنکھیں آپ سے کچھ نہیں کہتیں۔

☆ اُن دنوں حلقے، دائرے اور بیٹھکوں کا ادیب کی نشوونما میں اہم کردار ہوتا تھا مگر آج کا ادیب طرح طرح کے ڈر، خوف اور وسوسوں کے باعث تنہائی کا شکار ہے۔ ان حالات میں اُس کی ادبی اُٹھان اور اُڑان کیا شکل اختیار کرے گی؟

☆☆ دیکھیے گلزار صاحب! اگر وہ بیٹھکیں اُس وقت نہ ہوتیں تو شاید میں ادیب یا شاعرہ نہ ہوتی۔ جب ہم گفتگو کی غرض سے اپنے دوستوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ کہیں بیٹھ کر اپنے دکھ سکھ شیئر کرنا چاہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی ذات کو اُن کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ہم نے بھی ایسی بہت سی بیٹھکیں سجائیں اور اُن سے بہت کچھ سیکھنے کی کوشش بھی کی۔ قمر جمیل اور افتخار جالب جیسے مختلف دوست جو اپنے منہ کا نوالہ بھی دوستوں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے اُن کے ساتھ زمانہ کے بہت سے گرم وسرد دیکھے اور سہے اور اسی کے زیرِ اثر جو بہتر سمجھا اُسے سپردِ قلم کر دیا۔

☆ ہماری اور آپ کی نسل نے دنیا میں کافی تغیر وتبدل یعنی سوشلزم، اسلامی سوشلزم، کمیونزم، فیمنزم، دریدا، ماڈرن ازم، پوسٹ ماڈرن ازم جیسے شوشے اور نوٹنکیاں دیکھی اور بھگتی ہیں۔ آپ اور آپ کے ہم عصر لکھنے والے کس نظریے یا ازم کے جھانسے اور چکمے میں آئے اور تخلیقات میں اُس کے برتاؤ سے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

☆☆ قطعاً کوئی نتائج برآمد نہیں ہوئے سوائے بھوک، بے روزگاری، بدامنی اور مہنگائی کے ہمارے حصے میں کچھ نہیں آیا۔ ہماری حیثیت تو اُس دیہاڑی دار کی سی ہے کہ جو کندھے پر جھولا لٹکائے آواز لگاتا گلیوں اور ویرانوں میں جمہوریت، خوشحالی، امن اور تحفظ کی تلاش میں ہے۔

☆ روشنیوں کے شہر کراچی کی رونقیں گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بدلنے والوں کے ذکر کا یہ محل نہیں البتہ معاشرے کے بیدار مغز لوگوں بلخصوص اہلِ علم اور اہلِ فن پر جو بیتی اُس کا بکھان آپ کی تخلیقات میں کس طور نظر آتا ہے؟

☆☆ ایسا نہیں ہے کہ آپ نئے سوالات اٹھا رہے ہیں۔ ہمارے عمل کے ردِعمل سے ایسے ایسے نئے سوالات جنم لے رہے ہیں جن کا ہمارے پاس حل تو دُور کی بات جواب تک موجود نہیں ہے۔ کتابیں لکھی جا رہی ہیں شاید پڑھی بھی جا رہی ہوں مگر مسائل اپنی جگہ سے ٹَس سے مَس ہونے کو تیار نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اب کُوچ کا وقت قریب ہے مگر یہ ملال اکثر دل کو ستاتا ہے کہ ہماری جدوجہد کا ہماری نوجوان نسل کو کیا ثمر ملا، یا ہم اپنی نوجوان نسل کو ورثے میں کیا دے کر جا رہے ہیں؟

☆ مہذب معاشروں نے مملکت میں مذہب کا عمل دخل ختم کر کے انسان کا ذاتی معاملہ ٹھہرایا۔ ہمارے ہاں علوم فنون کا ازکار رفتہ بن جانا کس عمل کی دلیل ہے؟

☆☆ اصولی طور پر تو مجھے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہیے۔ میرے گھر سے دو گھر چھوڑنے کے بعد تیسرے گھر میں جو لوگ رہتے ہیں مجھے اُن کی تہذیب، تمدن اور معاشرت قطعی طور پر سمجھ نہیں آتی۔ بچپن سے ماں باپ کی یہی کوشش تھی کہ ہمارا رہن سہن اور بود و باش مذہب کے دائرے میں ہو۔ میرے خیال میں یہ بات ٹھیک بھی ہے زندہ رہنے کے لیے انسان کا کوئی نہ کوئی نسب العین کوئی نہ کوئی ضابطہ حیات ہونا چاہیے۔ مسئلہ یہ درپیش رہا کہ مذہب میری گھٹی میں شامل کر دیا گیا مگر میرے جیون ساتھی کی سوچ، سمجھ اور عمل مجھ سے لگّا نہ کھاتا تھا۔ تمام عمر اسی تردد اور گومگوں میں گزر گئی کہ میرا علم اور میرا مذہب کس طور میری اور میرے معاشرے کی رہنمائی کر رہا ہے؟

☆ افغانستان میں حکومت کی تبدیلی اور عالمی سطح پر کرونا کی وبا کے بعد اردو زبان وادب اور علوم وفنون کا مستقبل آپ کے خیال میں کس طرح کا دکھائی دیتا ہے؟

☆☆ بھیّا! صاف بات یہ ہے کہ اردو زبان اور علوم وفنون تک محدود رہنا خود کو ایک دائرے میں محصور کرنے کے برابر ہے۔ کرونا پہلی بار نہیں آیا۔ چیچک، ہیضہ، پلیگ، ٹی بی، ٹائیفائیڈ، یرقان کی شکل میں نام بدل بدل کر آتا رہا ہے اور شاید آئندہ بھی آتا رہے مگر آج کے انسان کی سوچ، فکر اور ترجیحات جہاں تک پہنچ گئی ہیں وہاں سے واپسی اتنی آسانی سے نظر نہیں آتی۔

☆ جن خواہشات، اُمیدوں اور ارادوں کے ساتھ آپ نے لکھنے کی ابتدا کی اُس میں کس حد تک کامیابی ملی۔ نہیں ملی تو اُس کا ذمہ دار کون ہے۔ وقت، حالات، معاشرہ یا آپ خود؟

☆☆ میں نے امیدوں اور ارادوں کو سامنے رکھ کر کبھی نہیں لکھا۔ لکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اٹھارہ انیس سال کی لڑکی کی امیدیں اور ارادے ہو بھی کیا سکتے تھے۔ میں تو اُس کیفیت کے زیرِ اثر لکھتی تھی جو لہروں کی شکل میں، خیالات کی شکل میں مجھ پر طاری ہوتی تھی مگر جب ایم۔اے کی تعلیم کے دوران یونیورسٹی کے اندر مختلف علوم وفنون کی کتابیں میرے مطالعے میں آئیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ جو کیفیت مجھ پر گزر رہی ہے کسی نہ کسی شکل میں ہر انسان پر گزرتی ہے۔ بس ایک عشق نہ تھے لوگوں پر وار کر گیا۔ بہت سے دوست ملے، رقیبوں سے بھی پالا پڑا جس سے زندگی کے مقاصد اور اہداف قدرِ تبدیل ہو گئے مگر میں نے لوگوں کی نصیحت اور فضیحت کو سامنے رکھ کر لکھنے کے بجائے وہی کچھ لکھا جو میرے دل کی آواز تھی اور آج بھی میں یہی کوشش کرتی ہوں اور مجھے اپنے اس عمل پر کبھی کسی قسم کا کوئی دکھ، رنج، ملال یا پچھتاوا کبھی نہیں رہا۔

حیرت کے اُس پار (۲۰۰۶ء)

میری نیند نہ چھینو

یہ نیند ہی تو ہے
جو دکھلاتی ہے مجھے خواب
یہ خواب ہی تو ہیں
جو
سمندر سے مجھے ملا دیتے ہیں
اور اس محبت سے
جو اسے مجھ سے ہے
جو میرے پیچھے اس وقت
سے بھاگ رہی ہے
جب میرے ہونٹ بالکل کنوارے تھے
شفاف شبنم کے قطرے
ان پر گر کر مجھے بوسے دیتے تھے
اور جاگتے تھے میرے خواب
اور وہ محبت جسے میں ڈھونڈتی تھی
اب اس گسے ہوئے آسمان پر
دیوانہ وار بھاگتی اس زمین پر
نیند نہ ہو
تو کیا ہوگا
کون دیکھے گا خواب
سب بچھڑ جائیں گے اپنے خوابوں سے
اور وہ بھی مجھ سے

○

چڑھائی

یہ جو ہری گھاس کا میدان نظر آ رہا ہے
یہ اوپر تک
یہی جس کے اوپر ہے نیلا آسمان
اور جس کے نیچے
بہت سفید نظر آنے والے بادل
کیا آپ چڑھ پائیں گے
شروع کریں چڑھنا
ہر قدم کے ساتھ بہت سی یادوں کی
گرہیں کھولتے جائیں
تو یہ اونچائی
آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی
آپ چڑھتے چلے جائیں
سانس بھی نہیں پھولے گا
بس تھوڑا سا ارادہ ضروری ہے
لیکن اس چڑھائی سے پہلے
سوچ لیں
جانا کدھر ہے

دل

دل
چوٹ کھائے ہوئے
جوں، سہا ہوا ایک چوزہ
آنکھیں موندے
ایک کونے میں دبکا پڑا ہے
کوئی ہتھیلی میں اٹھائے
تو دیکھے،
زندہ ہے
یا
مر گیا

بیٹی کے نام

دل۔۔۔
اس دل کے فیصلے پر مت جانا
دل
جس کے ایندھن میں جو آگ روشن ہے
یہ آگ جلاتی ہے
جسم۔۔۔
خس وخاشاک کی طرح
ایک ایک پور۔۔۔جلتی ہے
دل۔۔۔فیصلہ کرتا ہے
جسم کو مٹانے کا
میں نے بھی
اس دل کا کہا مانا
کچھ بھی تو نہیں پایا
تم اگر دل کے کہے پر چلیں
تو یہی حال ہوگا تمہارا
جو میرا ہوا
جسم کو ستانے کے لیے، چل پڑو گی
دل کا کہا نہ مانو
ورنہ جسم بدحال ہو جائے گا
اور دیکھنے والے
نہ جان سکیں گے
یہ سب
کیونکر ہوا۔۔۔

○

جیسے میں تنہا ہوں

محبت پہلے جسم کو نہیں چھوتی
محبت دل سے دل کی طرف
جاتی ہے
میں تم تک ایسے ہی
پہنچی تھی
آج میں تنہا ہوں
تمہاری محبت اب صرف
میرے جسم کو چھوتی ہے
میری محبت تمہارے دل کو
ٹٹولتی ہے
جو خالی ہے
میں تمہیں تنہا نہیں ہونے دوں گی
خالی دل سے جب
جسم چھوا جاتا ہے
تنہائی دور سے نظر آتی ہے

○

حیرت کے اُس پار

دو آنکھیں تھیں
اس دعوت میں
دو دل تھے
اس منظر میں
ایک مُسکان تھی ذرا پرے

قسطوں میں بٹی محبتیں

محمد سلیم الرحمٰن
(کراچی)

''بہت سے ایسے منظر جنھیں شاید نہیں بھلانا چاہیے تھا ہوسکتا ہے میں بھلا بیٹھی ہوں لیکن جو یاد رہ گئے ہیں وہ کیوں یاد رہ گئے ہیں مجھے پتا نہیں۔''

فکشن اور خودسوانح کے درمیان حدفاصل قائم کرنا مشکل ہے۔ بہت سا فکشن خودسوانح کی بدلی ہوئی شکل ہے اور بہت سے خودسوانح میں فکشن کی آڑی ترچھی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ماضی کو یاد کرنا یا یاد رکھنا تو مشکل نہیں لیکن ٹھیک ٹھیک یاد رکھنا خاصا دشوار ثابت ہوسکتا ہے، خصوصاً اس صورت میں جب ہم کسی داخلی یا خارجی دباؤ کے تحت اسے ٹھیک طرح یاد نہ رکھنا چاہتے ہوں۔

گویا خودسوانح پر زیادہ اعتبار نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ تقاضا ہی کیوں کیا جائے کہ وہ لفظ بہ لفظ، واقعہ بہ واقعہ درست ہو؟ ہر انفرادی ماضی، مرد کا یا عورت کا، بڑی حد تک نجی چیز ہے، ایک طرح کا خواب جسے کوئی اور نہیں دیکھ سکتا، جس میں کوئی اور شریک نہیں ہوسکتا۔ ایک طویل، صبر آزما خلوت۔ یہ مانا کہ بعض باتوں کی تردید کرنا شاید ممکن ہو لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ کہنے یا لکھنے والے نے اپنے ماضی کو جس طرح بیان کیا ہے، سمجھا یا محسوس کیا ہے وہ کسی سچائی کا حامل نہیں۔ یہ ماضی، بہرحال، میرا یا آپ کا نہیں۔ اس سے انھیں شرائط پر آگاہی حاصل کرنے یوگی جو ماضی والے نے عائد کی ہوں۔

عذرا عباس نے بچپن کی بکھری ہوئی یادوں کو سمیٹا ہے۔ اگر کوئی قاری اس کتاب کو فکشن ماننے پر مصر ہو تو اسے یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ اردو میں فکشن اتنے سلیقے اور کفایت سے روز روز نہیں لکھا جاتا۔ انداز بیان میں خودنمائی ہے نہ لفاظی، سجاوٹ ہے نہ بناوٹ، رقت آمیزی ہے نہ خودترسی۔ خود اپنے آپ میں کھوئی ہوئی سیدھی سادی شفاف سی نثر جسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کی یکجائی جو کسی اہتمام کے بغیر آپس میں جڑتے جاتے ہیں۔

نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی اس لڑکی کا بچپن ہم میں سے بہت سوں کا بچپن ہوسکتا ہے۔ گھر کے اندر اور گھر سے باہر کی یہ یادیں بنتے بگڑتے یا پختہ ہوتے انسانی رشتوں کی روداد ہے۔ دنیا اور دنیا والوں کو جاننے پہچاننے کے کڑے مرحلوں سے گزرنے والی لڑکی حیرت زدگی کے عالم میں ہے اور یہ حیرت کبھی کبھی دہشت زدگی میں بدل جاتی ہے۔ صرف بچپن ہی میں ہم صحیح معنی میں اپنے گردوپیش سے حیرت زدہ یا دہشت زدہ ہوسکتے ہیں۔ کہانی کہنے والی کو بس ادھورا سا شعور ہے کہ جو سمجھ میں نہیں آتا یا آسکتا وہ ان باتوں پر حاوی ہے جو سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ان معاشروں میں جہاں مردوں کی بالادستی قائم ہو۔ عورتوں کو بچپن سے بڑھاپے تک، یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ کوئی ٹھکانہ، کوئی فیصلہ، جینے کا کوئی انداز ان کا اپنا نہیں۔ ان کی زندگیاں ان مسلط کیے ہوئے فیصلوں سے الجھتے ہوئے گزرتی ہیں۔ یہ کشمکش اس آپ بیتی میں پہلے ورق سے موجود ہے۔ عذرا عباس نے کسی چالاکی یا ہاتھ کی صفائی کے بغیر سب کچھ بچی یا لڑکی کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ محرکات تلاش کرنے یا تجزیہ بازی کے چکر میں نہیں پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ بیانیہ قربت کے احساس سے لبالب ہے جیسے سب کرداروں اور واقعوں کو ابھی ابھی دیکھا ہو۔ اس چھوٹی سی کتاب میں کردار ہیں بھی جاندار۔ کون ہے جو دادا ابا، چاندی کی بالیاں بیچنے والے، چوہیا والی عورت، شمو کی اماں، پاگل عورت اور سگو کو آسانی سے بھلا سکے۔ بیانیے کی بے ساختگی میں کھلا پن بلکہ کھلا ڈلا پن ہے مگر کوئی بات محض چونکانے کے لیے، چٹخارے کی خاطر نہیں۔

☆

دادا ابا، ابا سے کہتے۔ دیکھو اسے پڑھوانا مت۔ مجھے اس لڑکی کی حرکتوں سے خوف آتا ہے۔

شاید دادا چہرہ شناس تھے۔ بھانپ لیتے تھے کہ یہ نہنگ لاڈلی ہُشت ہُرو کرتی پھرتی ہے۔ وہ عذرا عباس کو چھڑی سے پیٹا کرتے۔ عذرا عباس بھی دادا کو تنگ کرنے اور جلانے سے باز نہ آتی۔ عداوت بھی ایک طرح کا رشتہ ہے۔ ٹوٹ جائے تو پھر نہیں جڑتا۔ اس نے جب دادا کے مرنے کی خبر سنی تو سب سے زیادہ روئی۔

عذرا عباس کی پہلی نظم ''نیند کی مسافتیں''، جو تین کانٹوز پر مشتمل تھی، 1981ء میں شائع ہوئی تھی۔ گویا انھیں نظمیں لکھتے چالیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ انھوں نے نثری نظم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ''اداسی کے گھاؤ'' کے عنوان سے شائع ہونے والی کلیات 719 صفحات پر مشتمل ہے۔ نثر میں فکشن بھی لکھا یا فکشن نما آپ بیتی۔ نثر لکھنے کا سلیقہ ہے اور بعض دفعہ افسوس ہوتا ہے کہ فکشن سے اتنا کم اعتنا کیا۔

''نیند کی مسافتیں'' میں ایک اندرونی ربط ہے جو پوری طرح عیاں تو نہیں ہوتا ہے لیکن ان دریاؤں سے مشابہ ہے جو صحراؤں میں گم ہو جاتے ہیں اور سمندر تک نہیں پہنچتے۔ غالباً نظم کے یہ الفاظ ''جیسے کسی بہت اجنبی خواہش کے درمیان بہت اجنبی دکھ کا سامنا ہو جائے'' نہ صرف اس واحد طویل نظم بلکہ باقی نظموں کے مزاج کی ترجمانی کرنا معلوم ہوتا ہے۔ نثری نظموں کے سات سو صفحے پڑھنا آسان نہیں، خاص طور پر جب وہ ایک ہی شاعر نے لکھی ہوں اور جس کی توجہ مظروف پر زیادہ ہو اور لفظیات پر کم۔ لیکن کہیں کہیں، اگرچہ بہت کم، آہنگ بھی بدل جاتا ہے اور لفظیات بھی، جیسے ''ہجر کی چاشنی کیا خوب ہے۔'' ایسے اچنبھے کلیات میں کم ہیں۔

دیواروں کی طرح کھڑی ان نظموں میں دروازے اور دریچے بھی ہیں جن میں سے ہوا اور روشنی اور آوازیں اندر پہنچ سکتی ہیں اور پتا چلتا ہے کہ باہر کبھی حبس اور اندھیرا بھی ہوتا ہے اور خاموشی بھی۔ عذرا عباس کی نظموں میں

بغاوت اور نافرمانی کی ایک لہر ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔ان ناانصافیوں کے خلاف، جو دنیا میں قائم ودائم ہیں، آواز بلند ہوتی ہے لیکن لہجے میں متانت ہے جیسے یہ پتا ہو کہ چیخنے چلانے کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا بلکہ یہ چیخ پکار ان ستم گروں کو یقین دلاتی ہے کہ وہ کام یاب ہیں اور ظلم رسیدہ خلقِ خدا بے بس اور نہتی۔

جن نظموں کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے ان میں ''ہنس کر ٹال دو''''ایک زندگی اور مل جائے''''بلا ناغہ''''ایک خط خالی گھر میں پڑا ہے''(کسی کسائی نظم جو کسی الم ناک افسانے سے مشابہ ہے)''خواب اور زندگی''''چوہے کو کیسے مارا گیا''(کٹیلے طنز سے بھرپور)''یہ سال گزر گیا''''جب کچھ پیسے میرے پاس بچتے ہیں''(بے بسی کی ایک اور کہانی)''قسط''''کیا وہ ملا؟''(گم شدگان کے بارے میں)اور''صبح کے چار بجے جاگتے جگتے''۔

محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے خود کو دنیا کے سامنے، کچھ چھپائے بغیر، لا کھڑا کیا ہے تا کہ زندگی کی تمام قوتوں اور حرارتوں سے نبرد آزما ہوا جائے۔سرگوشی سے ملتے جلتے لمحے میں اپنے تجربوں اور دکھوں کو ادا کر دیا ہے لیکن کسی قدر عجلت سے، گویا جھٹ پٹ کسی آ بھٹکے خیال کو مناسب لفظوں کا جامہ پہنانا مقصود ہو، جیسے ماضی میں، جس پر رنج والم نے پردہ ڈالا ہوا ہے، چند نتھرے ستھرے لمحوں کی تلاش۔ذات کی علیحدگی کا جواز تلاش کیے بغیر اس افتاد کی نشان دہی جو دوسروں کے ہونے یا نہ ہونے سے وجود میں آئے۔اس مضمون کو''میری کرسی خالی''میں خوبی سے بیان کیا گیا ہے،''اب/ وقت نے ہارے درمیان/ فاصلے کی لکیر کھینچ دی ہے/ آج جس کرسی پر/ تم بیٹھے تھے/ اس پر میں بیٹھی ہوں/ میری کرسی خالی ہے۔''دوسری کرسی تو، اس تسلی کے باوجود، خالی ہی رہے گی۔خود فریبی سے خلا پُر نہیں ہوتے۔نظموں میں جو حزن رچا ہوا ہے اس پر خستہ حالی کا گمان ہوتا ہے۔ اسے domesticated misery کا نام دیا جا سکتا ہے۔انگریزی کے ان دو لفظوں کا اردو کے دو لفظوں میں ترجمہ کرنا میرے بس میں نہیں۔زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے: گھر میں پلنے پر راضی نہوست۔

معلوم نہیں کلیات کو کس نے مرتب کیا ہے۔مجھے تین نظمیں ایسی نظر آئیں جو دو دو بار چھپی ہوئی ہیں۔شاید اور بھی ہوں۔''محبت مجھے اکثر نظر آتی ہے''پہلے ص 513 پر اور پھر ص 717 پر درج ہے۔اسی طرح''تمھیں آزادی چاہیے''ص 486 اور پھر ص 689 پر موجود ہے۔تیسری نظم''کل کیا ہونے والا ہے''ص 416 اور ص 625 پر موجود ہے۔اس لاپروائی کی ذمے داری کسی کو تو قبول کرنی چاہیے۔

- بقیہ -

''نیند کی مسافتیں''

کا اجتماع راجندر سنگھ بیدی نے بمبئی کے عظیم الجثہ شہر میں یوں دکھایا ہے:''ایک بات ہے۔ست جگ، دواپر اور تریتا جگوں میں تو پورا نیائے تھا۔پھر بھی عورتیں محبت کیوں چھوڑ کر جایا کرتی تھیں؟ جب گنگا، ویشیا کیوں تھی؟ آج تو انیائے ہے: پگ پگ پر انیائے! پھر انہیں کیوں روکا جاتا ہے؟ کیوں ان پر قانون لگائے جاتے ہیں؟ جو روپیہ ٹکسال سے آتا ہے اس کی قیمت آٹھ آنے رہ جاتی ہے۔افلاس اور وافر پیسے کے میل جول کی جتنی ضرورت آج ہے، تاریخ میں کبھی بھی ہوئی؟ دبا لیں اسے، تا کہ گھر کی لکشمی باہر نہ جائے۔مگر دولت پیسہ تو Bitch Goddess ہے۔وہ کتیا ہے۔بوپہ آئے گی تو جائے گی ہی۔۔۔''راجندر سنگھ بیدی کا جدلیاتی اسلوب پوری طرح موجود ہے۔یہاں کلیانی اجتماع اور مہی پتا اجتماع کے حوالے سے دوسرا کونسا ہے؟ بمبئی: افلاس اور وافر پیسے کا میل! اجتماعوں کا اجتماع! نکہت حسن کا محمد میاں جمع خاتون کی ذات ذوات مقام ہے تو راجندر سنگھ بیدی کا اجتماعوں کا اجتماع مقامات کی ہائرارکی، جو کلیانی اجتماع اور مہی پت اجتماع ایسی ہائرارکیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔اگر پرسپشن میں اتنی ہی سکت ہے تو جانئے کہ محمد میاں جمع خاتون ایسی ذات ذوات کی نیرنگیاں ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس نظم کی کومل سطح، نغمگی اور شرافت ایک کھلا فریب نظر ہے۔فرض کریں کہ کلیانی شاعر ہے، اس کا اظہار نیند کی مسافتیں ہے۔پھر، اس نظم کی کومل سطح، نغمگی اور شرافت کلیانی اجتماع کے اظہار میں ایسی ہی محسوس ہوگی؟ ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ کلیانی اجتماع ہے متصادم اور منسلک مہی پت اجتماع کو زندہ موجود کرنیوالی متخیلہ بھی ہو۔چھوڑیں، بھلے ایک مفروضے کہ نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ عذرا عباس کی خودنوشت کے سناٹے تو ہیں ہی! وہ پوچھتی تھی:''ابا''''تھا''کے کیا معنی ہیں۔۔۔''ہے''،''تھا''،''ہوگا''،''ہوں''،''میں''،''ہیں''اور''اب''کوئی میری بات کا جواب نہ دیتا اور میں ان لفظوں سے چکرانے لگتی۔میں اب بھی لفظوں کے معنی سوچتی ہوں اور شاید سوچتی ہی رہوں گی۔وہ معنی جو میرے بچپن سے لے کر میر، غالب اور نظیر اکبرآبادی۔۔۔رلکے، بودلیئر، لورکا، جان پرس اور کافکا تک پھیلے ہوئے ہیں۔میں ان سے بھی یہی معنی پوچھتی ہوں اور یہ مجھے اس لیے اچھے لگتے ہیں کہ برے یا بھلے ان کے پاس میرے سوال کے کچھ نہ کچھ جواب ہوتے ہیں، لیکن یہ لوگ بھی اُن لفظوں کے معنی نہیں بتاتے۔۔۔''
جہاں زبان کے ان ابتدائی الفاظ کے معنی متعین نہ ہوں، وہاں بھرپور گویائی کے اتھاہ سناٹوں کا کیا عالم ہوگا؟ اللہ تمہارا حامی وناصر ہو، آمین!

نیند کی مسافتیں

افتخار جالب

(●)

نیند کی مسافتیں، جدلیاتی طرز احساس
دوسرے دوسرے نہیں خود ہی ہیں
یعنی ذات ذوات کا انجذاب اور مکالمہ!
اجتماعوں کے اجتماع میں منفعل مقامات کی جھلک
یعنی منٹو کہ بیدی کہ کیفیات کی ھائرارکی
تو فرض کریں کہ کلیانی شاعر ہے۔
ڈی۔ایچ۔لارنس کی ایک کہانی کا عنوان، موضوع اور اسٹکچر یہ استفسار ہے!

تم نے مجھے کیوں چھوا؟ مرکزی مرد کردار پوچھتا ہے۔

مجھے غلط فہمی ہوئی۔اس میں ارادے کا کوئی دخل نہیں۔بس یونہی چھونے کی حرکت سرزد ہوگئی۔سب کچھ اتفاقیہ طور پر ہوا۔لڑکی پریشانی وپشیمانی کے عالم میں کہتی ہے۔

کوئی مقصد، ارادہ اور خواہش نہ تھی، تو پھر چھوا کیوں؟

بھئی حد ہوگئی۔خواہ مخواہ بات کو طول دیئے جارہے ہو۔کیا یہ ممکن نہیں کہ چھو لینے میں، وہ بھی جو محض حادثہ ہی ہو، کوئی پوشیدہ غرض وغایت نہ ہو؟ لڑکی پوچھتی ہے۔

مضمرات ہوں یا نہ ہوں۔مجھے اس سے غرض نہیں۔میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ تم نے مجھے چھوا ہے۔کیا یہ حقیقت نہیں؟ مرکزی مرد کردار پوچھتا ہے۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ لڑکی پوچھتی ہے۔

غضب خدا کا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑا، واہ! یہ کہو کہ تم نے مجھے چھوا ہے یا نہیں؟

ہاں چھوا ہے۔کون سی قیامت آ گئی؟ لڑکی جھنجھلا کر کہتی ہے۔

اپنا حشر ہوگیا۔تم ہو کہ اسے انتہائی معمولی بات سمجھتی ہو۔خوب!

اور کیا سمجھوں؟ دنیا کو تہہ وبالا کرنے والا زلزلہ تو نہیں آ گیا۔

تم چھونے کو حقیر سی بات سمجھتی ہو۔ٹھیک ہے نا! تمہاری نظر میں قیامت اور زلزلے ہی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہو سکتے ہیں۔چھونا ایک ادنیٰ فعل ہے۔معاملہ یوں نہیں۔تمہیں کیا معلوم کے تمہارے چھونے سے مجھ پر کیا بیت گئی؟ مرکزی مرد کردار نے کہا۔

تم پر کیا بیتی، مجھے اس سے بھلا کوئی سروکار ہو ہی کیوں؟

کیا شان بے نیازی ہے؟ میں کہتا ہوں تمہیں مجھے چھونے کا کیا حق تھا؟ مرکزی مرد کردار نے طیش میں آ کر کہا۔

حق کون حق جتلاتا ہے؟ چھونے اور بالخصوص تمہیں چھونے کا تو میں خیال بھی نہیں کر سکتی۔تم خود ہی سوچو، ایک لڑکی کسی اجنبی کو، جب کہ اس کے دل میں کوئی بات بھی نہ ہو، کیونکر چھوئے گی؟

منحرف ہونے کی کوشش مت کرو۔تم تسلیم کر چکی ہو کہ تم نے مجھے چھوا تھا۔چھونے کے بعد، اب تم مجھے اجنبی کیسے کہہ سکتی ہو؟ اب تم میرے لیے اور میں تمہارے لیے اجنبی نہیں۔اس سے انکار مت کرو۔مرکزی مرد کردار نے کہا۔

عجیب جھکی آدمی ہو۔اپنی ہانکے چلے جارہے ہو۔

تم نے مجھے چھوا تھا کہ نہیں۔مرکزی مرد کردار نے کہا۔اب تم مجھے اجنبی کہہ کر اپنا دامن نہیں چھڑا سکتی ہو۔ہم اجنبی نہیں ہیں۔کبھی ہو بھی نہیں سکتے۔ اجنبیت تمام ہو چکی ہے۔

کیسی زبردستی ہے؟ اف میرا خدایا!

اس میں کیا جبر واکراہ ہے؟ میں نے تو چھونے کی استدعا نہیں کی تھی۔یہ سب کچھ تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔طرفہ تماشہ یہ کہ مورد الزام مجھے ٹھہرایا جارہا ہے، حالانکہ صریحاً زیادتی میرے ساتھ ہوئی ہے۔نہ تمہارے ہاتھ چھوتے، نہ میری قلب ماہیت ہوتی۔قلب ماہیت کوئی معمولی عمل نہیں، زفرق تا بقدم سب کچھ متغیر ہو جاتا ہے۔مرکزی مرد کردار نے کہا، کہتا چلا گیا، تا آنکہ وہ لڑکی اندرونیت آشنا اور خود آگاہ ہوگئی۔تقلیب ذات کا عمل مکمل ہو گیا!

یوں آہستہ آہستہ مرکزی مرد کردار کے ذریعے ڈی۔ایچ۔لارنس نسائی لمس کی قیامت خیز معنویت کی توضیح کرتا ہے۔اس وقت مجھے سورہ قیامت یاد آ رہی ہے: بھلا روز قیامت کب؟؟؟؟

گہنا جائے۔اور سورج اور چاند دونوں یک جا کر دئے جائیں۔اس دن آدمی بول اٹھے گا کہ اب کدھر کو بھاگ کر جائیں۔سو، اے آدمی، بھاگنا تو ہو نہیں سکے گا، اس دن کہیں پناہ نہیں۔

ادب وفن میں چاند کو نسائیت سے گہری مناسبت ہے۔

عذرا عباس کی طویل نظم ''نیند کی مسافتیں'' اسی لمس کی آئینہ دار ہے۔ بڑی ملائمت، نرمی اور کوملتا سے چھوتی ہے۔مگر اس کی آہستگی اور چھلتا ہوا موہوم سا نقطۂ مماس بتدریج جھنجھوڑنے سے آغاز پذیر ہوتے ہوئے، بالآخر ہلا کر رکھ دیتا ہے۔اس لحاظ سے عذرا عباس کے اسلوب میں بیدی اور منٹو کا اجتماع ضدین ہو گیا ہے۔اجتماع ضدین جدلیاتی طرز احساس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔جدلیاتی فکر کے آثار سے ہمارا ادب تہی دامن نہیں کہ اس کا گیشٹالٹ نہیں تو کم از کم مونتاج ضرور دریافت کیا جا سکتا ہے لیکن گیشٹالٹ کے رتبے کا جدلیاتی طرز احساس عذرا عباس کی طویل نظم ''نیند کی مسافتیں'' میں پوری شدت سے وقوع پذیر ہی نہیں، متشکل بھی ہوا ہے۔اگر ہمیں ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے احتیاط برتنے کا مشورہ نہ دیا ہوتا تو ہم

اولیت وعظمت کی بظاہر غلو سے مملو، اصطلاحوں کو بروئے کار لاتے۔ تاہم محتاط ہونے کے باوصف، جدلیاتی طرز احساس کو جدید ذہن کی تازہ بہ تازہ نو بہ نو جہت قرار دینے میں ذرہ بھر مبالغہ محسوس نہیں کرتے۔ اس نظم کو لمس قلب ونظر کی ہیئت موجود کو لاموجود سے آشنا کر کے جہان ناپید کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ تخلیق کا یہ جوہر جدلیاتی طرز احساس سے نمو پذیر ہوا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جدلیاتی طرز احساس نے عذرا عباس کے فن میں جو اسٹرکچر پیدا کیا ہے، وہ کن نئے دریات ومقامات کی تسخیر تک قائم رہتا ہے؟ اگر عذرا عباس مزید پیش رفت نہ بھی کرے تو جدلیاتی طرز احساس کی تشکیل ایسا بڑا معرکہ تو سرانجام دیا جا چکا کہ جواب تک نہیں ہوا تھا، پھر اور کیا چاہیے؟ سوائے اس کے کہ خوب سے خوب تر کی جستجو وآرزو ہی ہے جو مطمئن نہیں ہونے دیتی ورنہ حریص نہ ہوں تو جدلیاتی طرز احساس کا کونسا پرتو ہے جو عذرا عباس کے فن میں جھلملاتا دکھائی نہیں دیتا؟ ایسی انقلاب آور نظم کا اسٹرکچر ایک ایسا نازک توازن رکھتا ہے کہ معمولی سا ردوبدل: دست غیر کا خفیف لمس: ہلکا سا نوک پلک سنوارنے کا عمل: یونہی سا ''چھونا'' اس کے باطن میں تلاطم پیدا کر کے شعری نامیاتی قوت کو تہس نہس کرتے ہوئے اصلی نظم کو شئے دیگر میں منقلب کر سکتا ہے۔ پھر بجا طور پر یہ کہنے کی گنجائش پیدا ہوتی ہے کہ ترمیم شدہ تخلیق اپنے حقیقی خالق کی نمائندہ نہیں رہی۔ اس نوع کے تغیر وتبدل کو کلیتاً مسترد کرنے کے لیے ایک فرق کی وضاحت ضروری ہے۔ ہر سچی ادبی تخلیق قاری کو ''چھوتی'' اور ''جھنجھوڑتی'' ہے۔ بعینہٖ ہر ژرف بین قاری ادبی تخلیق کی روح اور کلیت کو تبدیل کرتا ہے۔ یہ عمل وتعامل دو باطنوں کے تغیر لانے اور متغیر ہونے: مکمل ایڈہاک ابلاغ کا مظہر ہے۔ اس کارروائی کا اصلاحی حک واضافہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

نکہت حسن کی کہانی: دودھ کی مکھی: کچھ یوں ہے: خاتون مرد مار قسم کی عورت چار دن بھی دلہن بن کر چین سے گھر نہیں بیٹھیں۔ میاں نے دو ایک مرتبہ کچھ اونچ نیچ سمجھانے کے لیے زباں کھولی تو وہ پھاڑ کھانے کو دوڑیں۔ شروع شروع میں محمد میاں ان کے مزاج کو دلہنا پے کی ادائیں سمجھ کر ٹالتے رہے، پھر کچھ دن بعد ان کو خاتون کی مرد مار فطرت کا اندازہ ہوا اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ کسی وقت ان کی شرافت کو بیچ چوراہے پر ڈھیر کر دے گی۔ انہوں نے خاموشی سے علیحدگی اختیار کر لی اور بغیر طلاق دیئے ٹال پر اٹھ آئے۔ محمد میاں اکا دکا گاہکوں کو ترازو میں لکڑیاں تول کر بیچے اور بے شمار فالتو وقت میں ٹال پر بیٹھے پنجورہ پڑھتے رہتے۔ آہستہ آہستہ وہ صاحب کرامت ہو گئے۔ لوگ باگ تعویذوں کے لیے آنے لگے۔ اس دوران میں خاتون دھڑلے سے محلے میں نکلتی تھیں۔ بیسوں گھروں کے چھوٹے چھوٹے مشاغل میں شریک ہوتی تھیں۔ مسلمانیاں، عقیقے، کان چھیدنے ناک دھاگا بڑھانے وغیرہ کی تقریبات میں خاتون کے دن رات بڑے مصروف گزرتے تھے۔ کبھی کبھی تو ان کو اتنی مصروفیت رہتی تھی کہ کھانے کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ پھر یوں ہی کسی کے گھر بیٹھے بیٹھے ان کے پیٹ میں گولا سا گھومتا اور ان کو یاد آتا کہ آج کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ دوسروں کے کاموں میں انہیں اپنا ہوش ہی کہاں رہتا تھا۔ انسان اتنا بھی دیوانہ نہ ہو کہ تیرے میرے کاموں میں اپنا آپا ہی لٹا بیٹھے۔ انہوں نے طاق پر سے کنگھا اٹھایا، پھر دیر تک مانگ پٹی کر کے بال سنوارے، آنکھوں میں گہرا گہرا کاجل ڈالا، ہونٹوں پر سرخی لگائی، پھر پیازی رنگ کا جوڑا نکال کر میلاد میں جانے کے لیے تیار ہو کر گھر سے نکلیں۔ وقت کم رہ گیا تھا۔ وہ بڑے بڑے تیز تیز قدم اٹھا کر چل رہی تھیں کہ انہیں ایک ہلکا سا دھکا لگا۔ انہوں نے نقاب کی جالیوں میں سے اپنی آنکھوں کو چاروں طرف گھمایا اور اطمینان کرنے کے بعد پھر سے چل پڑیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد کمر پر چیونٹی سی کاٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انہوں نے ملنے کے لیے جو پیچھے ہاتھ کیا تو ایک مردانی کلائی ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے تو چہرے پر پڑی نقاب الٹی اور دوسرے ہاتھ سے مرد کو جھٹکے کے سامنے لا کھڑا کیا اور غرائیں: آخاہ، تو میاں یہ تمہاری طبیعت گدگدائی ہے۔ میں بھی تو کہوں کہ چھیڑ خانی میں زنانہ پن کیوں ہے؟ یہ مردوں والا جوش ہی نہیں۔ یہ تو اب پتہ چلا کہ چراغ میاں پوتڑا کھول، کر جوان ہو چکے ہیں۔ میاں محلے بھر میں مجھ بوڑھی لگائی کے علاوہ تمہیں اور کوئی چمبڑ نے کو نہیں ملا مجھے بھی کوئی رنڈی چھنال سمجھ رکھا ہے۔ میاں ایسی جوانی جوش مار رہی ہے تو میا بھنیا کو جا کر نوچ کھسوٹو۔ یہ کہہ کر انہوں نے لڑکے کو زور سے دھکا دیا، جو مسجد کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس واقعہ سے بندو کی بیوی کے دل میں شک پڑ گیا۔ اس نے جو الزام تراشیاں شروع کیں تو خاتوں کا برا حال ہو گیا۔ مختلف تقریبات میں شرکت ختم ہو گئی۔ یہی چھوٹی چھوٹی خوشیاں تو تھیں جو وہ اپنے ہاتھ پیر توڑ کر اور صبح سے شام تک ڈینگ ڈینگ پھر کر دوسروں کے گھر سے بٹورتی تھیں۔ ذرا سی ہاتھ پیر کی محنت کے صلے میں یہ کوئی ایسا برا سودا بھی نہیں تھا۔ یہ تو انہیں اب دو تین دن گھر میں بیٹھ کر پتہ چلا کہ وہ جو دن بھر میرے تیرے دھندوں کو نمٹاتی پھرتی تھیں اس میں تمام تر ان کی اپنی غرض شامل تھی۔ پر اب تو انہوں نے گھر سے باہر قدم رکھنے کی قسم کھالی تھی۔ انہوں نے کیا قسم کھائی تھی، محلے والیوں نے خود ہی انہیں دودھ کی مکھی کی طرح باہر نکال کیا تھا۔ اب ان کا دل ڈانواں ڈول ہی رہتا تھا۔ محلے میں بلند ہوتے ہوئے شور سے ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ وہ کانوں کا کیا کریں جو ہر آواز سننے کے لیے پھٹے پڑتے تھے۔ محلے میں کتا بھی بھونکتا تو انہیں محسوس ہوتا کہ کسی کا عقیقہ ہو رہا ہے یا ختنہ۔ یہ حالت ان کی کئی دن سے تھی۔ بس بیٹھے بیٹھے دل اچھلنے لگتا۔ پھر تھرتھری سی چڑھتی اور وہ کھڑے بیٹھے کانپنے سی لگتی تھیں۔ اور پھر جب ہاتھ پیر ذرا قابو میں آتے اور دل ذرا ٹھکانے سے بیٹھتا تو وہ اپنے گھر کے کونوں بچالوں میں بھٹکتی رہتیں۔ بظاہر تو بس یہی لگتا تھا کہ دل ہی سینے سے دور جا پڑا ہے۔ ورنہ تو اچھی خاصی تھیں، کھاتی بھی تھیں، سوتی بھی تھیں، سج بن کر شام کو جب وہ نواڑی پلنگ پر بیٹھیں تو پھر ان کا دل اچھل کر حلق میں آ کر اٹک جاتا۔۔۔ ''وہ جو اس طرح بن سنور کر بیٹھتی ہیں، تو کس کے لیے، اور اگر کوئی دیکھ لے''۔۔۔ اور پھر ان کے تن بدن سے چنگاریاں سے نکلنے لگتیں۔ آنکھوں میں وحشت سے بھر جاتی۔ ایسے میں

سفید دیوار پر کسی چیز کا سایہ کانپتا ہوا محسوس ہوتا اور ایسے لگتا جیسے تنہائی کا بھوت آسمان سے اتر کر ان کا گلا دبوچ کر کھڑا ہو گیا ہو۔۔۔

یہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات نکہت حسن کی کہانی کے حسن کا راز ہیں۔ بڑے مسائل ہیں نہ گمبھیر الجھنیں۔ انتہائی قریب کی پیش پا افتادہ باتیں ہیئت اجتماعی کی اور ہیئت انفرادی کی تشکیل کرتی ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ انفرادی رشتے، اجتماعی رشتوں کا نعم البدل ہیں، نہ اجتماعی تعلقات انفرادی پیوستگیوں سے علیحدہ ہیں۔ تمام منطقے آپس میں گندھے ہوئے ہیں۔ نظریاتی مسالک کی آویزش نے ادب میں ہیئت اجتماعی اور ہیئت انفرادی کو مطلق بنا کر ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ فی الحقیقت انکا رشتہ جدلیاتی ہے۔

خاتون کے تعلقات سب سے منقطع ہو چکے تھے۔ لے دے کے ایک محسنہ تھی جو خیر خیریت پوچھنے آ جایا کرتی تھی۔ اس کی فرصت بھی کم ہونے لگی تھی۔ اس کا خاوند محمد میاں کے تعویذوں کے سبب گھر آنے لگا تھا اور وہ امید سے بھی تھی۔ محسنہ کے گھر میں چھم چھم کرتی ایک کے بعد ایک خوشی چلی آ رہی تھی۔ آٹھ نو مہینے بعد بچہ بھی ہو جائے گا۔ اس نے یہ سب کچھ کھو کر ہی تو دوبارہ پایا ہے۔ پر پایا تو کیسے پایا؟

یوں معلوم ہوتا ہے یہ جملے نکہت حسن کے افسانے کے نہیں، کرکیگور کے رسالے ''خوف ولرزہ'' سے لیے گئے ہیں۔ کرکیگور کا جواب یہ ہے کہ صاحبان ایمان اپنا کھویا ہوا سب کچھ پا لیتے ہیں۔ متناہی قناعت و بیراگ کے مالکان جو کچھ قربان کرتے ہیں۔ خاتون یقیناً صاحب ایمان ہے کیونکہ بقول نکہت حسن: سفید دیوار پر ایک انسانی ہیولیٰ سا ابھرتا ہوا محسوس ہوا اور اس کے سامنے عقیدت مندوں کی ایک لمبی قطار: عورتیں، مرد اور بچے۔ خاتون کا دل چاہا کہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخیں۔ خوب یہ تو وہی مثل ہوئی: آپ میاں منگتے، گھر پر کھڑے درویش۔ میاں دوسروں کی حاجت روائی میں لگے ہوئے ہیں اور ادھر اپنے گھر میں خاک اڑ رہی ہے۔ ہے ہے! یہ کیسی کرامت ہے جس نے آنکھوں اور عقل دونوں پر پردہ ڈال دیا۔ ارے پہلے اپنے گھر کی خبر تو لی ہوتی بعد میں دوسروں کے دکھ درد دور کرتے۔ مجھ جنم جلی کا حال پوچھا ہوتا کہ نیک بخت تجھے بھی کچھ دعا تعویذ کی ضرورت ہے؟ میری کوئی ایک حاجت ہے؟ میرے دل میں تو سینکڑوں گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔ میں تو بس اتنا پوچھتی ہوں کہ یہ کونسا مذہب ہے یہ کونسی کرامت ہے کہ گھر والی کو تو انگاروں پر لوٹاؤ، میں تو مچھلی کی طرح تڑپوں نہ کھڑے چین اور نہ بیٹھے قرار۔ دل کو سنبھالوں تو ہاتھ پیر جواب دینے لگیں۔ ہاتھ پیر قابو میں آئیں تو دماغ دولتی جھاڑ کر کھڑا ہو جائے۔ نہ رات کی نیند رہی نہ دن کا آرام، اور میاں غیروں کو سکون دل کے تعویذ تقسیم کریں۔ اپنی کرامت سے بچھڑوں کو ملائیں۔ اولاد کی کثرت اور رزق کی کشادگی کے لیے دعائیں بتائیں۔ ان کی کرامت سے پورا محلّہ نہال ہو۔ انگاروں پر لوٹوں تو بس ایک میں۔ لعنت ہے میاں تم پر اور تمہاری کرامت پر۔ اسے کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا، یہیں سے کرکیگورانہ مراجعت ار بازیابی کا پہلو ابھرتا ہے۔ جدید دور کی بندشیں لاتعلقیاں اور بے ربطیاں ایک ہمہ گیر قنوطیت کو مسلط کرتی ہیں۔ امید کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ کرکیگور اس قنوطیت کل کی سہار پیدا کر کے اسے رجائیت میں بدل دیتا ہے۔ انقلاب کی راہ کیوں اختیار نہ ہو؟ کرکیگور کی خالص قنوطیت از خود خالص رجائیت میں منقلب ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کرکیگور ایک پرآشوب طمانیت کے خدو خال نکھار کر روح کو سکون سے لبریز کر دیتا ہے۔ ایمان کی روشنی ہو، نہ ہو تو جب ہو ''انسان سب کچھ کھونے کے باوصف'' پا لیتا ہے۔ کسی سلسلے کے حوالے سے نہیں۔ بس یونہی! گویا کھونا اور پانا ایک ہی عمل ہے۔ خالص کھونا: قنوطیت اور خالص پانا: رجائیت ایک حالت ذات ہے، کیفیت ہے، اواردات ہے۔ اولاً محمد میاں کھوتے ہیں، خاتون مصروفیتیں پاتی ہے۔ پھر خاتون کھوتی ہے تو دونوں پاتے ہیں: دوسروں کے وسیلے سے! خود نہیں دوسرے، دوسرے دوسرے نہیں خود ہی ہیں۔ یہ ذاتی غیر ذات ذات، امپرسنل پرسنل ذات، ایک مقام ہے، حالت ہے، کیفیت ہے کہ از خود جدلیاتی ہے۔ عذرا عباس کی نظم میں محمد میاں جمع خاتون کی ذات ذوات ایسے مقام سے مکالمے کی ایک لہر دوڑتی ہے۔

اگر سلیم احمد کو احمد ندیم قاسمی کی مانند فراق گورکھپوری کی پھپھوندی نہ لگی ہوئی ہوتی تو الہام و اہمال کے موضوع پر لکھتے ہوئے انہوں نے جس طرح انیس ناگی کے سر پر دست شفقت رکھا اور نظیر صدیقی کی چولیں کیں، ان سے فہمید ریاض کے مسئلے کو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کرنا چنداں دشوار نہ ہوتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ سلیم احمد کو صلے کی تمنا ہے نہ ستائش کی پرواہ۔ اس لیے بھی ہم سلیم احمد کے الہام و اہمال پر سلسلہ مضامین سے پہلے کے ایک مضمون: ''ادھوری جدیدیت'' کے ایک آدھ پیراگراف کا جائزہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایک محرک یہ بھی ہے کہ اپنے خوشگوار تعلقات عامہ اور پروٹوکول کو داؤں پر لگایا جائے اور جدلیات کی نوعیت سمجھ لی جائے۔ سلیم احمد لکھتے ہیں ''جدیدیت کی روح یہ اصول ہے کہ کسی بات کو اس بنا پر تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ ہم سے پہلے سے چلی آ رہی ہے، یا ہم پر خارج سے عائد کی گئی ہے، یا ہم سے بالاتر ہے بلکہ ہر چیز کا حسن و قبح، خیر و شر، منفعت و مضرت کا فیصلہ تجربہ کی روشنی میں کیا جائے۔ اس لیے جدیدیت کے معنی زیادہ سے زیادہ تجرباتی ہونے کے ہیں۔ لیکن تجربہ کس کا؟ ہمارا اپنا! اور اگر ہم کسی دوسرے کے تجربے کو قبول بھی کرتے ہیں تو اس شرط پر کہ ہم جب چاہیں اپنے تجربہ کی بنا پر اسے رد کر دیں۔ ظاہر ہے کہ ان معنوں میں جدیدیت مذہب کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ مذہب کی بنیاد عقیدہ، وحی، ایک مافوق الفطرت قوت کے اقرار اور اس کے احکام کے سامنے بے چوں و چرا سر جھکانے پر ہے۔ اسی طرح جدیدیت اخلاقی قیود کو بھی تسلیم نہیں کرتی کیونکہ اخلاق کا تعلق بھی بالعموم مذاہب ہی سے رہا ہے۔ اور جہاں براہ راست مذہب نہیں ہے، وہاں ایک بالاتر ہستی یا کم از کم خارجی دباؤ اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ مذہب اور اخلاق کی طرح جدیدیت معیارات کو بھی نہیں مانتی کیونکہ معیار کے معنی پھر کسی خارجی پیمانہ کو تسلیم کرنے کے

ہیں۔ جدیدیت ان سب چیزوں کا انکار کرتی ہے، اس بنا پر کہ یہ ذاتی تجربہ کی راہ کے پتھر ہیں۔ لیکن انکار کے معنی اثبات کا دروازہ بند کرنے کے نہیں ہیں۔ جدیدیت ان میں سے کسی کا بھی اثبات کر سکتی ہے، بشرطیکہ ذاتی تجربہ اس کی تصدیق کرے لیکن جو آدمی حسن و قبح اور خیر و شر کے معاملات میں ذاتی تجربہ کو بنیاد بناتا ہے وہ انفرادیت پسند ہوتا ہے۔ جدید ہونے کے معنی انفرادیت پسند ہونے کے ہیں۔ یہاں انفرادیت پسند ہونے کے معنی وہ نہیں ہیں جو عام طور پر لیے جاتے ہیں۔ انفرادیت پسند اسے نہیں کہتے جو صرف دوسروں سے مختلف ہونا چاہتا ہے بلکہ اسے جو ہر چیز کا پیمانہ اپنی ذات کو سمجھتا ہے۔ لیکن یہ ذات بھی کوئی مقررہ یا طے شدہ چیز نہیں۔ ہمارے محسوسات و جذبات بدلتے رہتے ہیں۔ پسند اور ناپسند میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، خیالات و افکار میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے انفرادیت پسندی کے معنی تغیر پسندی کے بھی ہیں۔ تو جدیدیت کے معنی زیادہ سے زیادہ تغیر پسند ہونے کے ہیں۔ نشاۃ الثانیہ کے بعد مغربی تہذیب کو ہم انہیں معنی میں جدید کہتے ہیں۔

ادھوری جدیدیت تجربہ کی فوقیت کے نام پر عقیدے، سند اور خارجی دباؤ کا انکار کرتی ہے لیکن پھر اپنے انکار کی اسیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے مقابلے پر پوری جدیدیت انکار کی منزل سے گزرنے کے بعد اثبات کی طرف بڑھتی ہے اور جن چیزوں کو اس نے ''تجربہ'' کا اصول منوانے کے لیے رد کیا تھا، انہیں تجربے ہی کی تصدیق سے مان لیتی ہے۔ یا کم از کم اس امکان کو تسلیم کرتی ہے کہ تجرباتی تصدیق کے بعد انہیں تسلیم کر لیا جائے گا۔ بدقسمتی سے مغرب میں اور اس کے اثر سے مشرق میں جو جدیدیت سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ادھوری ہے لیکن ان کی جگہ کوئی اپنا نظام اقدار نہیں دے سکتی۔ ہمیں ماننا چاہیے کہ انسان اگر اس کرۂ ارض پر زندہ رہنا چاہتا ہے تو اسے ایک نظام اقدار ضرور پیدا کرنا پڑے گا اور یہ ماننا کوئی جبر نہیں بلکہ انسانیت کا اپنا انفرادی اور اجتماعی تجربہ ہے۔ پرانا نظام اقدار اگر ہمارے مطلب کا نہیں ہے یا فرسودہ اور از کار رفتہ ہو گیا ہے تو ہمیں اسے بے شک رد کر دینا چاہیے۔ لیکن پوری جدیدیت کا تقاضہ اس وقت تک پورا نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی جگہ نیا نظام اقدار پیدا نہ کیا جائے۔ ادھوری جدیدیت رد کرنے کا کام تو اکثر سرانجام دیتی ہے مگر اپنی کوتاہ دستی کے باعث نئے نظام اقدار تک نہیں پہنچ سکتی۔''

سلیم احمد کے اس تجزیے کو نقل کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس کے وسیلے سے عذرا عباس کی طویل نظم کو عبوری طور پر ایک سیاق و سباق مہیا ہو جاتا ہے۔ نئے نظام اقدار کی ضرورت، اسے پیدا کرنے کی صلائے عام اور پرانے عقائد کو رد کرنے کی آزادی سلیم احمد کے علاوہ کونسا روایت پسند دینے پر آمادہ ہوگا؟ کیا اس طرح سلیم احمد نے روایت پسندی کی تخریب نہیں کی؟ کیا جدیدیت یہی نہیں؟ کم از کم جیلانی کامران جدیدیت کے جن خصائص کی نشاندہی کر کے ہنری کوربین کی درآمد سے تصوف کے کاروبار کو چمکانے کے لیے جن تجارتی تحفظات کا مطالبہ کرتے ہیں وہ سلیم احمد کی بیان کردہ ضرورتوں، تردیدوں اور آزادیوں کی مکمل بندش پر مبنی ہیں۔ سلیم احمد کی وسیع المشربی کو جیلانی کامران کی کٹھ ملائیت پر واضح فوقیت حاصل ہے پھر بھی، یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ جیلانی کامران کے گھر اور گھاٹ، دونوں سے، محروم ہونے کا سلیم احمد کی سیر بین روایت پسندی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ تاہم سلیم احمد نے جدیدیت کے جو تصورات وضع کیے ہیں، وہ نادرست ہیں۔ سلیم احمد مطلق اصطلاحوں میں سوچتے ہیں: خیر اور شر! حسن اور قبح! منفعت اور مضرت! انفرادیت اور اجتماعیت! آدھا اور پورا! ادھورا اور مکمل! حقیقت میں یہ تمام تصورات زندگی میں قطبیت نہیں رکھتے: انہیں ضدین کے طور پر دیکھنا درست نہیں کہ خیر میں شر اور شر میں خیر گندھی ہوئی ہے۔ کھرے میں کھوٹا اور سچ میں جھوٹ ملا ہوا ہے۔ ذات میں غیر ذات اور حسن میں قبح کی آمیزش ہے۔ ایک وقت میں جسے ہم خیر کہتے ہیں، اس میں ایک عنصر شر کا موجود ہوتا ہے، اس لیے سہولت کی خاطر ہم خیر کہہ لیتے ہیں حالانکہ خالص خیر سراسر تصوراتی ہے۔ گویا اصل فرق مطلق مابعد الطبیعیات اور جدلیاتی مابعد الطبیعیات کا ہے۔ جدلیاتی مابعد الطبیعیات میں یہ تصورات ایک کشاکش، تصادم اور عناد کو بمشکل یکجا و مجتمع کر پاتے ہیں: ناہموار، غیر مستقل، قطعاً عبوری، جدلیاتی مابعد الطبیعیات میں ہر تصور بیک وقت ''ہے'' اور ''نہیں ہے'' کی حالت استقرائے غیر مستحکم میں ہوتا ہے۔ جدلیات مابعد الطبیعیات کا جدلیاتی طرز احساس سے مخروج ہونا وہ جدیدیت ہے جس کا ادراک ابھی سلیم احمد کو نہیں ہوا۔

زندگی کی زندہ صورتحال میں مطلق اقدار اور مطلق تصورات کی کار فرمائی دکھائی نہیں دیتی۔ خیر و شر اور نیک و بد! آپس میں گندھے ہوئے، آویزش میں، ہونے اور نہ ہونے کے رنگ میں، قطعاً غیر مطلق! یہ ہے اصل، اجتماع ضدین، باقی گڑ بڑ گھوٹالا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کی کوئی افسانوی، یاداشتی اور تنقیدی تحریر مطلق تصورات بلکہ ذہنیت کے اندر رہ کر جانی ہی نہیں جا سکتی۔ ایک اقتباس دیکھئے:

''کلیانی نے اب کے رسم ادا نہیں کی، وہ سچ مچ ہنس دی۔ نہیں، وہ شرما گئی۔ ہاں، وہ دھندہ کرتی تھی اور شرماتی بھی تھی۔ کون کہتا ہے وہاں عورت، عورت نہیں رہتی؟ وہاں بھی حیا اس کا زیور ہوتا ہے اور حربہ جس سے وہ مرتی ہے اور مارتی بھی ہے مہی پت نے تیس روپے نکال کر کلیانی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ کلیانی نے انہیں ٹھیک سے گنا بھی نہیں۔ اس نے تو بس پیسوں کو چوما، سر اور آنکھوں پر لگایا، بھگوان کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑے اور میڈم کو ایک ٹائم کے پیسے دیئے اور اپنے حصے کے پانچ لے کر رکھے۔ اندر کے دروازے کی طرف سے اور بھی اندر چلی گئی۔ مہی پت کو جلدی تھی۔ وہ بے صبری سے درگا مایا کی تصویر کو دیکھ رہا تھا جو شیر پہ بیٹھی تھی اور جس کے پاؤں میں راکھشس مرا پڑا تھا۔ درگا کی درجنوں بھجائیں تھیں جن میں سے کسی میں تلوار تھی اور کسی میں برچھی اور کسی میں ڈھال ایک ہاتھ میں کٹا ہوا سر تھا، بالوں میں تھاما ہوا۔ اور مہی پت کو معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس کا اپنا

سر ہے۔لیکن درگا کی چھاتیاں اس کے کولہے اور رانیں بنانے میں مصور نے بڑے جبر سے کام لیا تھا۔دیواریں ٹوٹی ہوئی تھیں۔وہ کوئی بات نہ تھی لیکن ان پر لپکتی ہوئی سیل اور اس میں گڈمڈ کائی نے عجیب بھیانک سی شکل بنادی تھیں، جن سے طبیعت بیٹھ بیٹھ جاتی تھی۔معلوم ہوتا تھا کہ وہ دو دیواریں نہیں تیتی اسکرول ہیں، جن پر نرگ اور سورگ کے نقشے بنے ہیں۔گنہگاروں کو اژدھے ڈس رہے ہیں اور شعلوں کی لپلپاتی زبانیں انہیں چاٹ رہی ہیں۔ پورا سنسار، کال کے بڑے بڑے دانتوں اور اس کے کھوہ ایسے منہ میں پڑا ہے۔۔۔وہ ضرور نرگ میں جائے گا۔۔۔مہی پت۔ جانے دو۔کلیانی لوٹی اور لوٹتے ہی اس نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کردیئے۔''بیسوا کلیانی کا شرمانا اور ہنسانا، ہنسانا اور لوٹنا، لوٹنا اور لٹ جانا: کچھ ایسی ترکیب اور ترتیب پانیوالی کلیانی راجندر سنگھ بیدی کی کہانی کے رگ وریشہ میں جاری وساری ہے۔وہ کونکنی ہے، کالی بھجنگ ہے، نہیں اس کے نقش تیکھے اور خوبصورت ہیں۔وہ دھندہ کرتی ہے، نہیں، وہ شرماتی ہے: شرمانے کا دھندے کی بے حیائی سے کیا تعلق؟ وہ پیسے لے کر کیسی عقیدت بھری حرکتیں کرتی ہے: انہیں چومنا، سر آنکھوں پر لگانا اور پھر بھگوان کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑنا۔ یہ پاکیزگی کا اظہار جسم فروشی کی دنیا سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔وہ تو کہیں اپنے اندر، من میں، جسم سے دور طہارت کی اس دنیا میں چلی جاتی ہے۔جس کا بیسوا کی ٹھوس دنیا سے کوئی علاقہ ہی نہیں۔ یہ اس کی نفی ہے۔یہ نفی قائم کر کے راجندر سنگھ بیدی نے ایک اور نفی کا برس لگایا ہے: اندر کے دروازے کی طرف سے اور بھی اندر چلی گئی! دو نفیوں کو یکجا کر کے راجندر سنگھ بیدی نے اندر کے دروازے سے اور اندر جانے کے معنی منقلب کر دیئے ہیں: کلیانی اندر کے دروازے میں داخل ہو کر باہر آجاتی ہے، طہارت کی دنیا سے! بیسوا کی دنیا میں لوٹنے کے لیے وہ اپنے باطن کی پاکیزگی سے منقطع ہوتی ہے، گناہ کی دنیا میں آتی ہے۔بیسوا اور گناہ، یعنی چہ؟ اور سوچتی ہے کہ مہی پت ضرور نرگ میں جائے گا۔کلیانی آج کا جہنم، مہی پت کے کل کا جہنم ایک لمحے کے لیے ایک ہوتا ہے۔وہ کہتی ہے: جانے دو! مہی پت کو، جس سے وہ پیار بھی کرتی ہے، کلیانی سوچتی تو ہے لیکن ابھی تک اندر کے دروازے سے باہر نہیں لوٹی۔باہر، مہی پت، اس کی واپسی کا بے صبری سے انتظار کر رہا ہے۔درگا میا کی تصویر کو دیکھتے ہوئے مہی پت کا جی بیٹھ بیٹھ جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیواریں نہیں، تیتی اسکرول ہیں جن پر نرگ سورگ کے نقشے بنے ہوئے ہیں۔اس مرحلے پر مہی پت کے شعور میں جہنم کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔یہی وہ لمحہ ہے جب اندر کے دروازے سے اندر جانے والی کلیانی پاکیزگی کی داخلیت سے باہر نکل کر حقیقت کے جہنم میں وارد ہوتی ہے۔ دو شعور، دو جہنمیں: یہ راجندر سنگھ بیدی کے جدلیاتی اسلوب کا کرشمہ ہے کہ کلیانی کی ہر کیفیت بیک وقت ہے اور نہیں ہے۔مہی پت جہنم کے نقشوں میں شعلوں کی لپلپاتی چاٹتی زبانوں کے تلازمات سے داخل ہی داخل میں کنیلنگس تک جا پہنچتا ہے: کلیانی کے پورے بدن میں ہی مہی پت اور اس کی زبان کی کارن ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔۔۔اس نے ہانپتی ہوئی کلیانی کی طرف دیکھا۔اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ایک پیشہ ور عورت کی چھاتیوں کا وزن بھی ایکا ایکی بڑھ سکتا ہے اور ان پر حلقے اور دانے پھیل کر اپنے مرکز، ابھرے ہوئے مرکز کو بھی معدوم کر سکتے ہیں۔ان کے اردگرد اور کولہوں اور رانوں پر ستیلا کے دانے ابھر سکتے ہیں۔ان تفصیلات سے راجندر سنگھ بیدی نے قاری کو یقین دلایا ہے کہ یہ سب کچھ ہوا۔ پیشہ ور کلیانی کے ساتھ ہوا: بیسوا کی حقیقت کے ساتھ ساتھ اس کی تکذیب، ایک دلدوزسی چیخ نکلی۔ کلیانی رو رہی تھی۔راجندر سنگھ بیدی نے خود ہی کہہ مکرنی سے کام لیا ہے: کلیانی ایک عام کسبی کی طرح سے گاہک کو لات مارنا نہ جانتی تھی اور یا پھر وہ اتنے اچھے گاہک کو کھو دینے پر تیار نہ تھی۔مہی پت نے کلیانی کا چہرہ ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی۔ کلیانی نے اپنا چہرہ چھڑا لیا۔مہی پت پہلے صرف شرمندہ تھا، پھر سچ مچ شرمندہ تھا۔ اس نے کلیانی سے معافی مانگی، پھر مانگی اور مانگتا ہی چلا گیا۔مہی پت کے کردار کا یہ پہلو اسے ان کرداروں کی صف میں لے جاتا ہے جنکی ساؤل بیلو نے نہایت عمدہ شبیہیں بنائی ہیں۔یوں مہی پت محض ایک تماش بین نہیں ہے، اپنے خود سے الجھنے والی ذات ہے جو معافی مانگنا، مانگنا، مانگتا ہی چلا جاتا ہے۔کلیانی اسے اس حالت میں دیکھ نہیں سکتی: وہ اٹھ کر دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر اپنے گھنگھریالے بالوں والا کونکنی سر رکھ دیا۔پھر اس کی گھگھی بندھ گئی کیا یہاں کلیانی میں خود سے الجھنے والی ذات کی جھلک دکھائی نہیں دیتی؟ خود سے الجھنے والی ذاتوں کی یگانگت ہی لذت کے مشترکہ منطقے کی دریافت کا سبب بنتی ہے: کلیانی کی گھگھی بندھ گئی جس سے نکالنے میں مہی پت کو اور بھی تلذذ کا احساس ہوا۔اور کلیانی کو بھی! راجندر سنگھ بیدی نے کہانی کے اندر اس نئی دریافت سے بات آگے بڑھائی ہے: ''کلیانی نے اپنے گھاتگ ہی کی پناہ ڈھونڈ لی۔مرد تو مرد ہوگا ہی، باپ بھی تو ہے، بھائی بھی تو ہے۔۔۔عورت عورت ہی سہی مگر وہ بیٹی بھی تو ہے، بہن بھی تو ہے۔اور ماں۔۔۔مہی پت کی آنکھوں میں سچ مچ کے پچھتاوے کو دیکھتے ہی تصویر الٹ گئی۔اب اس کا سر کلیانی کی چھاتی پر تھا اور وہ اسے پیار کر رہی تھی۔'' یہ تحصیل حاصل ہے کہ راجندر سنگھ بیدی کا شعور اور اسلوب ہر سطح پر جدلیاتی کلیہ ''ہے، نہیں ہے'' کی قدرت کی کرشمہ کاریاں دکھاتا ہے۔خیر وشر اور نیک وبد وغیرہ ہرگز مطلق تصورات نہیں ہیں۔انسانوں میں یہ اپنی مطلق حیثیت میں نہیں پائے جاتے۔اگر اقدار اور تصورات مطلق طور پر عمل پذیر ہوتے تو راجندر سنگھ بیدی کا فن وجود میں نہ آتا۔زندگی اور فن میں جدلیاتی کلیہ ''ہے، نہیں ہے'' اپنی جولانیاں دکھاتا ہے۔تو راجندر سنگھ بیدی کے فن کی معنویت اسی قطبیت کے اجتماع، نہیں، اجتماعوں میں ہے کہ افراد از خود اجتماع ہیں: کوئی واحد کلیانی نہیں، کوئی مفرد مہی پت نہیں۔راجندر سنگھ بیدی نے کلیانی اجتماع اور مہی پت اجتماع میں ایک ایک جھلک خود منفعل ذوات کی دکھا کر جدلیاتی مابعد الطبیعیات کے جدلیاتی طرز احساس میں امتزاج سے جدیدیت کو متشکل کیا ہے۔

یہ جدیدیت کا رنگ، یہ کلیانی اجتماع، یہ مہی پت اجتماع: ان اجتماعوں

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ کیجیے

عذرا کی شاعری میں تانیثی حیثیت

ڈاکٹر تنویر انجم
(کراچی)

عذرا عباس نثری نظم کے حوالے سے ایک اہم نام ہے یہ بات اردو ادب کے قارئین بخوبی جانتے ہیں اور اس بات سے بھی سب واقف ہیں کہ انہوں نے صرف نظم ہی نہیں بلکہ نثر میں بھی قلم کے جوہر دکھائے ہیں وہ اپنی یادداشتوں پر مشتمل دو کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ''میرا بچپن'' اور ''درد کا محل وقوع'' اور اس کے علاوہ ایک ناول ''میں اور موسیٰ'' اور ایک افسانوں کا مجموعہ ''راستے مجھے بلاتے ہیں'' ان کے تخلیقی کارناموں میں شامل ہیں۔

۲۰۲۰ء کے اواخر میں انکی کتابیں کراچی سے شائع ہونے والی ان کی شعری کلیات ''اداسی کے گھاؤ'' ان کے شعری سفر کا خوب احاطہ کرتی ہے۔ اس میں ان کے ۱۹۸۱ء سے ۲۰۱۸ء تک شائع ہونے والے چھ شعری مجموعوں کے علاوہ ۱۲۸ غیر مطبوعہ نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان کی شاعری کی پہلی کتاب ان کی طویل نظم ''نیند کی مسافتیں'' تھی جو ۷۰ء کی دہائی میں لکھی گئی اور ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی اور ان کی دوسری کتاب ''میز پر رکھے ہاتھ'' جو نثری نظموں پر مشتمل ہے ۱۹۸۸ء میں چھپی۔ اس مضمون میں مَیں ان کی کتاب ''میز پر رکھے ہاتھ'' کا جائزہ لوں گی اور ان کے موضوعات اور فنی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ شخصیت پر گفتگو کروں گی۔

عذرا عباس جس زمانے کی شاعرہ ہیں ایک گہرا تانیثی شعور اس کی روح کا حصہ ہے اور جب ہم ان کی شاعری پڑھتے ہیں اس شعور کی زیریں رَو کو لفظوں کے پردے میں متحرک دیکھتے ہیں۔ لیکن عذرا عباس کو یہ بات پسند نہیں کہ انہیں تانیثی شعور کا حامل یا فیمنسٹ کہا جائے۔ غالباً یہ لیبل ان کے خیال میں ان کی شاعری کو ایک مخصوص خانے میں بند کر دیتا ہے ان کے موضوعات کی فراخ دنیا کو ایک تنگ چولا پہنا دیتا ہے اسی لیے وہ قدرے ناراضگی کے ساتھ اکثر یہ اعلان کرتی ہیں کہ وہ فیمنسٹ نہیں۔ ان کا تصور تانیثیت کیا ہے انہوں نے کبھی اسے الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا مگر میرے خیال میں ان کا ہر مجموعہ تقریباً ہر نظم ہی جن موضوعات کا اظہار کرتی ہے وہ سب ایک تانیثی شعور سے متصف ہیں۔

مجموعے ''میز پر رکھے ہاتھ'' میں پہلی نظم ''بھجن'' ہے جو ایک عورت کی زندگی کی دو حصوں میں تقسیم کا المیہ بیان کرتی ہے۔ ایک حصے میں جسم محبوب کے ہمراہ سرشاری کا تجربہ کرتا ہے اور دوسرے میں وہ اپنے پاؤں ایک مقام پر گڑے جانے کا عذاب برداشت کر رہی ہے۔ ایک زندگی میں وہ لمس کی لذتوں سے گزرتی ہے اور دوسرے میں اس لمس کو فراموش کر دیتی ہیں۔ اس کی سالہا سال کی محنت سے تیار کردہ کشتی موجوں کے بے رحم تھپیڑوں میں الجھ جاتی ہے۔ عذرا عباس پانیوں کا رخ موڑ کر اس دن کو لوٹ جانا چاہتی ہے جہاں اس نے محبوب سے پہلی بار معاہدہ کیا تھا۔ یہ نظم عورت کے احساسِ بے چارگی، محبت کے ادھورے پن اور ایک پدرسری معاشرے میں جنسی ناآسودگی کا ماتم کرتی نظر آتی ہے۔ نظم ''پہ دماغ'' پدرسری نظام میں ایک عورت کے مختلف کرداروں میں بٹی ہوئی زندگی کے اثرات بیان کرتی ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان محنت کی تقسیم پدرسری معاشرے میں عورت پر جو دباؤ ڈالتی ہے اس کے نتائج اس کے دماغ کی کارکردگی کے لیے ضرر رساں ثابت ہوتے ہیں اور اگر گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ایک عورت کو معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑے تو اس پر مرد کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ کام پڑ جاتا ہے اور جسم کے ساتھ ساتھ دماغ بھی مستقل تھکن سے میلے مَلگجے کپڑوں کی گٹھڑی بنا کونے میں بُکل مارے پڑا رہتا ہے۔

نظم ''آج چھٹی کا دن تھا'' میں عذرا عباس زندگی کے ساتھ ساتھ جسم کی اکائی کے بھی ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔ کہتی ہیں:

ایک بازو خالی ہے/ ایک بوجھ سے جھول رہا ہے/ ایک پاؤں سو گیا/ ایک سفر پر آمادہ ہے/ آدھا جسم اونگھ رہا ہے/ آدھا رت جگا کرتا ہے۔

عذرا عباس کو جہاں اپنا جسم اپنے قابو سے باہر نظر آتا ہے اسی طرح اسے اپنے اعمال غیر اختیاری لگتے ہیں۔

آدھی زندگی گزار دی/ آدھی سوٹ کیس میں رکھ دی/ دروازے کھلے چھوڑ دیئے/ روشن دان سے چھن چھن کر آنے والی/ روشنی پر پردہ ڈال دیا

زندگی کی تقسیم، جسم اور اعمال کی غیر شعوری بے اختیاری عورت کی پدرسری معاشرے میں بے بسی کے اظہار ہیں۔ یہ خیال عذرا عباس کی متعدد نظموں میں نظر آتا ہے۔ ''میز پر رکھے ہاتھ'' نامی نظم بھی اسی خیال کا اعادہ کرتی ہے۔

میز پر رکھے ہاتھ/ ہاتھوں کو میز پر سے اٹھاتی ہوں/ پھر بھی پڑے رہتے ہیں/ میز پر/ اور ہنستے ہیں

ہر انسان یا کم از کم ہر باشعور تعلیم یافتہ انسان شروع سے اپنی زندگی کا ایک خواب یا Vision رکھتا ہے اور اس کے مطابق زندگی کو ایک اکائی کی شکل دینا چاہتا ہے۔ تعلیم یافتہ اور خلاّق عورت بھی یہی چاہتی ہے مگر پدرسری معاشرے کے غیر انسانی تقاضے اس کی زندگی کی توڑ پھوڑ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ہر لمحے اپنے جسم کے احساسِ زیاں سے گزرتی ہے اور مسلسل جدوجہد ایک بیزار کن لایعنیت کو جنم دیتی ہے۔ عذرا عباس کی نظموں میں یہ بیزار کن لایعنیت بڑی شدت سے موجود ہے۔

میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں/ سو جاتی ہوں/ میز پر رکھے ہاتھوں پر/ سر رکھ کر

نظم ''اس زندگی کے بدلے'' زندگی اور وجود کی بے معنی حقیقت کے

مقابل ان اشیا کو تصور میں لاتی ہے جو انتہائی معمولی ہیں۔ عذرا عباس اعلان کرتی ہیں کہ اگر انہیں ان اشیاء میں سے کچھ بنا دیا جاتا تو بہتر ہوتا جیسے کہ بادلوں سے گرتی بوند، سوکھی گھاس کا ایک تنکا، جمی ہوئی کائی، پرندے کی چونچ سے گرتا ہوا دانہ یا سیلن زدہ دھبا یا ایک مرد سے خالی کیا گیا تابوت۔ انہیں ان اشیاء کا وجود اپنے وجود سے برتر نظر آتا ہے۔ اپنی زندگی سے بیزاریت کی یہ انتہا عذرا عباس کی گہری اداسی کا ایسا گھاؤ ہے جس کا اندمال ممکن نہیں۔

نظم ''ایک روٹی تک پہنچنے کے لیے'' وجود کی اس تقسیم کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ہمیں روٹی کی مجبوری کے لیے کرنا پڑتی ہے۔ خواب، رنگ، خوشبو اور آنکھوں کی روشنی ہمارے وجود کی وہ خوبصورتیاں ہیں جن سے ہمیں روٹی کے لیے جدا ہونا پڑتا ہے۔ زندگی کی چکی میں خود کو پیسنا ذلت کی وہ انتہا ہے جو ہمیں ایک روٹی تک پہنچنے کے لیے برداشت کرنا پڑتی ہے۔

نظم ''یہ صدی'' زندگی کے وقت کو منقسم حالت میں دیکھ رہی ہے۔ گزرتی ہوئی جوانی اور موجودہ وقت، وقت گزرنے کا تاسف، اپنی ذات کی نفی کرنے والوں کے منہ پر تھوک دینے کی خواہش پھوہڑپن کا احساس سب موجود ہیں مگر اس کے ساتھ خوابوں کے سمندر کا شور کا نہیں ہے مگر وقت کے ساتھ بے ڈول ہو گیا ہے اور موجود ہے انتہائی لذت کی خواہش جو ناممکن الحصول ہے۔

''جب سارا دن گزر جاتا ہے'' وہ نظم ہے جو وجود کی تقسیم کی ایک اور جہت پیش کرتی ہے۔ ایک وجود دن گزارتا ہے اور دوسرا وجود چادر کی شکنیں دور کرتے ہوئے دن گزارنے والے وجود کا احتساب کرتا ہے۔ اس تقسیم کا سبب ہے ضروری کاموں سے نمٹتی ہوئی کاہلی، فضول باتیں، بے یقینی، دماغ میں چلتی ہوئی خواب اور حقیقت کی ریل، آوازیں، یادیں، بے بسی، نامکمل کام، بے حسی اور پھر غفلت کی نیند۔ یہ نظم بھی عذرا کی بہت سی دوسری نظموں کی طرح عورت کی زندگی اور اس کے وجود پر چھائی مختلف نئی کیفیات کی عکاسی بہت خوبی سے کرتی ہے۔

چپ اور شور کا تضاد یا وجود کی تقسیم خاموشی اور آواز میں۔ یہ خیال عذرا کی نظم ''ایک چپ لگی ہے'' میں سامنے آتا ہے۔

ایک چپ لگی ہے/ یہ چپ/ جو تمہارے ہونٹوں سے/ میرے
ناخنوں تک اتر گئی ہے

شاعرہ کے انگ انگ کا شور ماضی کا حصہ بن گیا ہے اور موجودہ چپ کا سناٹا اسے آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر چلنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ نہ صرف خود چپ کا شکار ہے بلکہ باہر کے شور کو ان سنا کر دیتی ہے۔ یعنی ایک بہرا پن اس کے گونگے پن کو مکمل کر دیتا ہے۔ یہ عورت جس نے ابلاغ کو بے معنی جان کر تج دیا ہے اپنے مرد سے کہتی ہے چپ ہو جاؤ اور وہ تاسف کے ساتھ جسم کا احاطہ کرتے ہوئے چپ سادھ لیتا ہے۔ یہ تاسف لمس کے بے معنی ہونے کا ہے یا بامعنی گفتگو کی غیر موجودگی کا کچھ پتہ نہیں چلتا مگر ایک ایسی عورت کی تصویر سامنے آتی ہے جس کے لیے تمام آوازیں بشمول اس کی اپنی آواز کے کراہیت انگیز ہیں الفاظ اپنے معنی کھو چکے ہیں۔ زبان بے معنی شور میں بدل کر رابطے کی صلاحیت کھو چکی ہے۔

''میری آنکھیں'' وہ نظم ہے جو تجرباتی ادب تصور اتنی حقیقت کی دوئی کو بیان کرتی ہے۔ ہوا میں اڑنے اور پانیوں پر دوڑنے کی خواہش رکھنے والی لڑکی جب برتنوں کی جھنکار بھوک کی آواز اور مفلسی کی پسماندھ میں کھو جاتی ہے تو اس کی خواب دیکھتی آنکھیں اس کی مدد کو آتی ہے اور سے آبشاروں اور جھرنوں کے کنارے محبت کے خواب دکھا کر اس کی روح کو زندہ رکھتی ہے اور اس کی تصوراتی دنیا اس کی تجرباتی حقیقت کو زیر کر لیتی ہے۔

عذرا کی نظم ''سفر جاری رہنا چاہیے'' پدرسری نظام کے اس تصور کو چیلنج کرتی ہے کہ سفر، آوارگی، بھیڑ سے ٹکراتے ہوئے گزرنا، دن ہو یا رات، شام کے چھٹپٹے میں گاڑیوں کے ساتھ دوڑنا، آوازوں سے ٹکرانا یہ تمام مردوں سے مخصوص دلچسپیاں ہیں۔ عورت کو ذاتی منطقے تک محدود کرنا وار اس کے لیے اجتماعی منطقے (Public Space) کو ناقابلِ رسائی قرار دینا پدرسری نظام کا ایک اہم نظریہ ہے۔ آج ہم عورت مارچ میں پلے کارڈز پر لکھا دیکھتے ہیں ''سڑکیں ہماری ہیں'' مگر اُن پلے کارڈز کو اٹھائے لڑکیاں اور لڑکے یہ نہیں جانتے کہ عذرا عباس نے عورت کی اس جدوجہد کو نہایت غیر رسمی اور نعرہ بازی سے مبرہ انداز میں آج سے چالیس سال پہلے کہہ دیا تھا ''بڑا مزہ آتا ہے/ نکل پڑو گھر سے/ بس ایک سڑک ہو/ ایک سفر ہو/ اور تھیلے میں گرم گرم روٹی'' اس نظم میں ہم عذرا عباس کو اپنی انسانی حیثیت پر شدید اصرار دیکھتے ہیں اور اس طرح کہ وہ تمام اوقات اور تمام کائنات کو اپناتی ہوئی اور اپنی ملکیت جتاتی ہوئی نظر آتی ہیں اور یہ سفر جو ایک روٹی کے ساتھ کیا جا رہا ہے سرمایہ داری کے تقاضوں سے بھی انکار کرتا نظر آتا ہے۔ یہ دعویٰ سماجی تقاضوں سے مزاحم ہونے کے باوجود ایک فطری پہلو لیے ہوئے ہے جبکہ عذرا عباس جب ایک عورت کی حیثیت سے سفر نژادی کا لطف اٹھاتی ہے تو اس میں بغاوت کا ایک اضافی پہلو شامل ہو جاتا ہے۔

تانیثیت کا ایک اہم موضوع پدرسری نظام میں عورت کو جنسی طور پر محکوم بنانا ہے۔ عذرا عباس کی کئی نظمیں اس موضوع کو برتتی ہیں اور اسے دوسروں کی کہانیاں نہیں ذاتی واردات کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ ان کی نظم ''زمین اور پاؤں'' شروع ہوتی ہے۔ ''جب گزر جائے ایک خواب/ اور رہ جائے صرف تلچھٹ/ پیٹ بھرتا ہے'' غربت کے تشدد سہتی زندگی میں خوابوں کی کوئی جگہ نہیں، جسم درختوں پر نہ اُگ پانے والی روٹی کی تلاش میں خالی ہو جاتے ہیں اور ''رہ جاتی ہے اک سانس/ جو ملاتی ہے پاؤں کو زمیں سے'' جب دن اتنا سخت تو رات بے مزہ اور کسیلی ہو جاتی ہے اور صرف زمین اور پاؤں کا رشتہ باقی رہتا ہے۔ سانس ہے اور زندگی چل رہی ہے مگر اس میں کوئی مزہ نہیں۔

نظم ''اے جاتے ہو کہاں'' اسی بے مزہ جنسی عمل کو مزید تفصیل اور

جزئیات سے بیان کرتی ہے ایک عورت کا تجربہ کہ ''جس کا دل خالی ہے'' اور ''جسم کا ہر حصہ/لمس کی تراوٹ پر آمادہ نہیں ہوتا/اور جسم کٹے ہوئے/اور علیحدہ رکھے ہوئے/گوشت کی طرح چپکا پڑا رہتا ہے۔۔۔محبوب کی کلبلاتی انگلیاں ایسی ہیں جیسے کوئی کیڑا گھس آیا ہو کپڑوں میں'' اس جنسی عمل میں کراہیت کا احساس دونوں طرف ہے اور عاشق اپنی انگلیاں ہٹالیتا ہے۔

نظم ''تتلی'' میں عذرا عباس ایک آفاقی موضوع وقت کو نہایت خوبصورتی سے نظم میں ڈھالتی ہیں۔وقت ایک تتلی بن گیا اور شاعرہ ایک ننھی بچی اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی اس کو پکڑنے کی کوشش میں وہ ناچتی ہے۔اس کے بال بکھر جاتے ہیں اور جوتے مٹی سے بھر جاتے ہیں مگر یہ تتلی اس کے ہاتھ نہیں آتی آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے اور بچی کی ہتھیلی اس کے نرم و نازک پروں سے خالی رہ جاتی ہے۔

نظم ''ہنس کر ٹال دو'' کا عنوان ہی واضح کر دیتا ہے کہ یہ نظم کس بارے میں ہے۔عورت سے ہمارا معاشرہ ہر وقت ہی تقاضہ کرتا رہتا ہے کہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم و جبر، تذلیل کو، ہر اسانی کو اور ہر جسمانی تکلیف کو ہنس کر ٹال دو۔عذرا لکھتی ہیں ''یہ سب تو کھیل ہے/کھیل ختم ہونے تک/ہنس کر ٹال دو/یہ سب کچھ۔'' پدرسری معاشرے میں پھیلے ہوئے رویوں اور ان کے عورت کی دل دماغ پر اثرات نفسیاتی اُلجھنیں، سماجی تذلیل، انسانیت سے گرا ہوا مقام ان سب کو محسوس کرنا، انہیں اپنا موضوع بنانا اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان کا اظہار کرنا ایک مزاحمتی اور بغاوت پر آمادہ رویہ ہے جو عذرا عباس نے ایک تانیثیت پسند عورت کے طور پر اختیار کیا ہوا ہے۔

نظم ''میرا سایہ'' نہایت فنکاری کے ساتھ عورت کی معاشرے میں عدم موجودگی کے احساس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔یہ ایک نفسیاتی بیگانگی کا تجربہ ہے جس میں عورت خود کو ایک سایہ بنتے ہوئے دیکھتی ہے۔وہ محسوس کرتی ہے کہ سورج اس کا سایہ نہیں بناتا۔اس کے نام سے اسے کوئی نہیں پکارتا، نہ اس کی کھانے کی پلیٹ ہے نہ محرموں کی فہرست میں اس کا نام نہ کوئی دعوت نامہ، نہ اس کی چاپ سنائی دیتی ہے مگر ''کوئی مجھے کہیں دیکھ لیتا ہے/تو میرے سینے میں/چھرا گھونپ دیتا ہے'' یہ ناموجود عورت موت کے لیے موجود ہو جاتی ہے تاکہ پھر اسے مکمل طور پر ناموجود کیا جا سکے۔

عدم موجودگی کا یہ تشدد ہمیں نظم ''یہ بندھن'' میں بھی نظر آتا ہے۔ لکھتی ہیں ''یہ بندھن/جکڑ لیتے ہیں/پور پور کو باندھ کے/ٹانگ دیتے ہیں/ہمارا جسم ہوا میں/۔۔۔'' سماجی رشتوں میں شامل یہ تشدد عورت کو تنہا، بے بس اور لایعنی بنا دیتا ہے۔

نظم ''اعتراف'' پدرسری معاشرے میں مرد کی دعوتی محبت کی تردید کرتی ہے۔الفاظ میں معنی نہیں ہیں جو محبت کرنے والی عورت سمجھتی ہے کیونکہ اسے اس لفظ کے معنی معلوم ہیں محض جنسی عمل کے دوران محبت کا دعویٰ کرنا کھوکھلا رہتا ہے اور وہ عورت جو اپنی بامعنی محبت کا اعتراف کرنا چاہتی ہے اس سے محروم رہ جاتی ہے کیونکہ جنسی عمل کے بعد مرد اسے اس کا موقع نہیں دیتا۔

جنسی عمل میں مرد کا تشدد آمیز احساسِ برتری اور غلبہ وہ موضوع ہے جو بار بار عذرا عباس کی نظموں میں در آتا ہے۔''حرامزادی'' نامی نظم ایسے ہی ایک تجربے کو تفصیلاً بیان کرتی ہے۔وہ لکھتی ہیں ''آنے والے کل نے/میرے گزرنے والے سارے دن/نگل لیے ہیں/میری آنکھیں/اس کے خنجر چمکانے سے پہلے/کل کے وعدے پر سو جاتی ہیں/حرامزادی/وہ خنجر گلے پر رکھ دیتا ہے/اور میں ٹھن ٹھن بجنے لگتی ہوں/۔۔۔اپنی ٹانگیں پھیلا دیتی ہوں/اور آنے والے دن کے وعدے پر میری آنکھیں/ڈوبنے لگتی ہیں۔

نظم ''ہاتھ کھول دیے جائیں'' کا عنوان ہی واضح اشارہ کرتا ہے کہ شاعرہ خود کو مقید محسوس کرتی ہے۔یوں تو ہر انسان ہی وجودی طور پر اور سماجی طور پر بھی ایک قید کے ساتھ جنم لیتا ہے مگر عورت کی قید دہری ہے۔وہ نہ صرف تنہائی اور سماجی مجبوریوں کی قیدی ہے بلکہ حقیقتاً ایک جسمانی قید سے بھی گزرتی ہے۔عذرا دعویٰ کرتی ہیں کہ اگر ان کے ہاتھ کھول دیے جائیں تو وہ ''دنیا کی دیواروں کو/اپنے خوابوں کی لکیروں سے سیاہ کر دیں'' وہ اس قید کی سختی اور شدت کو واضح طور پر بیان کرتے ہوئے کہ ''میں قہر کی بارش برساؤں/اور اس دنیا کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر/مسل دوں'' مگر وہ طاقت جو عورت کو قید کرتی ہے ایک نظام ہے ایک غیر مرئی وجود اسی لیے آخر میں وہ پوچھتی ہیں ''میری زنجیر کھول دی جائے/اس کا سرا کس کے ہاتھ میں ہے۔

''تمہارے آنے کے بعد'' نامی نظم بھی ایک جنسی طور پر ناآسودہ عورت کی ایک کیفیت کو بیان کرتی ہے۔وہ مرد کی منتظر ہے رات گئے جاگ رہی ہے مگر جب کنجی تالے میں گھومتی ہے تو وہ سوتی بن جاتی ہے۔اس کا ساکت جسم مرد کو خواہش کا پیغام دینے میں ناکام رہتا ہے اور آخر میں نوالے چباتے ہوئے مرد کے بارے میں وہ کہتی ہے ''میں بے خبر/اور کبھی آگاہ/تمہارے نوالے چبانے کی آواز میں/شامل ہو جاتی ہوں۔

عذرا عباس کی نظم ''ایک زندگی اور مل جائے'' اس کی اپنی بے معنی اور بے شناخت زندگی کے بندھنوں کو توڑ کر ایک ناممکن کی خواہش کا اظہار ہے وہ زندگی کو نئے سرے سے جینا چاہتی ہے، اپنی ذاتی یوٹوپیا میں۔اس زندگی میں سفر اس کے اسباب کے ساتھ بندھا رہے گا۔سفر نژادی اس کے زماں و مکاں کی بندشوں کو ناکام کر دے گی۔وہ ایک پرندہ بننا چاہے گی جو پانیوں سے ٹکراتا ہوا آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔احساسِ لذت کا گہرا تجربہ وہ اس زندگی میں حاصل نہیں کر پائی اور اس کا ماتم اس خالص اور مکمل تجربے کو خواہش میں نظر آتا ہے۔وہ ایک درخت بننا چاہتی ہے جو دھوپ چھاؤں دونوں کا مزہ لیتا ہے۔اس کی موجودہ زندگی ہر طرح سے بے مزہ ہے۔نہ اس میں غم کی گہرائی ہے نہ خوشی کی کیونکہ یہ تجربات کی شدت ایک دوسرے سے پیوستہ ہے۔اس دھوپ چھاؤں کے ملاپ

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ کیجیے

''ناقابل تسخیر تجسس''

ثمینہ رحمٰن
(کراچی)

عذرا کی یادیں تیز، شکل کے ٹکڑے ہیں۔ ایک بدلتا ہوا کیلیڈوسکوپ جس کے ذریعے وہ اپنے غیر معمولی بچپن کو دیکھتی ہے۔ یہ یادیں ایک ہالے کے ساتھ لگائی نہیں جاتی ہیں اور نہ ہی خوشگوار معصومیت کی ابتدائی حالت کے طور پر پیش کی جاتی ہیں، ایک خوبصورت منظر کے ذریعے ایک خوبصورتی۔ اور نہ ہی یہ اذیت اور زیادتی کی کہانی ہے۔ عذرا کی جڑیں مضبوطی سے شہری اور متوسط درمیانے طبقے کی ہیں۔ بیک سٹریٹس ناقابل تسخیر urchins کی آوازوں اور شرارتوں سے گونجتے ہیں۔ عام بچپن کی حرکات کے متوازی چلتا معاشرے کے کناروں پر بسنے والے لوگوں کا ایک گہرا شعور ہے: شمو کی دیوانی ماں دیوار کے سامنے ناچ رہی ہے، ایک عورت جو چوہے کے ساتھ اپنی اکلوتی ساتھی کے طور پر رہتی ہے، اور لاوارث بیوی جس نے خود کو اس میں بند کر رکھا ہے۔ اپنی خیالی دنیا عذرا کے تجربات ایک اوسط لڑکی کی طرح ہیں۔ عذرا، بچہ، ایک مشن پر شہری گوریلا ہے نظر انداز شدہ زیر زمین کی غیر معمولی اور جادوئی زندگی کو آگے بڑھانا، کناروں پر رہنے والوں کو ان کی چھین لی ہوئی انسانیت کو بحال کرنا، انہیں بچے کی بے تکلفی اور غیر مہذب نگاہوں کے ساتھ مرکزی مقام پر کھینچنا۔

ایک ناقابل تسخیر تجسس یاد دہانی کو متحرک کرتا ہے - ناانصافی کے خلاف کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور خود سے انکار یا بدنامی کو قبول کرنے سے صاف انکار ہے۔ یادوں کا باغی بچہ بھی ذمہ دار ہے، جو گھر کے مردوں کی غیر موجودگی میں فراہم کنندہ کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اس کی تیز دانشمندی ہے جو روٹی ڈالتی ہے۔ خاندان کا منہ کسی بھی مرحلے پر وہ اپنی جسمانی آزادی اور اظہار رائے کے بلا روک ٹوک لطف اندوز ہونے یا بالغ دنیا میں اس کے چھیدنے والی واضح نظر کو اس کے متضاد، متضاد طریقوں سے سمجھوتہ نہیں کرتی۔ اس کا مضبوط جذبہ جانوروں اور انسانوں کو گلے لگاتا ہے۔ دادا ابا کے ساتھ اس کے تعلقات میں، ہر ایک دوسرے کی زمین پر قبضہ کرتے ہوئے دوسرے کا اندازہ کرتا ہے۔ دادا کے ساتھ تعلقات، خاندان کے دیگر افراد کی طرح، تازگی کے ساتھ واضح طور پر ہیں، عام طور پر خاندان کے مباحثے کے لیے مخصوص سہولیات کی مزاحمت کرتے ہیں۔ عذرا کا انداز ناگوار ہے۔ یہ سطحی ہونے، گہرائی اور گونج کی کمی کا تاثر دے سکتا ہے۔ الفاظ کی سادگی، چھوٹے چھوٹے جملے، گنجا اور غیر سنجیدہ بیان، تاہم، سب سے وسیع تعمیر کی طرح تیار کیا گیا ہے۔ زبان غیر معمولی، ویرل، مادہ غیر فعال، ضرورت سے زیادہ استعارے یا تشبیہ سے بوجھل ہے۔ یہ اپنی سطح کی نگاہوں کی گاڑی ہے۔ یاد کیے گئے تجربات کے بارے میں چھیڑ چھاڑ اور خیالات کئی معانی میں ڈھکے ہوئے نہیں ہیں اور نہ ہی ان تہوں میں چھپے ہوئے ہیں جنہیں چھیلنے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی نامعلوم اور پریشان کن قاری کو دریافت کرنے کے لیے ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ آنکھیں بند کرنے سے رابطہ اور سطح دونوں سٹرپس اور آگ جلاتی ہے۔ جب اس کے بچپن کے ساتھی کو آگ لگائی گئی تو اس نے اس قسط کو سنبھالا اس بات کی مثال ہے کہ کنٹرول شدہ زبان بچے کے تماشائی کے متعدد اذیت ناک ردعمل کو کس طرح موثر انداز میں ظاہر کرتی ہے۔ ہر لمحہ اس قدر روشن ہے کہ خوفناک تجربے کے پیش نظر کوئی پھیلاؤ اور تخفیف ممکن نہیں ہے۔ عذرا بھی جلدی میں عورت ہے۔ اس کی تحریر دم گھٹنے والی ہے، جلدی ہے۔ وہ قاری سے چوکسی کا مطالبہ کرتی ہے۔ رابطے کرنے کے لیے، رفتار کو برقرار رکھنے کے لیے، ضرورت سے زیادہ کے ساتھ تقسیم کرنا۔ وہ طریقہ جس میں وہ ماضی، حال اور کے درمیان چلتی ہے۔ مستقبل ایک ہی جملے کے اندر زمانوں میں حیرت انگیز تبدیلی میں ظاہر ہوتا ہے، ایسی چیز جو ترجمہ میں وفاداری کے ساتھ دوبارہ پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔

نظمیں ایک اور معاملہ ہیں۔ الفاظ کی عدم موجودگی، ننگی ضروریات میں کمی؛ ان کے پاس شفاف معیار، چمک اور رابطے کی یقین دہانی ہے۔ عذرا، ایک چالاک اور مشاق قصائی کی طرح، چربی کو تراشنے میں ایک تیز چاقو کا استعمال کیا ہے۔ یہ دیکھنا حیرت انگیز ہے کہ اس نے کنکال کے تناسب کی طرف مائل ہوتے ہوئے کس طرح سفید کیا ہے۔ دبلا اور فالتو، ہڈیوں سے نکلا ہوا شوربہ بھرپور اور پرورش پاتا ہے۔

نظموں کا مزاج دور، چوکس، ہوشیار ہے۔ ایک ایماندار ایمانداری کو برقرار رکھتے ہوئے جب وہ تحقیقات کرتی ہے اور احساسات، سوچنے، ہونے کے طریقوں پر سوال کرتی ہے۔ مسلسل، مسلسل درد غضب کا بھیس ہے۔ غفلت اور بے حسی وجود کی شرط ہے، اور نظمیں کمزوری پر بات چیت کا ایک طریقہ ہیں۔ ناقابل برداشت زندگی کو قابل برداشت بنانا رابطے اور مواصلات کی کمی یا ناممکن تھکاوٹ، اجنبیت، کاہلی، جڑوں کے نیچے جذبہ اور عزم جھوٹ ہے، آزادی کی قابل ذکر خواہش، تخیل کی رہائی، اوپری حصوں میں بلند ہونے کی صلاحیت۔ سب سے بڑا اظہار خوف قید کا خوف ہے، دوسروں یا خود کی طرف سے 'جال' ہونے کا۔ یادوں اور نظموں کا ایک اہم پہلو خواتین کی جنسیت کے نسبتاً unc نامعلوم ڈومین میں ان کی بے خوف آمد ہے۔ عذرا ایک بچی کے درد اور گھبراہٹ کو ظاہر کرتی ہے جب وہ بلوغت کو پہنچتی ہے اور اس نشوونما پر خاندان، خاص طور پر مردوں کا ردعمل۔ وہ ان کے ناقابل بیان غصے اور کنٹرول کرنے کی خواہش سے حیران ہے۔ ایسا نہیں ہوتا۔

اس کو فرینڈ کریں۔ جیسا کہ وہ اور اس کے دوست جنسی علم اکٹھا کرنے کے لیے ایک دوسرے کے جسم کے ساتھ تجربہ کرتے ہیں۔ یادوں میں، نوعمر خوشی کا چھپا ہوا راز صوفیانہ طرز پر ایک طاقت کے بارڈر سے مغلوب ہو جاتا ہے، جو کہ افسوسناک طور پر نظموں میں بالغ جنسی کے غیر معمولی اور معمول کے کام

میں بدل جاتا ہے۔ یادوں کے اختتامی ٹکڑے میں اختتام، بچپن سے جوانی تک عبور، تقریبا spiritual روحانی شدت کے ساتھ جسمانی اور جذباتی حالتوں کا اختلاط اتنا ہی قابل ذکر اور پیچیدہ تحریر ہے جتنا کہ موضوع پر ہے۔

عذرا ایک متحرک ادیب ہے، زندگی کا سانس لے رہی ہے اور دبے ہوئے، پوشیدہ، نظر انداز چھوٹی لڑکیوں کے بھوتوں کو زندہ کرتی ہے۔ زندہ رہنے والوں کی روح اور دلیری کو یاد کرتے ہوئے، تاہم مختصر طور پر، اپنے آپ کو برقرار رکھتے ہوئے۔ غیر سرکاری اور اسکولوں کو پابند اور جابرانہ کے طور پر سامنے لایا جاتا ہے کیونکہ بچہ یہ سمجھنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے کہ استاد جھوٹ کیوں بولے گا یا محبوب باپ جیلر میں بدل جائے گا۔ اس کی تحریر ایک دعویٰ ہے- اس کی موجودگی، اس کی مزاحمت، اس کی لچک، اس کی عورت اور اس کی شخصیت کا ریکارڈ۔ وہ لفظی طور پر دھول اٹھاتی ہے، چیزوں کو کرنے کے قائم کردہ طریقوں میں خلل ڈالتی ہے، مردوں کے تحفظ میں دخل اندازی کرتی ہے، جنگ کے احساس سے ناانصافی کی طرف بڑھتی ہے، اپنے خیالات پر زور دیتی ہے، اپنے خوابوں اور خوابوں کو درست کرتی ہے۔ ان کا اصرار 'گنے جانے' کی تصدیق کرتا ہے اور ان لڑکیوں اور خواتین کی زندگیوں اور جدوجہد کے ساتھ ان کے تعلقات کو مضبوط کرتا ہے جو اپنی زندگی کے ہر دن کے ساتھ لڑتے ہیں ان یادوں اور نظموں کو ایک ساتھ پڑھیں جو عورت کی زندگی میں آزادی سے غلامی تک کے راستے کو چارٹ کرتی ہیں۔ نوعمر لڑکی کا جنون جوانی میں شروع ہوتا ہے جبری اور چھاتی، ناک (بچے کی پیشکش ایک بھائی سے وحشیانہ انتقام لاتی ہے)، آخری محرومی تک: پرانے ساتھیوں اور کھیل کے ساتھیوں کے ساتھ تمام رابطوں کو روک کر جسمانی آزادی سے دستبرداری۔ حالانکہ۔

ظاہری ہم آہنگی کو یقینی بنایا جاتا ہے، اگر باغی جذبہ غیر آلودہ نہیں ہے تو وہ غیر متزلزل رہتا ہے۔ عذرا فخر سے ان ابتدائی لڑائیوں کے نشانات پہنتی ہے۔ بچپن وہ مصیبت تھا جس نے اس کی آگ بھڑکائی۔

اکثر کی تحریریں آج پاکستان میں عورتوں کی تحریر کے منظر نامے کو بدلنے والے تنقیدی بڑے پیمانے کا ایک اہم حصہ ہیں، جس طرح فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، سارہ شگفتہ، اور عطیہ داؤد جیسے شعراء اور آنکونک کلاسز کے ساتھ رہنمائی کرتی ہیں۔ جب وہ بہادری سے باہر نکلتی ہے، یہ ناممکن ہے کہ اجنبیت کو محسوس نہ کیا جائے، واضح تشویش کو محسوس کیا جائے جو اس کی تحریر خاص طور پر اس کی نظموں کا پیچھا کرتی ہے۔ یہ پنجرے والے درندے کی غصے سے موجود توانائی ہے۔ تمہاری ازلی دشمن ہے، جس کی ہر قیمت پر مزاحمت کی جائے۔ اگر ان شعراء کی توانائیوں کو بے قابو کیا گیا تو تباہی ایک نئی خاتون تخلیق کار سے پہلے ہوگی:

اگر میرے ہاتھ کھلے ہوئے ہوتے تو میں اپنے خوابوں کی کھرچوں سے دیواروں کو کالا کر دیتا اور وبا کو برسنے دیتا اور اس دنیا کو اپنی ہتھیلیوں کے درمیان کچل دیتا۔

☆

- بقیہ -

عذرا کی شاعری میں تانیثی حیثیت

کے لیے اس کا استعارہ ایک مضبوط درخت بنتا ہے۔ اسی طرح وہ بنجارہ جو پہاڑوں اور میدانوں کو اپنے قدموں میں سمیٹ لیتا ہے اس کے خوابوں میں بسی زندگی اسی کا کردار ہے اور اس کے ساتھ ایک رقاصہ بھی جو اپنے من کے بوجھ سے آزادی حاصل کر سکتی ہے ایک رقص کے ذریعے وہ اس آئیڈیل زندگی کا خاتمہ بھی بھوک اور نفرت کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں کرنا چاہتی ہے۔ عذرا عباس کے زندگی کے تصور میں جو آزادی کی کیفیت ہے اور زمان و مکان اور سماج کی عائد کردہ رسموں کی محدودیت سے اس کی نفرت اس نظم میں پوری شدت سے عیاں ہوتی ہے۔

عذرا عباس کا مختصر نثری نظموں کا مجموعہ ''میز پر رکھے ہاتھ'' (۱۹۸۸ء) ان کی طویل نظم ''نیند کی مسافتیں'' (۱۹۸۱ء) سے نہ صرف ہیئتی بلکہ موضوعاتی اعتبار سے بھی خاصا مختلف ہے۔ ''نیند کی مسافتیں'' ایک نظم جو خوابناک کیفیت کی غماز اور ابہام میں لپٹی ہوتی ہے جبکہ ''میز پر رکھے ہاتھ'' کی نظمیں غم، غصہ، ناراضگی، بے چینی، کوفت، بیزاری اور نا آسودگی کی کیفیتوں کا اظہار کرتی ہیں۔ عذرا کی آواز ایک بے معنویت سے پریشان عورت کی آواز ہے جو اپنی تانیثی شعور سے آگاہ ہو یا نہ ہو تانیثی حسیت کا اظہار کرتی ہے اور سرد اساس معاشرے کو اپنی انسانی حیثیت کی یاددہانی ہر لمحے کرتی ہے۔ اس کی نظمیں اپنی نسائی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس معاشرے میں عورت کے مقام اور اس کی سماجیات اور نفسیات کا اظہار کرتی ہیں اور اس طرح شعور کی ایک بلند سطح پر نظر آتی ہیں اور شاعرہ کو ایک باغی بنا دیتی ہیں۔ یہ بغاوت آگے چل کر کیا رخ اختیار کرتی ہے اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس کے شاعرانہ سفر کی اگلی منزلوں کا یعنی اس کے دیگر مجموعوں کی نظموں کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ لیکن ہم بلاشبہ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ''میز پر رکھے ہاتھ'' کی نظمیں اس کی تانیثی حسیت کا شدت سے اظہار کرتی ہیں۔

جب بے زاری آتی ہے

ڈاکٹر طاہرہ کاظمی
(کراچی)

عذرا عباس کی نظمیں تو یقیناً آپ نے پڑھ رکھی ہوں گی۔

احساس اور درد کی شدت میں گندھے ہوئے الفاظ جو صرف ایک عورت ہی بیان کر سکتی ہے اور ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ زندگی کی کھٹنائیوں اور نارسائی سے سجی ان نظموں کا کمال یہ ہے کہ آپ ان کو پڑھتے ہیں، الفاظ دل پہ اثر کرتے ہیں، لیکن آپ جونہی صفحہ پلٹتے ہیں، نظم کی حساسیت اور شدت آپ کو واپس لوٹ کے پھر سے پڑھنے پہ مجبور کرتی ہے۔ آپ کو اکساتی ہے کہ پھر سے پڑھ کر سوچیں کہ ارے یہ کیا کہہ دیا؟ اتنے سادہ الفاظ میں اتنا گہرا درد اور کتنے پوشیدہ معنی؟

ایک نظم نے ہمیں اس موضوع پہ پھر سے لکھنے پہ مجبور کر دیا ہے جس سے ہم ابھی تک آپ کی برداشت کا امتحان لیے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن مسئلہ چونکہ عورت کی زندگی کا ہے اس لئے ہم آپ کی بیزاری نظر انداز کرتے پہ مجبور ہیں۔

نظم تو ہم آپ کو سنائیں گے ہی لیکن اس سے پہلے ایک سوال کہ کیا ادب برائے ادب لکھا جانا چاہئے یا زندگی کی اندھیری راہوں میں اتر کر ان جذبات کی تصویر کشی کرنی چاہئے جو بہت سوں کی آنکھ سے یا تو اوجھل رہتے ہیں یا نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ عورت کے پیراہن کو لگی آگ آخر کیوں نہ سمجھی جائے؟

''میں سخت بیزار ہوں اور تھک چکی ہوں۔ یقین کیجیے غصہ اس قدر آتا ہے کہ جی چاہتا ہے دنیا کو آگ لگا دوں۔ بات بے بات بھڑک اٹھتی ہوں۔ چڑچڑاپن اور بیزاری اس قدر ہوتی ہے کہ کسی کی شکل دیکھنے کو جی نہیں چاہتا بلکہ دل کرتا ہے کہ سب کو دھکے دوں، ان سے کہوں کہ مجھے اکیلا چھوڑ دیں اور۔۔۔ اور۔۔۔ کبھی کبھی تو۔۔۔''

وہ کہتے کہتے رک گئی

''آپ ہنسیں گی تو نہیں؟''

''بالکل نہیں، میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں، آپ بات مکمل کیجیے''

''کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ میں اپنے اردگرد ہر کسی پہ تھوک دوں۔ میرے اندر اس خواہش کی شدت اس قدر ہوتی ہے کہ مجھے اپنے آپ کو روکنے کے لئے لڑنا پڑتا ہے''

''ارے عذرا عباس کہیں گائنا کالوجسٹ تو نہیں رہیں کسی جنم میں اور اسی مریض کی کتھا اپنی نظم میں لکھ دی ہو''

ہم نے حیرانی سے سوچا۔

''کیا یہ بیزاری اور چڑچڑاپن اکثر ہوتا ہے اور اگر ایسا ہی ہے تو کچھ اندازہ کہ کس وقت؟''

''جی ڈاکٹر، یہ کیفیت ہر ماہ ہوتی ہے اور اب تو میری ساس بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اسے یقیناً ماہواری آنے والی ہوگی، اسی لئے پاگل ہو رہی ہے''

''اف، پھر ماہواری''

دل ہی دل میں ہم مسکرا اٹھے۔

''آپ یہ بتائیے کہ یہ کیفیت ختم کب ہوتی ہے؟''

''جی ماہواری سے ایک ہفتہ پہلے یہ سب کچھ ہوتا ہے، پھر جونہی ماہواری آتی ہے، تو بہتر ہو جاتا ہے لیکن پھر ماہواری کی تکلیف گلے پڑ جاتی ہے۔ ماہواری کے بعد سات آٹھ دن بہتر گزرتے ہیں اور پھر سے وہی سب کچھ۔ لگتا ہے کہ ہر ماہ میں صرف وہی ایک ہفتہ جیتی ہوں جو ماہواری کے بعد آتا ہے''

وہ خاتون بہت نڈھال نظر آتی تھیں۔

ماہواری کی کتھا تو ہم پہلے ہی کہہ چکے، اب طوفان سے پہلے کا حال سن لیجیے۔

خاتون نے جس بیزاری، اکتاہٹ اور چڑچڑے پن کی داستان سنائی، وہ پری منسٹرول سنڈروم (premenstrual syndrom-PMS) کہلاتا ہے یعنی ماہواری آنے سے پہلے کی تکلیف۔

پی ایم ایس نوے فیصد عورتوں کے جسمانی، ذہنی اور جذباتی معاملات پہ بری اثر انداز ہوتا ہے اور انہیں مختلف پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی علامات ماہواری سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے شروع ہوتی ہیں۔

پیٹ کا پھولنا، پیٹ میں درد، چھاتی میں اکڑاؤ، چہرے پہ مہاسے، کچھ خاص کھانے کی اشتہا، قبض یا اسہال، سر درد، تیز روشنی یا بلند آوازیں برداشت نہ کر پانا، تھکاوٹ، اکتاہٹ اور بیزاری، نیند میں کمی بیشی، اینگزائٹی، مایوسی، اداسی، غصہ، بے چینی اہم علامات ہیں۔

پی ایم ایس ہارمونز کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ خواتین میں یہ اتار چڑھاؤ ہر مہینے اور ہر دن ہو رہا ہوتا ہے اور ان ہارمونز کے تحت جسم اور ذہن میں بھی ہر وقت اتھل پتھل مچ رہی ہوتی ہے۔ یہ ہارمونز ایک عورت کی زندگی جہنم بنانے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

پانچ سے آٹھ فیصد عورتوں میں پی ایم ایس اس قدر شدید ہوتا ہے کہ انہیں خودکشی کا خیال آنے لگتا ہے۔ شدید غصہ اور چیخ و پکار، رونا دھونا، ہر مصروفیت سے لاتعلقی، بے خوابی، طبعیت میں شدید بیزاری اور چڑچڑاپن بھی پی ایم ایس کا حصہ تو ہے ہی لیکن اب یہ premenstrual dysphoric disorder یا PMDD کہلاتا ہے کہ جذباتی اور ذہنی انتشار حد سے بڑھ جاتا ہے۔

ان دنوں میں خاتون کو ان علامات کے بنیادی علاج کے ساتھ اپنے گھر والوں کی سپورٹ کی بھی بے انتہا ضرورت ہوتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ علم کسے ہے کہ خاتون کس مشکل کا شکار ہے؟

ورزش، مناسب غذا، پرسکون ماحول، آٹھ گھنٹے کی نیند، سٹریس سے اجتناب، اپنی دلچسپیوں کی آبیاری وہ بنیادی اصول ہیں جن پر چل کر پی ایم ایس کو بہتر کیا جا سکتا ہے لیکن پی ایم ڈی ڈی کو ڈپریشن اور اینگزائٹی کی دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔

کبھی دل پہ ہاتھ رکھ کے سوچیے گا کہ معاشرے کی کتنی عورتیں ان اصولوں پہ عمل پیرا ہونے کے وسائل یا اہلیت رکھتی ہیں۔ جہاں غربت و جہالت نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں، جہاں پیٹ کی بھوک اور روٹی ہر روز کا مسئلہ ہو، جہاں عورت کو بات کرنے کی اجازت نہ ہو، جہاں اس کی حیثیت سر جھکا کر حکم ماننے والوں کی سی ہو، جہاں انکار کی صورت میں فرشتوں کی پھٹکار سے ڈرایا جاتا ہو، وہاں کونسا پی ایم ایس اور کونسا پی ایم ڈی ڈی؟

عذرا عباس کی نظم مندی آنکھوں سے ہماری منتظر ہے، عورت کے جذبات کا آئینہ، عورت کے قلم سے!

جب بےزاری آتی ہے
بےزاری آتی ہے
میں سارے کام چھوڑ دیتی ہوں
کھانا، پینا حتیٰ کہ نہانا بھی
میل لدے پرلدے میرے جسم پر
چڑھنے لگتا ہے
دل چاہتا ہے
کسی درخت کی
اونچی شاخ پر بیٹھ کر
لوگوں کو گزرتے دیکھوں

اور جب
وہ نیچے سے گزریں
ان کے سروں پر تھوکتی جاؤں
بےزاری یوں آتی ہے
جیسے بہت مضبوط ہاتھوں سے
مجھے کوئی نچوڑ رہا ہو
گول گول
پھر میں کھلنے لگتی ہوں
الگنی پر پھیلے کپڑوں کی طرح
بےزاری میرے گھٹنوں اور انگلیوں
کی پوروں میں گھس کر
مجھے چھیڑتی ہے
اور میرا دل چاہتا ہے
کہ میں چاروں ہاتھ پاؤں سے چلوں
اور بھونکنے لگوں
اور چلتے ہوئے راہ گیروں کو
کاٹ کھاؤں
یہ بیزاری چھین لیتی ہے
میری ہنسی
جو میں اپنی جیسی عورتوں میں بیٹھ کر
ہنستی ہوں
اور وہ رونا
جو میری جیسی عورتیں روتی ہیں
یہ بیزاری
مجھ سے چھین لیتی ہے
کولہے مٹکا مٹکا کر چلنا
جو میں دوسروں کو دیکھ کر
چلنا چاہتی ہوں
بس یہ چاہتی ہے
میں درخت کی کسی شاخ پر
بیٹھ کر آنے جانے والوں کے
سروں پر تھوکتی رہوں
اور گم سم رہوں
کسی کو نظر نہ آؤں

ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر میڈیکل کی کتابوں میں بیماریوں کے ساتھ شاعری لکھنے کی اجازت ہوتی تو ہم پی ایم ایس کا باب شروع ہونے سے پہلے یہ نظم لکھتے۔ شکریہ عذرا عباس، آپ نے بہت سی عورتوں کی ان کہی کو زبان دے دی!

صاحبِ ویکسین

سارے جہاں میں لائقِ تحسین ہو گیا
لو دوستو میں صاحبِ ویکسین ہو گیا
اب گھومتا ہوں کوچہ جاناں میں بے دھڑک
جب سے مرا رقیب ''قرنطین'' ہو گیا

مرلی چوہان
(لاہور)

شاعری کے دیوتا

محمد حنیف
(کراچی)

مجھے یقین ہے کہ اتفاقیہ شاعر کوئی نہیں ہوتا مگر عذرا عباس اپنی شاعری کو بہت زیادہ سنجیدگی سے لیتی ہیں۔ وہ اپنی شاعری کو اتنی زیادہ سنجیدگی سے لیتی ہیں کہ ہمارے جرنیل اپنی جنگوں کو بھی اتنی سنجیدگی سے نہیں لیتے ہوں گے۔ وہ اپنی شاعری کی جادوئی طاقت کے بارے میں اس سے زیادہ یقین رکھتی ہیں جتنا کوئی فرقہ پرست ملا اپنے وعظ پر رکھتا ہوں گا، یا جتنا ہماری گلی کا کوئی سیاست دان اپنے جھوٹ پر رکھتا ہوگا۔ وہ شاعری کی ہیئت، اپنے موضوعات اور اپنی نظموں کی قرأت کے بارے میں تردد کرتی ہیں اور اگر کوئی ایسا نایاب دن آ جائے جب ان کی شاعری کہیں اٹک جائے تو پھر وہ شاعری کے دیوتاؤں سے دعائیں کرتی ہیں اور یہ دیوتا ان کی بات مان بھی جاتے ہیں کیونکہ شاعری کے دیوتا جانتے ہیں کہ وہ ان کی قبولیت یا عدم قبولیت کی پرواہ کیے بغیر لکھنا جاری رکھیں گی۔

اندھیرے کی سرگوشیاں میں شامل ان کی نظموں میں موضوعات، آوازوں اور ہیئتوں کی ایک حیرت انگیز رینج ملتی ہے۔ ٹماٹر کی بڑھتی ہوئی قیمتیں ہوں یا کشتی میں جھپکی لیتا ہوا سمندر، ان کا تخیل انہیں ان جگہوں پر لے جاتا ہے جنہیں کوئی روایتی شاعر زیادہ شاعرانہ نہیں سمجھتا۔

وہ اپنے سیاسی ہونے پر بھی معذرت خواہ نہیں اور جب وہ شاعری سے کھیل رہی ہوں تب بھی سیاسی ہوتی ہیں۔ ان کی نظمیں کاغذ پر کوئی رقص سا کرتی ہیں۔ کبھی کبھار ان کی نظم میں کوئی لطیفہ سا ہوتا ہے جس کے بعد ہمارے لبوں سے ایک بے ساختہ سا قہقہہ ابھرتا ہے۔ کبھی کبھار ان کی نظمیں بس ایک آہ بھر کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بڑی حد تک آگاہ ہیں۔ ان کی نظموں میں سگریٹ نوش اپنے نہ سلگائے ہوئے سگریٹ سونگھتے ہوئے، خواتین اپنے گھر میں آنے والی چڑیوں کو ممتا کے راز بتاتے ہوئے اور موت کے سوداگر اپنے عیش و عشرت کے محلات میں ڈرائی فروٹ کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی پسندیدہ قسم کی عورت وہ ہے جس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور اس پر الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے گناہ چرا رہی ہے۔ ایک صفحے پر وہ یہ خواہش ظاہر کر رہی ہیں کہ وہ کسی ہجرت کرنے والے راج ہنس کے ساتھ اڑتی چلی جائیں اور دوسرے صفحے پر وہ ایک ایسے ملک کے بارے میں پریشان نظر آتی ہیں جو کومے میں چلا گیا ہے اور کوئی ایسا نہیں جو اس کے رخساروں پر چٹکی بھر کر اسے ہوش میں لا سکے۔

ان کے شعری جہان میں ان کی ذات اور سیاست کے درمیان تفریق کی لکیر موجود ہی نہیں۔ وہ اپنے اردگرد پھیلی زندگیوں کو یوں موضوع بناتی ہیں جیسے وہ اپنی سوانح عمری لکھ رہی ہوں۔ پھر وہ اپنے انتہائی نجی قسم کے محسوسات کا تذکرہ یوں کرتی ہیں جیسے قوم سے خطاب ہو رہا ہو۔ وہ چھوٹی چھوٹی اور سادہ سی لائنوں کی مدد سے ایک پوری دنیا تخلیق کر ڈالتی ہیں اور آپ کو شاعری کے جادو کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور انسانی تخیل پر آپ کا اعتماد پختہ کر دیتی ہیں۔ وہ شہر میں بارش کے امکان کا تذکرہ یوں کرتی ہیں جیسے ساری کائنات میں مسئلہ بس اب یہی رہ گیا ہو۔ وہ بتاتی ہیں کہ شہر بارش کے لیے کیسے تیاری پکڑ رہا ہے۔ گٹر ان لوگوں کو وصول کرنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں جو بجلی کا کرنٹ لگنے سے ہلاک ہو جائیں گے، ٹوٹتی پھوٹتی چھتیں ہیں جو کھلے منہ کے ساتھ قہقہے لگا رہی ہیں اور ہاں پیاسی سڑکیں بھی تو ہیں۔ پھر بادل نیچے دیکھتے ہیں اور شہر میں اپنے استقبال کی تیاریاں دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ لیکن بارش کی امید ایک خیالِ خام ثابت ہوتی ہے جس پر ہر شخص نے یقین کرنا چاہا تھا، جیسے ہر شخص زندگی پر یقین رکھنا چاہتا ہے، جیسے ہر شخص شاعری پر یقین رکھنا چاہتا ہے۔

وظیفہ

راجہ صاحب محمود آباد نے ایک بار بڑے پیار سے مجاز سے کہا:

''مجاز! ایک بات کہوں تم مانو گے؟''

مجاز نے سراپا انکسار بنتے ہوئے کہا:

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر، فرمایئے''

''میں چاہتا ہوں کہ دو سو روپیہ ماہوار تمہارا وظیفہ مقرر کر دوں۔''

''بڑا کرم ہے حضور کا۔۔۔''

مجاز نے جواب دیا۔

''لیکن۔۔۔!''

راجہ صاحب نے سنجیدگی سے کہا:

''لیکن تم خدا کے لیے شراب چھوڑ دو۔''

''شراب چھوڑ دوں؟''

مجاز نے انتہائی بیچارگی اور حیرانی سے کہا:

''پھر آپ کے دو سو روپے کس کام آئیں گے؟''

اندھیرے کی سرگوشیاں (۲۰۱۶ء)

اگر تم مجھے ایک برقع پہنا کر مجھے ڈھانپنا چاہو

اگر تم مجھے ایک برقع پہنا کر مجھے ڈھانپنا چاہو
تو
کیا میری چھاتیوں کا غرور
تمہاری آنکھوں سے چھپ جائے گا؟
اگر تم مجھے دو برقعے پہنا دو،
یہ غرور پھر بھی تمہاری نظروں سے چھپ نہیں سکے گا
چلو پہناتے جاؤ مجھے
تلے اوپر بہت سے لبادے،
اور چھوڑ دو میری آنکھیں صرف یہ دیکھنے کے لیے
کہ تمہاری آنکھیں اب کیا دیکھ رہی ہیں
مجھے یقین ہے
تم میری چھاتیوں کے غرور کو ڈھونڈ رہے ہو گے
تلے اوپر لدے ہوئے
میرا جسم چھپانے والے کپڑوں کے اوپر
تمہاری بینائی کے وِنڈ اسکرین پر پانی کے قطرے
چھپا کے مار رہے ہوں گے
اور میری غرور سے بھری چھاتیاں
تمہاری شکست پر
کبھی نہ ختم ہونے والے غرور
سے بھری مسکرا رہی ہوں گی

خدا کیا مصروف ہے

نہیں
بس چھیڑو مت
کیا
وہ نہیں دیکھ رہا اس زمین پر جس پر ہم رہتے ہیں
اگر وہ ہم کو دیکھ لیتا تو
ہو سکتا ہے وہ ہمیں دیکھ کر اپنی آنکھیں
بند کر لیتا ہو
اور سوچتا ہو

آنکھوں میں پھیلی ہوئی بے زاری

آنکھوں میں پھیلی ہوئی بے زاری
اور ہونٹوں پر جمی ہوئی بے دلی کو میں اب چھپا نہیں سکتی
ماتھے پر دراڑیں ڈالنے والی لکیریں
مجھے اکثر کچھ یاد دلاتی رہتی ہیں
آئینہ اب مجھ سے کچھ نہیں کہتا
جلی کٹی خاموشی سے مجھے گھورتا رہتا ہے
وہ ڈھونڈتا ہو گا میرے چہرے کی وہ مسکراہٹ
جو پھولوں کو حیران کرتی تھی
لیکن وہ کبھی کیا کرے
وہ بھی اپنی چمک کھونے کے بعد اب رواداری نباہ رہا ہے
وہ بھی سیلن زدہ دیوار پر
برسوں سے ٹنگا ہوا ہے
اس کیل کے سہارے جو بڑے زعم سے
ٹنگی ہوئی ہے
اس دیمک زدہ دیوار سے
بہت ٹھونک بجا کر لگایا تھا جسے
میرے ہاتھوں نے
جو اب اپنی آن بان کھو کر اب کمزور ہوتے جا رہے ہیں
آئینہ بھی اب اس بھروسے سے ٹنگا ہوا ہے
کہ کیل اسے کبھی نہیں چھوڑے گی
اگر ایسا ہوا تو
تو وہ آئینے کو کیا جواب دے گی؟
آئینہ جو مجھے دیکھنے کے لیے زندہ ہے

○

ایک بار تم نے مجھے ساحلوں پر چھوا تھا

ایک بار تم نے مجھے ساحلوں پر چھوا تھا
جب میں نے ساحلوں سے کہا تھا، تم گواہ رہنا
ایک بار تم نے مجھے جنگلوں میں چھوا تھا
میں نے جنگلوں کو گواہ بنایا تھا مجھے
پھر اس بینچ پر جہاں جدا نہ ہونے کی قسمیں کھائی تھیں
بینچ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی
میں نے اس کو گواہ نہیں بنایا
درختوں پر ٹھہرے ہوئے پرندوں نے بہت کچھ دیکھا تھا
میں نے فوراً ان کو اپنے ساتھ ملا لیا
وہ چہکنے لگے، مجھے لگا وہ میری حالت پہ ہنس رہے ہیں
شاید وہ خوش ہو رہے ہوں گے
شاید وہ خود بخود میرے گواہ بن گئے ہوں گے
ہاں، یہی ہوا ہوگا
مجھے یاد ہے، تم سے بچھڑنے کے وقت
وہ ایک آواز میں کوئی گیت الاپ رہے تھے
ایک ایسا گیت جو وہ اپنے ساتھی کے دور جانے پر گاتے ہوں گے
ہمیں بچھڑے ہوئے برسوں بیت گئے
اب نہ وہ درخت ہیں اور نہ وہ پرندے
اب میرا کوئی گواہ نہیں ہے
کہ میں اگر تم مجھے کہیں ملو تو
کہوں کہ تم کبھی کہیں ملے تھے

○

تمہارے وعدے

تمہارے وعدے کباڑی کے
پاس گروی ہونے کے لیے چلے گئے
تمہاری باتیں گندے نالے کی کیچڑ میں کود گئیں
زندگی کے آخری پڑاؤ پر تمہاری دہشت نے دودھ پلانے والی
ماؤں کے پستانوں کو نچوڑ دیا
کب کیا ہو جائے
اب تمہیں کچھ نظر نہیں آتا
موتیا تمہاری آنکھوں کی زینت بن گیا
سب بھول جاؤ
اور تیار ہو جاؤ
گیڈر کی موت تمہارے لیے اپنی آغوش کھولے کھڑی ہے
وہ جو تمہارے ساتھ ایک ہی تسلے میں کھانا کھا رہے ہیں
ان سے کہہ دو
ان کے نصیب میں شیر کی موت نہیں لکھی

○

جمی ہوئی ہے کائی ان دراڑوں میں

جمی ہوئی ہے کائی ان دراڑوں میں
جنہوں نے زندگی کو زندگی سے علیحدہ کر دیا ہے
ایک باس پھیلی ہوئی ہے
جو ان دراڑوں سے اٹھ رہی ہے
اور نتھنوں میں گھس کر وبائی مرض بن رہی ہے
کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہے
کوئی بھی نہیں
آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں
دستگیر
فالج زدہ ہاتھوں سے کون کس کو تھامے
بس دراڑوں میں جمی ہوئی کائی فاتح ہے
اپنی تمام تر سڑاند کے ساتھ

گرگٹ کا کھیل

عذرا عباس

کسی پر بھی نا گہانی آ سکتی ہے۔

اس پر بھی جو بہت گھنے پیڑوں کی شاخوں میں ادھر اُدھر پھدکتا پھر رہا تھا۔ بہت دنوں سے رنگ بدل بدل کر رہ رہا تھا۔ اور آج جب رات کے اندھیرے میں نئے بجلی کے تاروں پر بلب جل رہے تھے۔ وہ اپنی گردن اُچکا اُچکا کر زمین گھورتے ہوئے بلب کو دیکھ رہا تھا۔ ہوا چلتی تو تار ہلتے اور بلب ہل جاتا اور وہ پھدک کر دوسری شاخ پر۔

یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے یہ روشنی آج پہلی بار نہیں دیکھی تھی۔ اکثر یہ بلب جل جاتے۔ اکثر اندھیرا ابھی رہتا۔ لیکن جب کبھی یہ بلب جل جاتے تو وہ یہاں اتنے قریب نہیں ہوتا۔ وہ کہیں دور کسی اور شاخ پر کیڑوں کو کھانے میں مصروف ہوتا۔

لیکن ایکا ایکی یہ کیا ہوا۔ بچوں کے قہقہوں کی آوازیں اور شور۔ اب وہ بلب نہیں دیکھ رہا تھا۔ ادھر سے اُدھر بہت سے بچے بھاگ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ننھی سی گول گول، سفید چیز لڑھک رہی تھی، ادھر سے اُدھر اور کبھی بالکل اس کے منہ سے چھو جاتی۔

اسے ایسا لگا جیسے وہ ان بچوں کے کھیل میں شریک ہے۔ جب بچے اس گول سفید چیز کو اوپر اچھالتے تو وہ بھی اس کے قریب ہونے کے لیے اچھل کر اس شاخ تک جا پہنچتا جس کو وہ سفید چیز چھو رہی تھی۔

وہ خوش ہو رہا تھا۔ ان بچوں کو پتا ہی نہیں تھا کہ وہ ان کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ سفید گول گول چیز ٹک ٹک زمین پر گرتی اور اوپر ہوتی۔ کبھی ایک ہاتھ میں کبھی دوسرے میں اور کبھی اس کے منہ کو چھوتی ہوئی۔ لیکن ایک دم اچانک وہ سفید سفید گول چیز اس کے بالکل اوپر آ کر گھنے پتوں میں اٹک گئی۔

بچے ادھر اُدھر نیچے ڈھونڈنے لگے۔ ایک شور ہاہا کا اٹھا۔ اور پھر تجسس، کہاں گئی۔ کہاں ہے۔ اوپر رہ گئی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ وہ ان کے کھیل میں شریک تھا۔ اور گول گول چیز اس کے سر کے اوپر اٹکی تھی۔ وہ درخت کو ہلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ گول گول چیز گر جائے۔ لیکن وہ چیز وہیں ٹکی تھی۔ وہ خوش ہو رہا تھا۔ یہ ہوئی نہ بات۔ وہ خوش ہو ہو کر رنگ بدل رہا تھا۔ زندگی میں کبھی اس نے اتنے رنگ نہیں بدلے تھے، جتنے آج بدلے تھے۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ تمام زندگی اس نے ان درختوں کی چھال میں پھر پھر کر گھس گھس کر گزاری تھی، کیڑوں کو ہضم کرتے ہوئے ایک جیسی، بے مزہ یا کبھی کبھی ان ہلتے ہوئے بلبوں کو دیکھ کر۔ لیکن اُف کتنا مزہ آ رہا تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کھٹ سے اس کے سر کے پاس کوئی سخت چیز ٹکرائی وہ سنبھل نہ سکا۔ پٹاخ سے نیچے، بچوں کے پاؤں کے پاس آ کر گرا۔ وہ بوکھلا گیا۔ بچے حیرت اور خوشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ اب ایک ساتھ اس پر جھکے اور وہی شور جو اسے اچھا لگا تھا۔ لیکن یہ شور اب اس کے سر پر ایسا لگا جیسے کسی نے بہت سے پتھر مارے ہوں۔ وہ بھاگا۔ گول دائرے میں بچے اس گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ کوئی چیز ایک بار پھر کھٹ سے اس پر گری۔ اور وہ شور۔ وہ وہاں سے نکل نہیں پا رہا ہے، بچے ایک بار پھر کھٹ سے اس پر گرے۔ اور شور۔ وہ وہاں سے نکل نہیں پا رہا ہے، بچے گول گول چیز سفید چیز بھول کر اس کو نشانہ بنا چکے تھے۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ بچے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ وہ ہانپنے لگا۔ وہ جان چکا تھا۔ بچے اس سے موت کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ کھیل نا گہانی بن گیا تھا۔ ایک بار پھر کوئی سخت چیز اس کے جسم سے ٹکرائی۔ اس کے سر سے گاڑھا گاڑھا سا خون نکلنے لگا۔ وہ بے دم ہو کر زمین سے چمٹ گیا۔ ایک بار اس کا دل چاہا جست لگا کر اوپر پتوں کو پکڑے لیکن اس کی نگاہ گول گول سفید چیز سے ٹکرائی۔ اسے لگا جیسے وہ گول گول سفید چیز اب بچوں کو اس سے کھیلتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔

Classification

simplified:Lower class - Biskut
Middle class - Biskit
Upper class - Cookies
Lower class - Roomal
Middle class - Hankie
Upper class - Kerchief
Lower class - Sauce
Middle class - Ketchup
Upper Class - Toh'mah'toh dip
Lower class - Lifafa
Middle class - En've'lope
Upper class - On'vo'lup
Lower class - Nimbu Paani/Shikanjbin
Middle class - Lemonade
Upper class - Virgin Mojito
Lower class - Jean pant
Middle class - Jeans
Upper class - Denims
Lower class - Chasma
Middle class - Goggles
Upper class - Shades
Lower class : Do karak chai leke aa.
Middle class : Can I have two cups of tea.
Upper class : May I have two cinnamon Chai lattes please Regular

بھیڑ میں (۲۰۱۸ء)

پچھتاوا اب نہیں ہے

پچھتاوا اب نہیں ہے
پچھتاوے کا وقت گزر گیا
کیا کچھ بچا ہے؟
جو چلا گیا وہ کیا آئے گا؟ جو نہیں گیا
وہ کیا جائے گا؟
اب سنو
تم کیا سننا چاہتے ہو؟
وہی جو ہم سننا چاہتے ہیں
ہائیں، تم ہنس رہے ہو
مت ہنسو
تمہیں ابھی بھی کچھ نہیں ملے گا
بس پچھتاوا
جو تم سے کہے گا
منہ کیوں نہیں کھولا
ان چوہوں کو کیوں نہیں مارا
جو تمہاری غذا کی بوریوں میں گھس گئے تھے
اور کتر رہے تھے
تمہارے گوشت کی بوٹیاں
تمہارے جسم پر صرف ہڈیاں چھوڑ گئے
اب پچھتاؤ
اب تمہیں کیا ہو گیا
اور کون آیا

○

گمشدہ

ابھی ابھی ملی ہیں
میری بہت سی گمشدہ نظمیں
بہت سی کہانیاں
میں انہیں پڑھوں گی اور بھلا دوں گی
لمبی سڑک پر چلنے والے میرے قدموں کی تھکن
وہ سڑک جس کے ایک کونے پر
ایک غم میرا منہ چڑا رہا تھا
کوئی کہہ رہا تھا
بچ کے کہاں جاؤ گی
کہیں وہم اپنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے
ڈرانے کے لیے
اپنے بدنما جبڑے سے رال ٹپکا رہا ہے
میں پڑھوں گی بہت سی شاعری
بہت سی کہانیاں
وہ لوری دیں گی مجھے
وہ میری نیند کے باہر پہرہ دیں گی
نہیں آنے دیں گی کسی غم کی بساند کو میرے قریب
اور اس کو جو ابھی ابھی
ٹوٹے ہوئے بادام کے پھل کی طرح
میرے سر پر گرا ہے
اور دور کھڑا اپنی باچھیں پھاڑ رہا ہے

○

ایک قوم کو کیسے قابو میں کیا جا سکتا ہے

کیسے؟
تم نے کب سے بھوکا رکھا ہے؟
سالوں سے
پھر تو یہ بہت آسان ہو گیا
اب تک تو وہ خود غرض بھی ہو چکے ہوں گے
ایک روٹی پھینکو گے
وہ دوڑے آئیں گے
تمہارے کام کے لیے
پر جب تک روٹی پھینکتے رہو گے
یہ تمہارے کام آتے رہیں گے
انہیں جُل دینا ضروری ہے
لیکن جب یہ کام ختم ہو جائے گا تب؟
ایک بار پھر ان کو بھوکا ننگا چھوڑ دو
زیادہ اُدھم مچایا تو
جلا دو ان کے ٹھکانے
اٹھا لو ان کی لڑکیاں
ان کے بچوں کو؟
کیا ان کے بچوں کو بھی؟
ہاں، ان پر بلڈوزر پھیر دو
کام آسان کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں
جانے سے پہلے میرے مشورے کی فیس دیتے جاؤ

○

یہ وقت کی ریاکاری ہے

ہمیں کیسے کیسے کاموں میں لگا دیا
کبھی خالی بنچوں پر بیٹھے ہم انتظار کر رہے ہیں
ان کا جواب کبھی نہیں آئیں گے
کبھی حیرت کے مارے منہ کھولے یہ دیکھنے میں لگ جاتے ہیں
ہمارے حصے کی روٹی کون لے گیا
اور خالی پیٹ اپنی مجبوریوں پر کڑھتے کڑھتے
یہ بھی بھول جاتے ہیں
ہمارا دشمن کون ہے
یہ بھی بھول جاتے ہیں
ریاکار وقت ہم سے بنچ خالی کرنے کا اصرار کرے گا
ہم بھولے بھٹکے
کن راستوں پر چلیں گے؟
وہ جو لبریز ہیں
پانیوں سے
یا ان جنگلوں میں بڑھا دیے جائیں گے
جہاں جنگلی جانور ہمارے منتظر ہیں
اس ریاکار وقت نے اکٹھا کیا ہے ان لوگوں کو
جو اس کے سکھائے ہوئے ہیں
جو ہمیں نشانہ بنانے کے لیے مورچہ تانے بیٹھے ہیں
ان کے ایندھن چلیں گے جب ہمیں وہ
ان کی بجھتی ہوئی آگ میں پھینکیں گے
تا کہ وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے نابود کر دیں
کیا یہ وقت کی ریاکاری نہیں ہے؟
کیا یہ وقت کے سدھائے ہوؤں کی ریاکاری نہیں ہے؟

○

- ناول کا باب -

میں اور موسیٰ

عذرا عباس

موسیٰ میرا بڑا اچھا دوست تھا۔ دھوپ میں چمکتی ہوئی اس کی ناک خنجر کی نوک کی طرح پتلی اور چمکیلی نظر آتی تھی، یا مجھے اچھی لگتی تھی، میں نے موسیٰ سے پوچھا، ''تم کیا کر رہے ہو؟''

وہ زمین پر جھکا اپنی چھوٹی انگلی سے مٹی ہٹانے میں لگا تھا۔

''زمین کھود رہا ہوں۔''

''کیوں؟ اس بھربھری مٹی میں تم کو کیا ملے گا۔''

''خزانہ''

''خزانہ؟'' میں حیران ہو رہی تھی۔ ''کیا تم اپنی انگلی سے اتنی زمین کھود لو گے؟''

''ہاں'' موسیٰ نے سر اٹھا کر مجھے گھورا۔ اس کے گھورنے پر میں پیچھے ہٹ گئی۔

''تمہیں معلوم ہے خزانہ کیا ہوتا ہے؟''

میں نے کہانیوں میں خزانے کے بارے میں پڑھا تھا، جوڈاکو کہیں سے چراتے ہیں اور زمین میں دفن کر دیتے ہیں۔ اپنے اتنے علم پر میں اِترا اُٹھی۔

''ہاں''، وہ مسلسل زمین کھودتے ہوئے سر جھکائے جھکائے بولا۔

میں اس وقت اسٹیٹس کونشس تھی۔ موسیٰ جھونپڑی میں رہتا تھا اور میں مکان میں۔ موسیٰ کے پاس کوئی باورچی خانہ اور کوئی باتھ روم نہیں تھا۔ موسیٰ کی ماں ایک ہی جھونپڑی میں سب کو سلاتی، کھلاتی اور کھانا پکاتی تھی۔

میں نے موسیٰ سے کہا، ''تم یہ خزانہ لے کر پتا ہے کیا کرو گے؟''

وہ چھوٹی انگلی سے زمین کھودتے ہوئے ہنکارا۔

''تم سب کے سب اسے نگل جاؤ گے اور تمہارے پیٹ پھول جائیں گے۔ صبح کے ایم سی کی گاڑی تمہیں پیچھے والے میدان میں دفن کر آئے گی۔'' مجھے بلاوجہ کا مذاق سوجھ رہا تھا۔

''چپ بدتخت، خاموش'' وہ مٹی جھاڑ کر اٹھا اور ساتھ ہی ساتھ اس نے بہت سی مٹی میرے اوپر اچھال دی۔ میری سرمئی فراک اور سفید جوتے بھوری مٹی میں چھپ گئے۔

''کمینے، حرامی'' یہ گالی میں نے بڑی محنت سے یاد کی تھی۔ یہ گالی مجھے اچھی لگتی تھی۔ میں نے ابّا سے اس کے مطلب پوچھے تھے ایک بار، وہ نہایت اطمینان سے بولے ''بیٹا اس کے مطلب بتاؤں گا تو اللہ میری زبان پر انگارے رکھ دے گا'' میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔ لیکن یہ گالی مجھے یاد رہ گئی۔ اب بھی جب کوئی مجھے برا لگتا ہے تو میری زبان بے آواز اس گالی کو دہراتی ہے۔

موسیٰ مجھے اجلی نظروں سے گھورنے لگا۔ ''نہیں، تجھے مل جائے یہ خزانہ اور تیرا باپ موٹر سائیکل کے بجائے موٹر پر بیٹھ کر جایا کرے اور تو انگریزی اسکول میں جائے۔''

موسیٰ کو معلوم تھا کہ سرکاری اسکول میں پڑھ رہی ہوں، جہاں تختی لکھائی جاتی ہے اور ملتانی مٹی سے لپی یہ تختی اکثر میرے سر پر پڑتی رہتی ہے۔

''بکواس بند کر۔ میں انگلش کی کتاب پڑھتی ہوں، ابّا مجھ سے انگلش بولتے ہیں، تیرے گھر میں تو ہر وقت گالیاں بکی جاتی ہیں۔''

میں جب بھی موسیٰ کی جھونپڑی کی طرف سے گزرتی تھی۔ موسیٰ کی ماں کو رونے، جھینکنے اور گالیاں بکنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

''ہاں، ہاں'' موسیٰ چہکا، ''گالیاں میرے گھر میں بکی جاتی ہیں لیکن سیکھ تو گئی ہے۔''

میں نے ایسے ہی کچھ نہیں کیا۔ میں اب نرم پڑ گئی تھی۔

''دیکھ موسیٰ کیا واقعی تو یہ خزانہ نکال لے گا۔'' اب میں دل ہی دل میں موسیٰ کے خزانہ نکال لینے پر کڑھ رہی تھی۔

وہ پھر مستعدی سے زمین کھودنے بیٹھ گیا تھا۔

''ہاں، خزانہ نکالوں گا۔'' اس نے عجیب نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا تھا، جیسے اُس کی مفلسی کی ذمہ دار میں ہوں۔ اس کے جسم پر ایک لتّا جوڑا جو اکثر میلا رہتا تھا، اس کے پاؤں ننگے رہتے تھے اور ان پر چھوٹے چھوٹے زخم نظر آتے تھے، سوائے اس کے چہرے کے، جس پر مجھے اکثر اس تصویر کا گمان ہوتا تھا جو میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی تھی اور ابّا نمائش سے خرید کر لائے تھے۔ بالکل دھلا ہوا، وہ چہرہ کسی دن کے ابھرتے ہوئے سورج کی طرح نظر آتا تھا۔

میں اکثر موسیٰ کو چھیڑتی تھی۔ ''تمہارا منہ اتنا صاف رہتا ہے باقی ہاتھ پاؤں اتنے گندے اور سر۔۔۔'' مجھے اس کے بال بہت اچھے لگتے تھے، میلے رہنے کے باوجود ریشم کی لچھوں کی طرح ہوا میں ہلتے رہتے ہیں۔ میں اس کے بال کبھی کبھی مٹھی میں پکڑ کر جھنجھوڑ دیتی تھی۔

''تم مجھے اپنے بالوں کی وجہ سے اچھے لگتے ہو۔''

وہ مسکراتے ہوئے کہتا ''بال تو تمہارے بھی ایسے ہی ہیں۔''

''اچھا'' میں اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے بالوں سے نگاہوں ہی نگاہوں میں موازنہ کرنے لگتی، لیکن اس تعریف کے باوجود مجھے اپنے بال کبھی موسیٰ کے بالوں سے زیادہ اچھے نہیں لگے۔ میں دیر تک موسیٰ کو زمین کھودتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کی باتیں تو مجھ کو اکثر سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن یہ کام تو اور بھی میری سمجھ سے باہر تھا، جس کو میں موسیٰ کی تمام باتوں کی طرح اہم سمجھنے لگی تھی۔ اس وقت میری ناسمجھی مجھے موسیٰ کی باتوں کی طرف لے جاتی تھی

لیکن بعد میں وہ سب تو اور پیچیدہ نظر آنے لگا تھا۔ جوں جوں وقت آگے بڑھ رہا تھا اور مجھ میں سمجھنے کی صلاحیت بڑھ رہی تھی۔ موسیٰ میری نظر میں اور اہم ہوتا جا رہا تھا۔

میرے اور موسیٰ کے گھر کے درمیان ایک میدان تھا، جو تکون شکل میں بنا ہوا تھا۔ میرے گھر کی طرف آتے آتے اس کا ایک کونہ رہ جاتا تھا، جس کے ایک طرف درمیانے درجے کے لوگ رہتے تھے اور ان میں سے کچھ اپنی تمام تر کوششوں سے درمیان درجے سے اوپر جانا چاہتے تھے۔ ان کا رہن سہن، رکھ رکھاؤ بتاتا تھا کہ شاید وہ اس میں کامیاب ہو جائیں۔ شاید وہ اس میں کامیاب ہو جائیں۔ شاید میرے ماں باپ بھی اسی خواہش کا شکار تھے۔

موسیٰ کی بستی اس میدان کے دوسری طرف تھی۔ اس میدان کے لوگوں کے بارے میں مجھے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ بہت غریب ہیں۔ ان کے پاس رہنے کے لیے اور پہننے کے لیے اکثر کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے چولہے بہت دیر سے جلتے ہیں، جب اس علاقے کے مرد، دن بھر کی مزدوری کے بعد روزانہ کی کمائی ساتھ لے کر لوٹتے ہیں تو ان کی عورتیں اسی حساب سے کھانا پکاتی ہیں۔ ہر جھونپڑی میں بچوں کی ایک یلغار تھی۔ ننگے بھوکے اور حواس باختہ بچے، جو دن بھر دھول اور دھوپ میں لوٹتے رہتے تھے۔ ان کے ہاں اسکول جانے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ وہ اکثر ہمارے دروازوں پر آ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ''ٹی وی دِکھاؤ'' امّاں جب کبھی اچھے موڈ ہوتیں تو ٹی وی کا رُخ دروازہ کھول کر باہر کی طرف کر دیتیں اور وہ باہر کے کھلے دروازے سے ایک دوسرے پر جھانک جھانک کر اور دھکے دے کر ٹی وی دیکھا کرتے۔ وہ بھی جب، ان میں سے ان کا کوئی ساتھی کہیں سے یہ خبر سن کر آتا کہ آج ٹی وی پر کوئی اچھا ڈرامہ آنے والا ہے، یا جب امّاں کا موڈ اچھا ہوتا۔ وہ جب تک چاہتیں وہ دروازہ کھلا رہتا اور جب چاہتیں بند کر دیتیں۔ ایسا اکثر کئی گھروں میں ہوتا۔ جب کوئی ان کو دھتکار دیتا وہ دوسرے کے گھر پر پہنچ جاتے۔

میں نے ایک دفعہ موسیٰ سے کہا تھا ''تمہارے گھر میں بھی تو ٹی وی نہیں ہے تم بچوں کے ساتھ ٹی وی دیکھنے کیوں نہیں آتے۔ میں تمہیں اندر بٹھاؤں گی، تم میرے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھنا۔''

وہ پھنکارا تھا ''ہوں، میں بھیک منگوں کی طرح تیرے دروازے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھوں گا اور تیری ماں، جو جب میری طرف دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں سے ایسا لگتا ہے جیسے میرے منہ پر تھپڑ مار رہی ہو۔''

''تم جھوٹے ہو، میری ماں کبھی ایسا نہیں کرتی۔''

''ہاں، ہاں'' وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''وہ تو شان دکھاتی ہے کہ اس کے گھر میں ٹی وی ہے تو بھی مجھے اسی لیے بلا رہی ہے۔''

موسیٰ کے یہ طنز اگرچہ کہ اس وقت بہت بری طرح مجھے مجروح نہیں کرتے تھے لیکن مجھے برے ضرور لگتے تھے۔ یہ آخر کیا بکتا رہتا ہے؟ لیکن موسیٰ کے اس طنز کے باوجود میں اپنے علاقے کے لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلتی تھی۔

میں جب گھر سے باہر نہا دھو کر نکلتی، میرے قدم خود بخود موسیٰ کو ڈھونڈنے کے لیے چل پڑتے۔ جو صاف ستھرے بچوں اور اپنے علاقے کے بچوں سے الگ تھلگ دور کسی کونے میں چپ چاپ کھڑا ٹکا کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر موسیٰ کے چہرے پر چڑھی ہوئی اداسی کی تہہ پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ تیرنے لگتی اور میری وہ شام اس کی اس مسکراہٹ پر مجھے تازہ ہواؤں سے ملا دیتی۔

☆

میری اور موسیٰ کی دوستی بھی کچھ اسی طرح ہوئی تھی۔ اس شام امّاں نے مجھے تاکید سے باہر بھیجا تھا۔ ''دیکھو باہر جاؤ لیکن ان گندے بچوں سے مت کھیلنا۔'' گندے بچے میرے لیے ایک عجوبہ ہو گئے تھے۔ بار بار کی تاکید نے مجھے ان گندے بچوں کی طرف آخر پہنچا دیا تھا۔

وہ پہلا بچہ موسیٰ ہی تھا جو مجھے اس طرف آتے ہوئے دیکھ کر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا تھا۔

''ارے تم ادھر کیوں آئی ہو، یہ تمہارا علاقہ نہیں ہے۔''

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میدان میں کوئی ایسی لکیر نہیں تھی جو مجھے ادھر یا ادھر کا فرق بتا دیتی۔ میں غرّائی، غصہ مجھے اکثر جلدی آ جاتا ہے۔ ''ہاں، تو لکیر کھینچ کر رکھو، تمہارا علاقہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔''

موسیٰ نے جھٹ اپنے ننگے پاؤں سے لکیر کھینچ دی۔

''یہ لو بس، اب تم ادھر رہو اور یہیں سے ہی گھر کی طرف پھوٹ جاؤ۔''

میں اس کے اتنی جلدی کیے ہوئے فیصلے پر روہانسی ہو گئی۔ ''لیکن میں کیوں نہیں آؤں، تمہارے علاقے میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔''

یہ لفظ ''سرخاب'' اکثر امّاں کو بولتے ہوئے میں نے سنا تھا۔ میں اٹک اٹک کر غصے میں بول رہی تھی لیکن موسیٰ تڑکا۔

''چل بھاگ ادھر، جہاں تیرے علاقے کے لڑکے لڑکیاں کھیل رہے ہیں۔ یہ ربن یہ جوتے اور یہ تیری چمکتی ہوئی فراک۔۔۔'' اس نے ایک پتلی سی چھڑی سے جو اس کے ہاتھ میں پہلے سے تھی، میری فراک ربن اور جوتوں کو اپنے تئیں ٹھونکتے ہوئے کہا۔ ''چل بھئی، بھاگ ایسا ادھر کچھ نہیں ہے۔''

''تُو تو پاگل ہے،'' میں نے موسیٰ کو بہت غصے میں گھورتے ہوئے کہا۔

پہلی دفعہ کوئی چہرہ اتنے غور سے میں نے دیکھا تھا۔ اس وقت چھٹی کلاس میں پڑھ رہی تھی، مجھے بہت سی استانیاں بعض دفعہ گھڑک چکی تھیں۔ امّاں ابّا کی بھی کبھی کبھی جھڑکیاں پڑتی رہتی تھیں لیکن اس لہجے میں، یہ لڑکا مجھ سے پہلی بار مخاطب ہوا تھا اور پھر اتنا گندا۔ میرا خیال یہی تھا کہ گندے بچے ہمیشہ دب کر رہتے ہیں۔ اس کی اکڑ دیکھ کر غصے کے ساتھ ساتھ میرے دل میں جانے کیوں دھیمی سی

خوشی اٹھ رہی تھی، لیکن ساتھ ہی میرا دل لڑنے کو بھی چاہنے لگا۔

''مٹاؤ اس لکیر کو۔ میں جہاں چاہوں گی لگاؤں گی۔'' میں نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

وہ دھکا کھا کر پیچھے کی طرف لڑھکا، اور سنبھلتے ہوئے اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور پھر ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے بے حال سا ہو گیا۔ میں اس جوابی کارروائی کے لیے تیار نہیں تھی۔ مجھے تو یہ پتا تھا کہ وہ سختی سے اپنا پاؤں اس لکیر پر رکھ دے گا، یا پھر مجھے دھکا دے گا۔ اس کی ہنسی سے میں پریشان ہو گئی تھی۔ میں اسے ہنستا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ کے لڑکے جو اس علاقے میں اسی جیسے گندے، اس کے اردگرد آ کر کھڑے ہو گئے تھے، پہلے تو اسے تکتے رہے پھر وہ بھی ہنسنے لگے اب سب کی ہنسی نے مجھے شرمندہ سا کر دیا۔

''کیوں ہنس رہے ہو؟'' میں چلائی۔

وہ ہنسی ختم کر کے مجھے دیکھنے لگا۔

''تم نے وہی کیا جو تمہارے علاقے کے بڑے لوگ ہمارے ساتھ کرتے ہیں۔ تم اتنی چھوٹی سی تو ہو اور دھکا بڑوں کی طرح دیتی ہو۔ اتنی جلدی سیکھ گئیں یہ سب کچھ۔''

مجھے اس کی باتیں اپنے تمام تر معنوں کے ساتھ سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ لیکن موسیٰ کا چہرہ یہ ساری باتیں کرتے ہوئے مجھے گندہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اور چمک رہا تھا اس کی بڑی بڑی آنکھیں، گھونگریالے بال اور تیکھی نوکیلی ناک، میں غور سے دیکھ رہی تھی۔

ایک دم میرا دل اس سے دوستی کرنے کو چاہا، میں نے لکیر جلدی سے اپنے سفید پالش کیے ہوئے جوتوں سے مٹا دی۔

''دوستی کرو گے؟'' اپنی دو انگلیاں ملا کر میں نے ہونٹوں سے لگائیں اور اس کی طرف بڑھا دیں۔

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے گھورا، پھر آہستہ سے اپنی دوستی والی انگلیاں اپنی کمر سے اس طرح صاف کیں جیسے چھری کو تیز کرتے ہوئے کسی پتھر یا زمین پر رگڑتے ہیں اور اپنی سمٹی ہوئی دو انگلیوں کو میری طرف بڑھایا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ انگلیاں موسیٰ کی نہیں تھیں۔ وہ تو میری انگلیاں تھیں۔ میں نے اپنے ہی لمس کو اس کی انگلیوں میں محسوس کیا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

میرا نام اسکول میں امّاں نے یہ لکھایا تھا، میں نے اسکول میں پکارے جانے والا نام اسے بتایا۔

''تمہارے دو نام ہیں؟'' اس نے منہ آگے کی طرف کر کے پوچھا۔

''نہیں! ابّا مجھے گھر میں پیار سے پکارتے ہیں۔'' میں نے گھر کا نام بھی بتا دیا۔

''چلو ٹھیک ہے دیکھیں گے کون سا نام پکارنے میں اچھا لگتا ہے۔''

میں ہنسنے لگی۔ مجھے یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ وہ سارا واقعہ میرے ذہن میں آج بھی ازبر ہے۔ اگرچہ کہ وہ نقشہ نہیں کھینچ پا رہی ہوں، جو موسیٰ کے چہرے سے اٹھ کر میرے حواسوں پر نقش ہو رہا تھا۔

☆

کچھ چیزیں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں، لیکن پھر بھی ان میں سے کچھ کو میں بھول جاتی تھی۔ کچھ ایسی ہوتی تھیں جو دیر تک یاد رہتی تھیں جیسے اپنے باپ کے کندھے پر بیٹھ کر سمندر دیکھنا۔ سمندر مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ کبھی کبھی تو ہوک سی اٹھتی تھی اور میں ابّا کی ٹانگوں سے لپٹ کر ضد کرتی کہ مجھے سمندر پر لے چلیں۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ لہٰذا وہ میری زیادہ سے زیادہ فرمائش پوری کرنے پر مجبور ہوتے۔ اکثر وہ مجھے ہر وقت اس طرح دیکھتیں تھیں جیسے میں ان کی کوئی قیمتی شے ہوں، جسے انہیں سنبھال کر رکھنا ہے۔ وہ میرے کپڑوں لتوں کے ساتھ ساتھ میرے لیے خواب بھی دیکھتیں تھیں۔

جب وہ میرے پاس لیٹی ہوتیں تو کہتیں ''جب تو بڑی ہو گی تو میں تیرے لیے ہیروں کا سیٹ بنواؤں گی، تجھے دھوم دھام سے بیاہوں گی اور تجھے اتنا جہیز دوں گی کہ۔۔۔''

میں جہیز، دھوم دھام اور ہیرے کے سیٹ سے مانوس نہیں تھیں لہٰذا ان کی بہت سی نصیحتوں کی طرح میں ان خوابوں کو بھی ایسے ہی سنتی، جیسے وہ مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہوں۔

لیکن اب مجھے سڑک پر چلتے ہوئے، سمندر پر نہلاتے ہوئے عجیب عجیب باتیں کرتے۔ ''دیکھو یہ آسمان جو ہے اس کا کوئی کنارہ نہیں ہے یہ انسانوں کے خوابوں جیسا ہے اور یہ سمندر جو آسمان سے مل رہا ہے، وہاں، وہ دور۔۔۔'' وہ اشارہ کرتے اور میں اس اشارے کی طرف اپنے پنجوں کے بل اونچی ہو کر دیکھتی۔ ''وہ کبھی نہیں ملتا، بس ہمیں نظر آتا ہے۔''

میں بھی ابّا سے بے اندازہ سوالات کرتی جاتی۔ کسی کا جواب وہ دیتے اور کسی کا نہیں دے پاتے۔ اس عرصے میں مجھے بھی جو یاد رہ گیا ہے میرے احساس کا حصہ ہے، ایسے ہی جیسے موسیٰ کے چہرے کے نقوش جو پہلی بار میری آنکھوں میں اُترے تھے۔

میں جب اس میدان سے واپس ہو رہی تھی تو دل میں پہلی بار دیر سے گھر لوٹنے کا خوف تھا۔

میں نے موسیٰ سے کہا ''اپنی لکیر سے ادھر آ جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔''

میدان میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس نے اچک کر لکیر پار کی جو میں پہلے ہی مٹا چکی تھی۔ اور میرے ساتھ ننگے پاؤں ہی گھر تک پہنچا۔ باہر دروازے سے لگی میری ماں کھڑی تھی۔ امّاں موسیٰ کو دور سے آتے دیکھ چکی تھیں۔

''یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ امّاں نے حقارت سے اچٹتی سی نظر ڈالی۔

''چہارسُو''

میں نے موسیٰ کو دیکھا۔ موسیٰ بے خوفی سے امّاں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کون ہے یہ؟'' امّاں نے زور سے پوچھا۔

''امّاں یہ موسیٰ ہے، وہاں رہتا ہے۔'' میں نے انگلی کے اشارے سے ان جھونپڑوں کی طرف اشارہ کیا، جہاں وہ رہتا تھا، جواب دور سے ٹمٹماتے ہوئے جگنوؤں کی طرح اندھیرے میں نظر آ رہی تھیں۔ امّاں نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے اپنی طرف گھسیٹا۔

''شام ہو رہی ہے، دونوں وقت مل چکے ہیں۔ تم نے اتنی دیر کہاں کر دی؟''

میں نے دیکھا، موسیٰ واپسی کے لیے قدم بڑھا چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ واپس لوٹ رہا تھا۔ پہلی بار مجھے امّاں اچھی نہیں لگیں۔ انہوں نے موسیٰ کو اندر آنے کے لیے نہیں کہا۔ موسیٰ تو میرا دوست بن چکا تھا۔ حالانکہ جب میری کلاس کا کوئی لڑکا یا لڑکی میرے گھر آتے تو امّاں خوب آؤ بھگت کرتی تھیں۔ آخر مجھ سے ضبط نہیں ہو سکا۔

''امّاں تم نے موسیٰ کو اندر آنے کے لیے نہیں کہا۔''

''وہ، اس گندے لڑکے کو، تم اس کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ اس کے پاؤں میں جوتی تک نہیں تھی۔ اور دیکھا تم نے کتنے گندے پاؤں تھے اور کپڑے، کپڑوں سے بدبو آ رہی تھی۔''

میں ان کو جیسے ایک ہی سانس میں بولتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی امّاں نے اندھیرے میں موسیٰ کا چہرہ نہیں دیکھا ہوگا۔ اپنے تھکے قدموں سے میں پھر امّاں کے پیچھے پیچھے گھر کے اندر آ گئی۔

امّاں اس دن دیر تک نصیحتیں کرتی رہی۔ ان لوگوں کے ساتھ مت کھیلو، ان سے مت ملا کرو، ان لوگوں کی عادتیں اچھی نہیں ہوتیں، یہ اول فول زبان استعمال کرتے ہیں لالچی ہوتے ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ اور میں اس دوران سوچتی رہی امّاں ایسا کیوں کہہ رہی ہیں، امّاں کو ایسی کون سی بات موسیٰ کی بری لگی۔ جب کہ راستے بھر موسیٰ نے ایسی کوئی زبان نہیں استعمال کی جو مجھے بری لگی ہو۔

اور میں دیر تک اس بالکونی میں کھڑی رہی جہاں دور سے مجھے وہ میدان اور اس کے کونے میں وہ جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں، جن کے قریب دن میں دھول اڑتی رہتی تھی لیکن رات میں ان کے اندر جلنے والی لالٹینیں دور سے اندھیرے میں کہیں کہیں سے جھانکتی ایسی نظر آتی تھیں جیسے ننھے ننھے چراغ ہوا میں جل بجھ رہے ہوں۔ میں وہاں دیر تک کھڑی رہی اور سوچتی رہی موسیٰ ان میں سے کسی ایک جھونپڑی میں موجود ہوگا، وہ جو میرا نیا نیا دوست بنا ہے۔

امّاں کی نصیحتیں کام نہیں آئیں۔ موسیٰ سے میرا میل جول بڑھنے لگا۔ میں نے اسکول سے آنے کا وہ راستہ اختیار کیا، جہاں سے موسیٰ کا علاقہ قریب تھا۔ میں اکثر اسی راستے میں آتی اور موسیٰ سے میری ملاقات اکثر ہوتی۔ موسیٰ بھی شاید میرے ہی انتظار میں کھڑا ملتا۔ اس کے چہرے پر چڑھی ہوئی اداسی کی تہہ پر مجھے ایسا لگتا کہ مجھے دیکھ کر اس پر موہوم مسکراہٹ آ جاتی۔ ہم دونوں دیر تک اس میدان کا چکر لگاتے اور باتیں کرتے۔ وہ باتیں، جو موسیٰ کرتا وہ میرے لیے نئی نئی ہوتیں۔ مجھے اچنبھے میں ڈالتی جاتیں۔ جنہیں میں بعد میں دل ہی دل میں دہراتی اور یاد رکھنے کی کوشش کرتی۔

لیکن جب میں، اس وقت پر جو اسکول سے پہنچنے کا ہوتا گھر نہیں جاتی، تو امّاں بلبلا اٹھتیں اور دیر تک مجھے اپنی نصیحتوں کی زد میں رکھتیں۔

☆

میدان کے اس کونے میں جہاں موسیٰ اپنی چھوٹی انگلی سے زمین کھود رہا تھا وہاں ایک چھوٹا سا گڑھا بنتا جا رہا تھا۔ موسیٰ ہمیشہ جب کچھ نہیں کر رہا ہوتا تو اس گڑھے کو کھودنے بیٹھ جاتا۔

آج بھی موسیٰ گڑھا کھود رہا تھا اور میں اس سے چندرا چندرا کر سوال کر رہی تھی۔ ''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس جگہ خزانہ ہے۔''

مجھے یقین تھا کہ موسیٰ میرے سوال کا جواب نہیں دے پائے گا لیکن اس نے اپنی ناک قمیض کے دامن سے پونچھتے ہوئے سر اٹھایا اور اپنی سفید سفید آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر غرّایا۔

''جس خزانے کی مجھے تلاش ہے وہ اسی زمین کے نیچے ہے۔'' اس نے ان لفظوں کو چبا کر کہا۔

''لیکن تم کیا کرو گے اس کا؟''

''میں، میں اس خزانے سے اپنے علاقے کی جھونپڑیاں تڑوا کر پکے گھر بنواؤں گا اور ایک اسکول، جہاں میرے علاقے کے بچے مفت پڑھا کریں گے۔ انہوں نے اسکول کی شکل نہیں دیکھی ہے۔ میں اتنا خزانہ نکال لوں گا کہ روز کام پر جانے والے لوگ جنہیں جب کام نہیں ملتا، تو ان کے بچے بھوکے سوتے ہیں، میں انہیں پیسے دوں گا اور۔۔۔ اور ایک ہسپتال بنواؤں گا جہاں میرے علاقے کے لوگ جب بیمار ہوں گے تو جائیں گے۔ وہاں ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں ہوگا جو اب سرکاری ہسپتالوں میں ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ہسپتالوں کے عملے کی بے دردی اور بے رحمی کے ہاتھوں نہیں مریں گے۔''

میں نے اس سے پوچھا بھی تھا، کیا سچ مچ ایسا ہوتا ہے۔ وہاں کوئی ایسا نہیں ہوتا جو ان کو مرنے سے بچائے۔

''نہیں۔ وہ غریبوں کو اس حالت میں اس طرح دیکھتے ہیں جیسے سڑک پر کسی کتے کو۔ جب بڑی ہو جانا تو ضرور جانا۔ وہاں ڈاکٹر بھی غریب مریضوں کو سسکتا ہوا دیکھ کر منہ موڑ لیتے ہیں۔ مریض ہسپتال کے چکر لگا کر ہی مر جاتا ہے۔''

موسیٰ اب ٹہلنے لگا تھا۔ میرے حساب کے ٹیچر کی طرح اس کے ہاتھ

پیچھے کمر سے بندھے ہوئے تھے۔اس کی آنکھیں دور خلا میں کچھ گھور رہی تھیں یا ہسپتال بنتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

کچھ دیر وہ سر جھکا کر خاموشی سے ٹہلنے لگا۔اور میں اس کے ادھر سے اُدھر ہوتے ہوئے قدموں کی دھمک سن رہی تھی جو اس کے پاؤں میں جوتا نہ ہونے کے باوجود ایسی تھی جیسے اس نے وزنی جوتے پہنے ہوں۔اس کا چہرہ شاید دھوپ کی وجہ سے نہیں۔بلکہ اپنے ارادوں کی کھلبلاہٹ سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

''دیکھو'' وہ پھر بولا''میرے علاقے کے لوگ جب بیماری سے مر رہے ہوتے ہیں تو انہیں سرکاری ہسپتالوں میں لاوارثوں کی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔وہ اپنا علاج میرے پیسے سے کروائیں گے۔''

میں حیرت سے منہ کھولے موسیٰ کے شان دار کارنامے سن رہی تھی جواب کرنے جا رہا تھا۔لیکن اس وقت، جب وہ سارا خزانہ اسے مل جائے گا، جسے وہ چھوٹی انگلی سے کھود کر نکالے گا۔

میرا دل دکھی ہونے لگا۔''موسیٰ، پھر تم اس کو رسان، رسان کیوں کھود رہے ہو، کہیں سے پھاوڑا لاؤ، میں بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔''

''نہیں بے وقوف، یہ خزانہ ایسے ہی نکلتا ہے، اسے نکالنے میں بہت وقت لگتا ہے اور اگر کسی اور کو معلوم ہو گیا تو وہ اس خزانے کو اڑا کر لے جائیں گے، یا پھر روک دیں گے۔کون چاہے گا کہ ہماری زندگیاں تبدیل ہوں۔''

میں دیکھ رہی تھی کہ موسیٰ کے چہرے پر جو سنجیدگی تھی وہ اس کی عمر کے کسی بھی لڑکے میں مجھے کبھی نظر نہیں آئی۔وہ بولتے ہوئے کچھ کچھ ابّا کی طرح نظر آ رہا تھا۔ابّا کی بھی اکثر باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں جس طرح موسیٰ کی آج کی باتیں میں سمجھ نہیں پا رہی تھی لیکن میرے دل میں کچھ عجیب سا ہونے لگا تھا، ایسے جیسے ہوا کے جھکڑ چل رہے ہوں کہیں دور، اور ان کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی ہوں۔

''موسیٰ، پھر تو یہ خزانہ بہت دیر سے نکلے گا'' میں نے بے تابی سے کہا۔''جب تک تم بوڑھے بھی ہو جاؤ گے اور پتا نہیں میں کہاں ہوں۔''

موسیٰ دوبارہ مٹی کھودنے بیٹھ گیا تھا، اور اس مٹی کو جھاڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا''کوئی دوسرا یہ کام شروع کر دے گا۔آخر تبدیلی تو آنی ہے، کیا ہم ہمیشہ ایسی ہی زندگی گزاریں گے؟ کبھی تو میرے جیسے لوگوں کے پاؤں میں جوتے بھی ہوں گے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے پاؤں کی طرف گھورا، جو پہلے سے زیادہ زخمی اور میلے نظر آ رہے تھے۔

☆

میل خورہ قالین

ایک روز شہاب صاحب کی اپنی بیگم سے قالین خریدنے کے معاملے پر تکرار ہو گئی۔شہاب صاحب سفید قالین خریدنا چاہتے تھے جبکہ بیگم کو اعتراض تھا۔شہاب صاحب لکھتے ہیں:

"عفت اٹھ کر بیٹھ گئی اور استانی کی طرح سمجھانے لگی۔

ہمارے ہاں ابن انشاء آتا ہے پھسکڑا مار کر فرش پر بیٹھ جاتا ہے ایک طرف مالٹے دوسری طرف گنڈیریوں کا ڈھیر۔

جمیل الدین عالی آتا ہے فرش پر لیٹ جاتا ہے سگرٹ پر سگرٹ پی کر ان کی راکھ اپنے اردگرد قالین پر بکھیر دیتا ہے۔ ایش ٹرے میں نہیں ڈالتا۔

ممتاز مفتی ایک ہاتھ میں کھلے پان دوسرے میں زردے کی پڑیا لیے آتا ہے۔

اشفاق احمد قالین پر اخبار بچھا کر تربوز چیرنا پھاڑنا شروع کر دیتا ہے۔

ملتان سے ایثار راعی آم اور خربوزے لے کر آئے گا۔ڈھاکہ سے جسیم الدین کیلے اور رس گلے کی ٹپکتی ہوئی پیٹی لے کر آئے گا وہ یہ سب تحفے بڑے تپاک سے قالین پر سجا دیتے ہیں۔

سال میں کئی بار سید ممتاز حسین بی۔اے ساٹھ سال کی عمر میں ایم۔اے انگلش کی تیاری کرنے آتا ہے اور قالین پر فاؤنٹن پین چھڑک چھڑک کر اپنی پڑھائی کرتا ہے۔

صرف ایک راجہ شفیع ہے جب کبھی مکئی کی روٹی اور ساگ مکھن گاؤں سے لاتا ہے تو آتے ہی قالین پر نہیں اٹھلتا بلکہ قرینے سے باورچی خانے میں رکھ دیتا ہے کیونکہ وہ نہ شاعر ہے نہ ادیب بلکہ ہمارے دوستوں کا دوست ہے۔

عفت کی بات بالکل سچ تھی لہٰذا ہم نے صلح کر لی اور ایک میل خوردہ رنگ کا قالین خرید لیا گیا"

"نشاطِ زیست"

نعت رسول مقبول ﷺ

ہے کیسا معجزہ اسمِ نبی ﷺ کا!
کہ گھر روشن ہوُا ہے مدحتی کا

درِ آقا ﷺ پہ میری حاضری کا
عجب لمحہ تھا وہ خوش قسمتی کا

ہوئی مجھ پر خُدا کی مہربانی
کہ اُس نے کر دیا مجھ کو نبی ﷺ کا

مدینے کی طرف جانا ہے مُجھ کو
"تعاقب کر رہا ہوں روشنی کا"

تسلسل اب بھی ہے کون و مکاں میں
وہی غارِ حرا کی روشنی کا

مِرے آقا ﷺ، بہت بھٹکا ہوُا ہوں
مگر مَیں ہوں سدا سے آپ ﷺ ہی کا!

بڑا ویران ہوتا جا رہا ہوں
دوبارہ اذن دیجے حاضری کا

مِری آنکھوں میں روشن ہے ابھی تک
ہر اِک منظر وہاں کی ہر گلی کا

نسیم سحر
(راولپنڈی)

نعت رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم

رضائے رب سے اگر جسم و جاں میں رہنا ہے
محمدِ عربی کے جہاں میں رہنا ہے

نشاط زیست ہے خاکِ مدینہ میرے لیے
وہ خوش رہیں جنہیں ہفت آسماں میں رہنا ہے

یہ کائنات بنی ہے حضور کی خاطر
تصورِ خبرِ کُن فکاں میں رہنا ہے

شفاعتوں کا وسیلہ ہیں تاجدارِ حرم
دعائیں کرنی ہیں، اشکِ رواں میں رہنا ہے

جو صرف مدحتِ ختم الرسل کرے پیہم
ہمارے نطق کو ایسی زباں میں رہنا ہے

درود بھیجتے رہنا ہے اور بفضلِ خدا
عنایتوں کے یمِ بیکراں میں رہنا ہے

میں مشتِ خاکِ تمنا ہوں شازیہ اکبر
مگر مجھے حرمِ زر فشاں میں رہنا ہے

شازیہ اکبر
(اسلام آباد)

رخصتِ سحرگاہی

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

وہ رات اس کے بیاہ سے ایک دن پہلے کی رات تھی۔

نیند اس سے کوسوں دور تھی وہ اپنے نرم نرم بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بستر میں کانٹے چبھے ہوئے ہوں۔اس کا دل ایک نا معلوم خوف سے دھڑک رہا تھا۔اس کی روح اپنے بوجھل بدن سے نکل کر کمرے کی ہر بڑی چھوٹی چیز سے لپٹ لپٹ کر روتی ہوئی، گھر کی دیواروں سے گلے ملتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

نصف سے زیادہ رات تک پورا گھر جاگتا رہا تھا دھوم دھام، چہل پہل، گہما گہمی، گانا بجانا ہوتا رہا تھا۔اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔رات کا سناٹا دبی دبی سرگوشیاں کر رہا تھا۔ برابر ہی ایک چارپائی پر اس کی دادی موٹی سی رضائی میں سمٹی سمٹائی گٹھری سی بنی پڑی تھیں۔ان کے خراٹے کمرے اور دالان میں چھائے ہوئے خوابناک سکوت کو چونکا چونکا دیتے۔ برابر والے کمرے میں اس کا باپ، ماں اور چھوٹا بھائی اور دالان میں مہمان عورتیں اور بچے سوئے ہوئے تھے۔لمبی بوجھل رات اس کے دل پر چٹان کی مانند چھا گئی تھی۔وہ بار بار پہلو بدلتی رہی، جلتی آنکھوں سے خلاء میں نجانے کیا تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔اس کے کمرے کے بڑے سے طاق میں ایک چھوٹی سی لالٹین روشن تھی، ہلکی ہلکی روشنی کی زرد کرنیں تاریکی کے پردے پر جال سا بن رہی تھیں۔دالان میں ایسی دو اور لالٹین اندھیرے سے کشمکش کر رہی تھیں۔ایک اس کے کمرے کے دروازے کے پاس اور دوسری کچھ فاصلے پر دالان سے صحن تک پہنچنے والی سیڑھیوں کے نزدیک رکھی تھی۔

وہ آہستہ سے اٹھی، پلنگ پر سے اتر کر دالان میں سوئی عورتوں اور الٹے سیدھے پڑے ہوئے بچوں سے بچتی بچاتی دالان کی سیڑھیوں تک پہنچ گئی۔ اس نے سیڑھیوں کے ساتھ رکھی ہوئی گھڑونچیوں پر ہاتھ رکھا احساسات کی انگلیوں سے ان مٹکیوں کو چھوا پھر اس کی نگاہیں سیڑھیوں پر سے اتر کر آنگن میں پھیل گئیں۔وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔چاروں اور رات کا پورا تسلط تھا۔تاریکی سائیں سائیں کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، اس نے آنکھیں ملیں اور غور سے تاریکی میں جھانکا۔اسے نہ تو بیچ آنگن میں کھڑا امرود کا درخت نظر آیا اور نہ اسکی نگاہیں اس پیڑ تک پہنچ سکیں جس کے سائے میں اس کی پیاری لیلیٰ اس کی مانند جاگ رہی تھی یا شاید نیند کے آغوش میں پہنچ گئی تھی۔اس نے باہر کی جانب اپنے کان لگائے کہ شاید لیلیٰ کی گردن میں پڑے ہوئے گھنگھرو بج رہے ہوں۔لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دیا۔اس نے ڈالیوں اور پتوں کی سرسراہٹ کی آہٹ لی لیکن وہاں سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا البتہ جھینگروں کا شور اس کے اعصاب پر ابھرنے لگا۔

رات کے چار بج گئے صبح کاذب کی ہلکی سی روشنی سارے آنگن میں رینگنے لگی۔امرود کے پیڑ کی ڈالیاں، ٹہنیاں، پتوں کے جھنڈ کسی غیر مرئی مخلوق کی مانند دکھائی دینے لگے۔آسماں پر دودھ کے چھینٹے پڑ گئے اور دور آنگن کے ایک کنج میں پیڑ کا سایہ کسی لاٹھی ٹیک کر چلنے والے بوڑھے کی مانند دکھائی دینے لگا۔اس کی نگاہیں نیچے اتریں لیلیٰ کا سفید بدن کسی معصوم فرشتے کا روپ دھارے پیپل تلے کھڑا تھا۔وہ یونہی سوچتی رہی۔اسے اچانک خوف ہوا اگر اسے کسی نے یہاں دیکھ لیا تو کیا سوچے گا۔؟

دوبارہ تاریکی اپنے کالے کالے پر پھلانے لگی تو اسے اطمینان ہوا۔ وہ اٹھی اور آنگن کی ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی پر چلنے لگی۔سردی کی ایک لہر پیروں سے دماغ تک پہنچ گئی اور آنکھوں میں سلگتے ہوئے اشکوں کے دیپ ٹمٹمائے مگر جلد ہی سرد ہوا کے جھونکوں نے انہیں بجھا دیا۔

وہ اپنے دل میں احساسات کو لہریں مارتا ہوا محسوس کر رہی تھی لیکن اس جذبے کی وہ کوئی تفسیر نہیں کر سکتی تھی جس نے اس مایوں بیٹھی دلہن کو اس کے پیروں پر اتنی رات گئے کھڑا کر دیا تھا۔

آج وہ اس گھر سے رخصت ہو رہی ہے۔وہ اس گھر کو، لیلیٰ کو، پیپل کے پیڑ کو، امرود کے درخت کو، اپنے بابا کو، ماں کو، بھائی بہنوں کو، سکھیوں کو، اپنے آرزوؤں اور ارمانوں کو سب کو چھوڑ کر جا رہی ہے۔

جھینگروں کا شور دب گیا۔امرود کی ڈالیاں، ٹہنیاں، پتے سب آہستہ آہستہ ہلنے لگے، مٹی کی ہلکی ہلکی خوشبو ماحول میں جذب ہونے لگی۔ہلکی ہلکی سرمئی روشنی تمام فضا میں پھیلنے لگی۔اس کے اپنے ننگے پاؤں کی دھیمی چاپ اس کے احساسات میں بلند ہوگئی وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گھروندے کے چبوترے تک گئی جہاں وہ اپنی سکھیوں حنا، سارا، زینب اور گلابو کے ساتھ ہنڈکلیا کھیلتی تھی، اپنی گڑیا کی شادی کرتی تھی اور جب وہ اپنی گڑیا کو رخصت کرتی تھی تو سچ مچ بہت روتی تھی۔سب اس کا مذاق اڑاتیں، زینب اس کو لپٹا لیتی اور کہتی:

''تو نہ رو، جب کہے گی تیری دھی کو تیرے پاس بھجوا دونگی''۔اس کا جی چاہا دروازہ کھول کر باہر نکل جائے اور آزاد پنچھی کی طرح گاؤں کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ اڑتی پھرے۔

اچانک لیلیٰ کی گردن میں پڑی گھنٹی نغمہ بار ہوگئی۔ ننھے گھنگرو گنگنانے لگے اور سارا ماحول موسیقی کے تاروں پر رقص کرنے لگا۔مہر النساء سے مزید ضبط نہ ہو سکا۔اس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا دوڑتی ہوئی آگے بڑھی ،لیلیٰ سے لپٹ گئی اور اس کے کانوں میں سرگوشی کرنے لگی ''لیلیٰ! آج میں دلہن بنائی جاؤنگی، ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہونگی، باجے بج رہے ہونگے، بوڑھے

مسکرا رہے ہونگے ، جوان قہقہے لگا رہے ہونگے ، بچے تالیاں بجا بجا کر ناچ رہے ہونگے ،مہاجن رام لعل جس سے ابّا نے میرے بیاہ کے لئے قرض لیا ہے اصل اور سود کے حساب کتاب پر جی ہی جی میں خوش ہو رہا ہوگا۔۔۔بولتے بولتے وہ ایک دم چپ ہوگئی اس نے دیکھا لیلیٰ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔''لیلیٰ! تو رو رہی ہے تو نے بھی میرے دکھ کو محسوس کر لیا۔'' یہ کہکر اس نے اپنی باہیں لیلیٰ کی گردن میں حمائل کر دیں۔

سسکیوں اور آہوں سے بھری ہوئی رات جلد جلد وقت کی پگڈنڈیوں پر دوڑنے لگی۔درختوں کی ٹیڑھی میڑھی ڈالیوں پر پتوں کے نیچے سوئی ہوئی چڑیاں جاگیں اور ساتھ ہی ان کے چہچہے بھی جاگے۔مہرانساء کی باہیں لیلیٰ کے گلے سے جدا ہوئیں ، بوجھل پاؤں سے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی وہ اندر کی طرف چلی گئی۔ دالان میں سب لوگ اسی طرح سوئے ہوئے تھے۔دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے کمرے میں قدم رکھا،اس کی دادی بھی اسی طرح بے ہوش پڑی سو رہی تھی۔۔۔

نیم روشن، نیم تاریک ماحول میں مہرانساء کی ماں کا تھکا تھکا سا بوڑھا جسم دھیرے دھیرے اجاگر ہوتا چلا گیا جیسے وہ عدم وجود سے اچانک وجود میں آیا ہو۔مہرانساء کی چارپائی کے سرہانے پہنچ کر اس وجود کا بوڑھا جسم تھوڑا سا آگے کی جانب جھکا۔مہرانساء چارپائی پر بے سدھ پڑی تھی۔اس وجود نے اپنی بیٹی سے سرگوشی کے لہجے میں کہا،''بیٹی ہمیں معاف کر دینا۔ہم نے تو پوری برادری کے سامنے تجھے شہاب الدین کے نام کر دیا تھا۔سب ہی جانتے تھے کہ تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو مگر کیا کریں۔۔۔زمیندار کے بندوقوں والے آئے ،گلی میں ہمارے گھر کے چاروں گوشوں میں بندوقیں چلا کر اعلان کر دیا'' مہرانساء زمیندار صاحب کے بیٹے کی ہوئی۔۔۔سب خبردار ہو جاؤ۔۔۔''جس لڑکی کے لئے بندوقیں والے اعلان کرتے ہیں اس کا رشتہ کوئی نہیں لاتا۔شہاب کے لوگ بھی پیچھے ہٹ گئے یہی شاید رب کی مرضی ہے۔۔۔اس وجود نے بیٹی کے آگے ہاتھ جوڑے اور آگے بڑھ کر اسکی پیشانی کو چوما ، جو بے جان اور سرد تھی ۔ ۔۔۔قریبی مسجد میں فجر کی اذان بلند ہوئی۔تڑکا ہوا دن نکل گیا۔ایک ایک کر کے سارے سونے والے جاگ اٹھے۔مہرانساء نہیں جاگی ، کیسے جاگتی۔۔۔وہ اپنی رخصتی سے پہلے ہی رخصت ہو چکی تھی۔اس نے اپنی جان دے کر زمیندار اور اس کے کارندوں کی بندوقیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے کار کر دی تھیں۔

''آخری نشانی''

تم اپنی بیوی سے پہلی بار کیسے ملے؟ میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔

''کتے کی وجہ سے''

کتے کی وجہ سے؟؟؟ میں نے حیران ہو کر کہا۔

ہاں! کتے کی وجہ سے۔

میں اپنے کتے کو لے کر عصر کے بعد پارک میں سیر کیلئے جا رہا تھا۔وہ راستے میں ملی، مجھ سے پوچھا کتا بیچو گے؟؟ میں نے کہا نہیں۔

تھوڑی دیر ہم میں گفتگو ہوئی، ایک دوسرے کے موبائل نمبر ہم نے لیے اور اپنے اپنے راستے چل دیے۔

شاواشے ... پھر؟؟

پھر ہم روزانہ فون پر گفتگو کرتے ، وہ مجھ سے کتے کے بارے میں پوچھتی۔۔۔اُسے وہ بہت پسند تھا۔

ایک دن ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم شادی کر لیتے ہیں، اس طرح کتا ہم دونوں کا ہو جائے گا۔چنانچہ ہم نے شادی کر لی۔چند سال گزر گئے۔اس دوران ہمارے ہاں ایک بیٹا اور بیٹی پیدا ہوئے۔

ارے واہ۔۔۔پھر؟

پھر ایک دن کتا مر گیا۔

میں نے بیگم سے کہا کہ کتے کی وجہ سے تم نے مجھ سے شادی کی تھی۔وہ مر چکا ہے۔کیا مجھے چھوڑ دو گی؟

''ہرگز نہیں۔۔۔میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی''۔بیوی نے انکار کر کے مجھے تسلی دی۔

کیوں؟؟؟ میں نے خوش ہوتے ہوتے پوچھا۔۔۔

''تم مرحوم کی آخری نشانی ہو نا''

بیگم نے جھٹ سے جواب دیا۔

سرد موسم کی تپش

اسرار گاندھی
(الٰہ آباد)

اسے اپنے سامنے کھلی ہوئی کھڑکی سے اونچے اونچے پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ ان پہاڑوں کے درمیان سے دھوئیں کی صورت میں آہستہ آہستہ بادل اوپر اٹھ رہے تھے۔ ہوا ٹھنڈی ہو چلی تھی۔ لگتا تھا کہ شاید اس گرمی سے نجات ملنے والی ہے جو پچھلے کچھ دنوں سے عذاب بنی ہوئی تھی۔ اس علاقے میں ایسی گرمی کبھی ہی کبھی پڑتی ہے۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سوچنے لگا کہ مجھے دہرہ دون آئے ہوئے آج کوئی پندرہ دن ہوئے ہیں۔ شاید پندرہ مہینے یا پھر پندرہ برس۔

یہاں آنے کے لئے اس دن جب میں ہری دوار پہنچا تھا تو سورج کی آخری کرنیں بھی غروب ہو رہی تھیں۔

بیٹا اسٹیشن کے باہر ہی مل گیا تھا، وہیں ہم لوگوں نے چائے پی اور دہرہ دون کے لئے نکل پڑے۔

اب دن کا اجالا سیاہی مائل ہو چکا تھا۔

''بیٹا بہت تیز گاڑی نہیں چلانا'' میرے بغل میں بیٹھی ہوئی میری بیوی بیٹے سے بولی۔

''کیوں اماں؟ کیا ہوا؟''

''کچھ بھی نہیں، بس راستے کی خوبصورتی دیکھتے ہوئے چلیں گے۔''

''اوہ اچھا۔ ٹھیک ہے'' بیٹا دھیرے سے بولا۔

حالانکہ بیٹا یہ جانتا تھا کہ ماں کو اس کی ڈرائیونگ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ عمروں کا فرق ایسے ہی رویوں کو جنم دیتا ہے۔

کار ایک خاص رفتار سے چل رہی تھی۔

بیٹا بار بار ماں کو بتاتا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔

ہم لوگ جب دہرہ دون پہنچے تو رات پوری طرح سے خیمہ زن ہو چکی تھی۔

جس علاقہ میں بیٹے کا مکان تھا، خاصہ پاش دکھائی پڑ رہا تھا۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہاں کے تمام مکان چار سو اسکوائر یارڈ پر بنے ہوئے ہیں۔ کافی بڑے بڑے اور کھلے کھلے۔ لیکن یہاں کوئی کسی سے تعلق نہیں رکھتا۔ تمام لوگ اپنی اپنی زندگی گزارتے ہیں۔

یہ پورا علاقہ پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔

''ابا ذرا بائیں جانب نظریں گھمایئے۔''

میں نے بائیں طرف دیکھا تو وہاں ایک خاصہ بلند پہاڑ رنگ و نور میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے بیٹے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ابا یہی مسوری ہے۔''

''اوہ اچھا، رات میں مسوری یوں دکھائی پڑتی ہے۔''

''آپ تو یہاں پہلے بھی آ چکے ہیں؟'' بیٹا اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں، برسوں پہلے میں یہاں ایک بار آیا تھا۔''

''ہاں، ممی نے بتایا تھا کہ آپ گھومنے کے ہمیشہ سے شوقین رہے ہیں۔''

میں کچھ بولا نہیں بس ہنس پڑا۔

پھر تھوڑی دیر بعد ہم لوگ کھانا کھا کر سو گئے کہ تھکان پورے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

معلوم نہیں میں کب تک سوتا رہتا اگر سورج کی پہلی کرن نے آ کر مجھے جگا نہ دیا ہوتا۔

سورج کی یہ کرنیں میرے چہرے کو گدگدا رہی تھیں، میں نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ سوچا کہ ایک نیند اور سو لوں لیکن ہلکی ہلکی خنکی میرے اور نیند کے درمیان حائل رہی۔ میری کیفیت کچھ ایسی تھی کہ نہ میں پوری طور پر جاگ رہا تھا اور نہ سو ہی رہا تھا۔ آخر کار میں اٹھ ہی گیا اور بالکونی پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہوا کے جھونکے مجھے کسی قدر سرد لگے اور میرے اندر موجود نیند کے اثرات پوری طرح سے زائل ہو گئے۔

میں نے بالکونی میں موجود کرسی پر بیٹھ کر چاروں طرف پھیلے ہوئے خوبصورت نظاروں کے درمیان اپنے آپ کو کھوتا ہوا محسوس کیا۔

درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ہوا کی آواز پھیلے ہوئے سناٹے کو مجروح کر رہی تھی۔ ایسے میں مجھے اپنی ایک پیانسٹ دوست شبو یاد آ گئی۔

اس سے میری پہلی ملاقات مسوری میں ہوئی تھی، شاید وہ کوئی سوشل گیدرنگ تھی۔

کسی نے مجھ سے اس کا تعارف کرایا تھا۔

''یہ شہلا ہے، بہت اچھی پیانسٹ'' تعارف کرانے والا اچانک کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اور آپ.....؟'' شہلا نے میری طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔

''یہ قسیم ہیں اور یہ کہانیاں لکھتے ہیں''۔ تعارف کرانے والا ہم لوگوں کی طرف پھر پلٹ پڑا تھا۔

''اوہ''

اس نے کچھ سوچتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ نظریں ملیں۔

اچانک میں بول پڑا ''شہلا صاحبہ اگر آپ کچھ خیال نہ کریں تو کسی ٹیبل پر بیٹھ کر ایک کپ چائے ہو جائے۔''

''چلئے، کوئی مضائقہ نہیں؟'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

ہم دونوں ایک میز پر آ کر بیٹھ گئے۔

چائے کی پہلی چسکی کے ساتھ وہ بولی ''آپ کیسی کہانیاں لکھتے ہیں؟''

''زندگی کی'' میں بڑے اطمینان سے بولا۔

وہ میرے کہنے کے ڈھنگ پر ہنس پڑی۔ پھر بولی:

''زندگی کے بہت سے رنگ ہوتے ہیں۔ آپ کن رنگوں کو اپناتے ہیں۔''

''جو میری گرفت میں آجائیں'' میں نے پھر اسی طرح جواب دیا۔

اس نے اپنی نظریں ہال کی طرف گھمائیں اور ہال کا جائزہ لینے لگی۔ پھر میری طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے بولی ''سچ مچ ہر چیز کی زیادتی بری ہوتی ہے۔''

''مثلاً'' میں اس کی بات کاٹتا ہوا بولا۔

''مثلاً فیشن'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

پھر میں نے پہلی بار اس کو غور سے دیکھا اور اس کی سادہ مزاجی کا اندازہ ہوا۔

وہ اچانک پھر بولی

''قسیم صاحب! نیم عریانیت مکمل عریانیت سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ جب تجسس ختم ہوجائے تو کسی بھی چیز کی کشش اپنے آپ ختم ہوجاتی ہے۔''

''وہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

''دیکھئے اب لڑکیاں تمام سرحدیں پار کررہی ہیں۔''

میں کچھ بولا نہیں صرف اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بولی، ''اچھا چلتے ہیں، آپ سے مل کر سچ مچ بہت اچھا لگا، آگے بھی ملنا چاہوں گی۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ شہلا صاحبہ، مجھے بھی اچھا لگا۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے سے پہلے اپنا موبائل نمبر دے گئی۔

پھر میری اس سے کبھی کبھی ملاقاتیں ہونے لگیں۔

انھیں ملاقاتوں کے درمیان وہ مجھے ایک بار اپنے ساتھ کسی فنکشن میں لے گئی تھی۔ میں نے اسے پہلی بار پیانو بجاتے ہوئے دیکھا تھا اور میں مبہوت ہوکر رہ گیا تھا۔

اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے یہاں کے ایک ہوٹل نے مہینہ بھر کے لئے انگیج کر رکھا ہے۔ اسے ہر رات اپنے فن کو پرفارم کرنا پڑتا ہے۔ پیسے اچھے دے رہے تھے، اس لئے چلی آئی۔ میرے ساتھ میرا بھائی بھی ہے۔ میرے رہنے کا انتظام ہوٹل نے کیا ہے۔

وہ اتنی اچھی آرٹسٹ ہوگی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

پروگرام ختم ہونے کے بعد جب وہ اسٹیج سے نیچے اتری تو سیدھی میرے پاس آئی تھی۔

میں نے بہت ہمت کرکے اسے گلے لگالیا تھا۔

مجھے خیال گزرا تھا کہ شاید یہ اسے اچھا نہ لگے۔ لیکن اس کے کسی رویے سے بھی میں نے ایسا محسوس نہیں کیا۔

کچھ دنوں بعد وہ میرے لئے صرف شہلا رہ گئی اور میں اس کے لئے قسیم۔ اس سے موبائل پر ہر دن باتیں ہونے لگی تھیں۔ ہم دونوں اکثر ملنے بھی لگے تھے۔ کئی کئی گھنٹے ساتھ گھومتے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے، باہوں میں باہیں ڈالے ہوئے۔

انھیں باتوں کے درمیان میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے اندر اس کے لئے کوئی جذبہ بیدار ہو چکا ہے۔ میرے رویوں میں خاصی تبدیلی پیدا ہو چلی تھی اور شاید شہلا بھی اسی کیفیت سے گزر رہی تھی۔

میں نے اس کو شہلا کے بجائے شبو کہنا شروع کر دیا تھا، جو اسے بھی اچھا لگا تھا۔

ایک دن اچانک اس نے مجھ سے کہا تھا ''دیکھو قسیم میں تمہیں صرف اپنا دوست سمجھتی ہوں اور بس۔''

مجھے زوردار جھٹکا لگا تھا۔

''شبو پھر یہ سب محبتیں، اتنا خیال، اتنی چاہت اور...اور.....''

''یہ سب کچھ ایک دوست کے لئے بھی تو ہوسکتا ہے، بولو اس بات کے لئے تمہارے پاس کیا جواب ہے۔''

میں چپ رہا کہ میرے پاس اس بات کا جواب تو واقعی نہ تھا۔

وہ پھر بولی ''تم صرف اور صرف میرے دوست ہو اور میں اپنے دوست کو چاہتی بھی بہت ہوں۔ دیکھو میں نے تم سے یہ بات صرف اس لئے کہی کہ تم کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہوجاؤ اور بعد میں ٹیسیں تمہاری زندگی مشکل نہ کردیں۔

مجھے لگا کہ جیسے میں برف کی سل بنتا جارہا ہوں۔

کئی دنوں تک ہم لوگوں نے آپس میں باتیں نہیں کیں لیکن پھر ایک دن اس کی کال آئی۔ اس نے کئی بار Sorry کہا۔

اسی طرح کئی بار پہلے بھی میرے اور اس کے درمیان من مٹاؤ ہوا لیکن دوستی پہلی جیسی ہی بنی رہی۔

ایک دن دوپہر میں اس کا فون آیا۔

''قسیم آج شام میں تم سے Chatting نہیں کرسکوں گی۔''

''کیوں''

''مجھے ایک میوزک کے مقابلے میں جانا ہے، تم بھی چلو۔''

''نہیں شبو، میں کہیں نہیں جاسکوں گا۔ میں نے ڈاکٹر سے وقت لے رکھا ہے۔ وہاں سے سیدھے میرے پاس ہی چلی آنا۔''

''اگر میں جیت گئی تو ڈنر دوگے؟''

''ہاں کیوں نہیں، میں نے تو اپنے آپ کو تمہیں سونپ دیا ہے۔''

پھر میں جلدی سے بولا ''بحیثیت ایک دوست کے۔''

شبو زور سے ہنسی اور فون کاٹ دیا۔

''کوئی تین گھنٹے کے بعد وہ واپس آگئی، اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے گلے لگاتے ہوئے بولی

''قسیم میں فرسٹ آگئی۔''

''ارے واہ کیا بات ہے شبو، مبارک ہو'' میں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

وہ مجھ سے الگ ہو کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"May I kiss you Shubbu" میں اچانک بولا۔

وہ مجھے ہکا بکا دیکھنے لگی۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی یہ سوال نہ رہا ہوگا۔

اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔

وہ دھیرے سے بولی ''میرے عزیز دوست تم میری پیشانی کو چوم سکتے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

''پیشانی؟''

''ہاں، ہونٹ نہیں''

''کیوں؟''

''کیونکہ ہونٹ کے راستے سے ہی لڑکیاں ذلالت کے دلدل میں غرق ہوتی ہیں۔''

اب اسے ہکا بکا دیکھنے کی میری باری تھی۔

''شبو میں سمجھا نہیں، کیا یہ تمہارا تجربہ بول رہا تھا۔''

''سوال ہی نہیں اٹھتا قسیم، کیا تم مجھے ایسا ہی سمجھتے ہو؟'' اس کے چہرے سے تلملاہٹ عیاں تھی۔

''نہیں، نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ مگر یہ بات.....'' میں اپنی بات پوری کئے بغیر اسے دیکھنے لگا۔

شبو نے اپنی نگاہیں اٹھائیں اور آہستہ سے بولی۔

''یہ تجربہ میری ایک قریب ترین دوست کا ہے، جس نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔ اس کے چاہنے والے نے اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں میں قدرے دیر تک لئے رکھا تھا اور میری دوست جسم سے اٹھنے والے شدید ہیجان کو سنبھال نہ سکی اور آہستہ آہستہ گناہوں کے دلدل میں اترتی چلی گئی اور اس طرح میری دوست ہمیشہ کے لئے اپنی ہی نظروں میں گر گئی۔''

میں نے دیکھا کہ شبو کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

شبو جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی ''قسیم پلیز آئندہ اس طرح کی کوئی ڈمانڈ مت کرنا، پلیز مائی فرینڈ۔''

میں کچھ بولا نہیں، بس اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

شبو بہت نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی واپس جا رہی تھی۔

دروازے سے نکلتے وقت اس نے گھوم کر مجھے دیکھا اور بائی بائی کا اشارہ کرتی ہوئی زور سے بولی

''قسیم ڈنر ڈیو ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دیتا وہ دروازے سے نکل چکی تھی۔

سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گزر گیا۔ میں نے جھرجھری لی۔

پھر جب ڈرائنگ روم کے وال کلاک نے آٹھ بجائے تو میں بالکونی سے اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔

بیوی اب تک گہری نیند میں تھی۔

میں وہاں سے پھر اٹھا اور باتھ روم میں داخل ہو گیا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد میں کچن میں کھڑا اپنے لئے چائے بنا رہا تھا۔

چائے بنانا میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ پچھلے بارہ برسوں سے یہی ہو رہا تھا کہ صبح کی چائے مجھے خود بنانی پڑتی۔

میں چائے کی پیالی لے کر پھر بالکونی میں آ گیا۔

ابھی میں کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ شبو پھر میرے پاس آ گئی۔

''قسیم، میں پرسوں واپس اپنے گھر جا رہی ہوں۔''

''کیوں؟'' میرا سوال حیرت بھرا تھا۔

''میں یہاں صرف ایک مہینے کے لئے ہی تو آئی تھی۔ اب Contract ختم ہو رہا ہے۔''

''کیا تم سچ مچ ہی چلی جاؤ گی۔''

''ہاں... جانا تو پڑے گا ہی۔ گھر میں سب تمہاری شبو کا انتظار کر رہے ہیں۔'' اس کی آواز بھرّا گئی۔

''اوہ!'' میں نے اپنی گردن کرسی سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

''شبو مجھے تو یہاں سے دس دن پہلے ہی چلا جانا تھا۔ لیکن میں تو تمہاری وجہ سے رکا رہا۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں قسیم۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہیں چھوڑ کر مجھے جانا اچھا لگ رہا ہے۔ اس علیحدگی کے خیال سے پورے وجود میں کانٹے چبھنے لگتے ہیں۔''

وہ اٹھی اور میرے سر کو اپنے سینے پر رکھا پھر میری پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ چند لمحوں کے بعد وہ مجھ سے الگ ہٹتے ہوئے بولی

''قسیم میں تم کو کبھی نہ بھول سکوں گی۔ تم نے میری زندگی میں نئے رنگ بھر دیئے ہیں۔ ان رنگوں کے لہریئے بار بار میری آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتے ہیں اور میں بادلی سی ہو جاتی ہوں۔'' وہ ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر بولی

''قسیم مجھے یقین ہے کہ تم بھی مجھے کبھی نہ بھول سکو گے۔ یاد آؤ گے اور یاد کرو گے۔'' پھر وہ خاموش ہو گئی۔

مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں پتھر ہو گیا ہوں۔

وہ جانے کے لئے اٹھی۔ مجھے پھر گلے لگایا، بولی۔

''قسیم پلیز نارمل ہو جاؤ اور مجھے ہنس کر رخصت کرو۔ میں وعدہ کرتی ہوں میں تم سے موبائل پر Contact بنائے رکھوں گی۔''

میں محسوس کر رہا تھا کہ شبو کچھ بے چین سی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک لرزش سی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے اس پر سے کوئی طوفان گزر رہا ہو۔ وہ جانے کے لئے اٹھی۔

میرے منہ سے اچانک نکلا ''شبو''

اس نے مجھے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ پھر بیٹھ گئی۔

''بولو قسیم''

باقی صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیجیے

تعزیت کی سافٹ کاپی

جمیل احمد عدیل
(گوجرانوالہ)

پیارے سلامت! تم نے مرنے میں پہل کر لی، یہ کیا کیا تم نے؟ تم تو بزمِ دوستاں میں مثالی کامیاب فرد ثابت ہوئے تھے! ہم کلاس فیلوز میں سے ابھی تک کوئی بھی اپنی سروس کی پازیب میں بیسویں گریڈ کا گھنگرو نہیں باندھ سکا! اگرچہ یہ ماضی قریب کا واقعہ ہے مگر بہرحال یہ اعزاز تمھی کو ملا! اب مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ تم شروع سے ہی زندگی کو بھرپور پیار کے قابل سمجھتے تھے اور رومانی ہو کر کہا کرتے تھے: حیات مجسم نشاط ہے، کوئی تو یہاں بھی کوثر و تسنیم کا حسن و جمال دیکھے! اسی لیے ہم تمھیں Ambitious کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ ہم دکھ سکھ کے ساتھی آپس میں ہر طرح کی بات کر لیا کرتے تھے؛ میں نے جب بھی دل گرفتگی کی کیفیت میں لائف کو اپیسر ڈ کہنے کی دانشوری جھاڑی؛ تم نے مجھے ہمیشہ ڈانٹ کر چپ کرا دیا! سچ یہ ہے کہ اس نسبت سے تمھاری خفگی میرا تزکیہ کرتی تھی۔ میں اس نہج پہ سوچنے لگتا، اگر زندگی لایعنی ہوتی تو تم اس سے گہری وابستگی نہ پالتے نہ 'گوہرِ مطلوب' کو مرکز مان کر واردات کے لیے باقاعدہ وقت مختص کرنے تک جاتے! تمھارا ذہنِ رسا ہم پر تب کھلتا جب تم بامراد لوٹتے تھے!!

میرے ہم سخن! تمھارے کوچ کر جانے سے احساس ہو رہا ہے کہ ملاقاتوں کی مقدار بھی مقرر ہو گی، اس پیکیج میں بھی فری منٹس ملتے ہوں گے! اور وہ ہم نے سنگت کے زمانے میں بے دریغ صرف کر ڈالے، جو تھوڑے سے بچے وہ کئی کئی سال کے وقفوں کے بعد میسر آنے والی چند بیٹھکوں میں کام آ گئے۔۔۔ آخری بار ہم پانچ برس قبل ملے تھے۔۔۔ اگر اس وقت کوئی ہمیں بتا بھی دیتا کہ اس کے بعد کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکو گے تو۔۔۔ ہاں! تو بھی ہم کتنی دیر ایک ساتھ رہتے؟۔۔۔؟ یہی نا! زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹے اور! تمھیں اسلام آباد جانے کی جلدی ہوتی، مجھے پلٹ کر لاہور آنے کی فکر لاحق ہوتی!

باقی درد کا جبر اظہار ہے اور موجودگان کو جینے کے لیے یہ خوش کن عہد ملا ہے، جہاں کوئی اظہار بے توقیر نہیں ٹھیرتا کہ تیز رفتار پرندے چشم زدن میں منزلوں سے ہمکنار ہونے پر قدرت حاصل کر چکے ہیں۔ یوں اسی برقی سرعت سے وہ مکتوب الیہ کا جوابی خط لے کر مکتوب نگار کے پاس واپس پہنچ جاتے ہیں۔ اگرچہ کبھی کبھی یہ سوچ بھی دستک دیتی ہے کہ تخاطب کا عمل تو موجود ہے مگر اس کہانی میں مخاطب کا کردار گم ہو گیا ہے؟ فرد انبساط کا، حزن کا برملا اظہار تو کر دیتا ہے لیکن وہ مخاطب کس سے ہوتا ہے؟ کچھ پتا نہیں چلتا، جیسے اب یہ مسئلہ ہی نہ رہا ہو۔ اس کے بیچ میں یہ صورت بھی موجود ہے کہ وہ مخاطب سے شناسائی بھی رکھتا ہے لیکن جس ذریعے پر اظہار انحصار کرتا ہے، آشنائی محض اس ذریعے تک محدود رہتی ہے۔ کبھی ملاقات تو ہوتی نہیں ان مخاطبین سے۔۔۔ ملاقات تو کم و بیش بلاناغہ ہی ہوتی ہے لیکن بالمشافہہ ہم نشینی کی شکل نہیں بنتی۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اب اس تکلف کی ضرورت ہی نہیں رہی؟ غالباً دید اور باز دید کی ماہیتیں خاصی بدل گئی ہیں۔ جب اظہار ہو جائے اور جوابی اظہار بھی من و عن متن لے کر حاضر ہو جائے تو بدن کی کثافت کو لازماً زحمت میں مبتلا کرنا ہے؟ یہ زمانہ 'لامسہ' کی پسپائی کو یقینی بنا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے مجھے یاد نہیں پڑتا، آخری بار میں نے کب کسی سے مصافحہ یا معانقہ کیا تھا؟ ممکن ہے اس کا سبب میرے حافظے کا ضعف ہو کہ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں آ رہا کہ میرے ننگے پاؤں آخری بار کب زمین سے مس ہوئے تھے؟ سول 'سدا' حائل رہا، جسد بھی تو Soul کا Sole ہے! تاہم یہ احساس مجھے اب باقاعدہ ستانے لگ گیا ہے جو مٹی سے منھ موڑ لیتے ہیں گردان کا مقدر بن جاتی ہے! اور گرد اڑ رہی ہے!!

اصولی سطح پر اب تہنیت، عیادت، تعزیت وغیرہ عفیفائیں جسمانی سفر کی پابندی کو ختم کر چکی ہیں کہ جب ہر خوشی غمی کی خبر بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے اور اپنی نشست پر قائم رہتے ہوئے تبریک اور ماتم پرسی کے جذبوں کی ترسیل بھی رسائی سے باہر نہیں رہی تو ہر جِ مرج کھینچ کھانچ کر کہیں جانے کے معانی جاتے رہے ہیں۔ صرف خیر و عافیت معلوم کرنے کے لیے اپنے وجودوں کی 'ہارڈ کاپیز' کو مسافتوں کے سپرد کرنے سے کیا مطلب؟ یہی رسم ذرا لیے ابلاغ سے مستفید ہو کر ادا ہو سکتی ہے! اس صورت حال پر کوئی 'رجعت پسند' ہی رنجیدہ ہو سکتا ہے۔۔۔ ایک نارمل فرد تو اس پر آزردہ نہیں ہو گا! دیکھ لو! دفتری کام آن لائن ہو ہی رہے ہیں اور بخوبی ہو رہے ہیں۔ یوٹیلٹی بلز کی ادائیگی کے لیے اب قطاروں میں نہیں لگنا پڑتا۔ بڑی بڑی عمارات جلد ہی فالتو ہو جائیں گی۔ ساری سٹیشنری/ردی داخل دفتر ہو جائے گی۔ جب دوانچ کی یو ایس بی/چپ میں بیسیوں کتب محفوظ ہو سکتی ہیں تو لاکھوں کاغذ قضہ گروپ سے ہی تعبیر ہوں گے، ہوں گے نا؟

اب تم تو میرے خاص الخاص یار رہے ہو! ''گلستان'' کا باب پنجم اور ''مثنوی'' کا باب ہشتم ہم نے ایک دوسرے کی رفاقت میں سبقاً سبقاً پڑھا تھا اور خود آموزی کا مفہوم ہم پہ پہلی بار منکشف ہوا تھا کہ فطرت کیسے خود بخود اور جلدی جلدی لالے کی حنا بندی کرتی ہے! ہاں! جیسے خدا کی دی ہوئی خوبی زیور کی محتاج نہیں ہوا کرتی، اسی طرح اندر کے سچ کو بیرونی براہین کی احتیاج نہیں ہوا کرتی۔۔۔ آمدم برسرِ مطلب! اب تو صفِ مخالف کی بدنی موجودگی بھی زاید بار ہی سمجھی جا رہی ہے۔۔۔ صرف انگلی کا اشارا چاہیے پلی ہوئی چھاتیوں سے لے کر بھاری سرینوں تک سب دہکتا مال اسکرین پر موجود ہے۔ نکاس کو محفوظ راستہ مہیا ہو جاتا ہے!

یارا! ایسا بالکل نہیں کہ تمھارے مرنے کا مجھے افسوس نہیں ہوا، واقعی مجھے دلی صدمہ پہنچا اور اس بات نے بھی افسردہ کیا کہ فرشتۂ اجل موت کے معاملے میں ضابطہ بندی کا زیادہ قائل نہیں ہے۔ مارتا تو خیر وہ ہر کسی کو ہے؛ پر کب، کیسے، کہاں وغیرہ وغیرہ کے استفہامات کو پرکاہ کے برابر بھی حیثیت دینے کو

تیار نہیں! بس جب چاہا، جہاں چاہا، کسی کو مار دیا۔ کئی بار دھیان آیا ہے ملک الموت کا اہم پورٹ فولیو اپنی جگہ، پر بندہ کبھی کسی سے مشورہ ہی کر لیتا ہے۔ اب راقم سے سرسری ہی پوچھ لیتا تو تین چار انتہائی خبیثوں کے نام فوری طور پر لکھوائے جا سکتے تھے جنھیں ہنگامی بنیادوں پر فارغ کر کے زمین کی بالائی سطح کو پاک کیا جا سکتا تھا مگر شاید دھرتی کی اندرونی تہوں کی مٹی فطرتاً منزہ ہے جو رزق حلال پر یقین رکھتی ہے۔ یوں تمھارے حوالے سے بھی اسی کے مطالبے کو ترجیح ملی ہے!

سوہنے سجن! کس سے کہوں کہ تم میرے، بہت ہی قریبی دوست تھے، صحیح معنوں میں: ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز تھے۔۔۔ تمھاری موت کی خبر سے ایک بار تو یوں لگا جیسے خود مر گیا ہوں۔۔۔ لیکن میں کب مر سکا کہ مجھے پہلی فکر یہ دامن گیر ہوئی، تمھارے پُرسے کے لیے کسے تلاش کروں؟ کہ میرا تمام تر رابطہ تم سے شروع ہو کر تم پہ ختم ہو جاتا تھا۔ تمھارے گھرانے کے کسی فرد سے کبھی تعارف کی نوبت ہی نہیں آئی، نہ میرے عیال تم سے واقف ہیں۔ اگر میں پہلے مر جاتا تو تم بھی یہی سوچ رہے ہوتے کہ تعزیت کس سے کروں؟ ہے نا مزے کی بات! کہ ہم یک جان دو قالب تھے پر ہم میں سے کسی نے بھی دوسرے کو کبھی اپنے گھر مدعو نہیں کیا! چنانچہ اب تمھارے سوگواران مجھ سے گلہ مند نہیں ہو سکتے کہ انھیں نہیں معلوم اس نام کا کوئی فرد دنیا میں موجود ہے۔ اگر تم بھی میرے لیے ایسے ہی اجنبی شخص ہوتے تو آج تمھاری موت میرا رہا سہا سکون برباد نہ کر رہی ہوتی!

ایک بات اور مجھے اچانک یاد آئی، تم نے میرے بارے کہیں کہا تھا کہ اس نے یونیورسٹی سے رخصت ہوتے ہوئے آخری دن میری ڈائری میں لکھا تھا: 'آیندہ زندگی میں سب سے کم رابطے کا معاملہ سلامت سے ہوگا'! اور اب صرف اپنے قول کو سچ ثابت کرنے کے لیے یہ مجھ سے نہیں ملتا!۔۔۔! ہاں یار! تسلیم کرتا ہوں کہ تم گہری بات کہنے پر قادر تھے، یوں جب ہم اعتراف کرتے کہ تم میں ایک ادیب کا مکمل پوٹینشل موجود ہے، تو تم ایکدم چڑ جاتے تھے کہ تمھاری نظر میں ادیب/شاعر ہونا سماج کے کمترین طبقے کا حصہ بننے کے مترادف تھا۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب تمھارا فیوڈل بیک گراؤنڈ ہو، پھر اس 'تخلیق کی مدعی مخلوق' کو تم نے قریب سے دیکھا ہوا تھا۔ ایک روز تم نے ہی کہا تھا کہ کئی نامور مصنف ایسے بھی ہیں جو اپنے کچھ مداحوں کے ساتھ 'رکھیل' جیسا سلوک کرتے ہیں۔

ایک زمانے میں تمھاری بصیرت میری بصارت بن گئی تھی؛ یوں تمھاری آنکھ سے اپنے آپ کو، دنیا کو دیکھنا؛ نئے مناظر، نئے تناظر کو سامنے لاتا تھا؛ جو کبھی خوشگوار لگتا تو کبھی ناخوشگوار!

تمھارے جنازے میں شرکت کے لیے جب میں مخمصے کا شکار تھا تو دفعتہً کوئی تیس برس پرانا واقعہ یاد آ گیا، جب ہماری کلاس فیلو امتیاز بانو کا انتقال ہوا تو ہم سب دوستوں نے ایک دوسرے کو خطوط لکھ کر طے کر لیا کہ اظہارِ تعزیت کے لیے سب ایک ساتھ سیالکوٹ جائیں گے۔ پروگرام کے مطابق سب اپنے اپنے شہروں/قصبوں سے لاہور ریلوے اسٹیشن کے متعین مقام پر پہنچ گئے۔ میں حسب معمول لیٹ ہو گیا تو تم نے میری آمد پر ہنستے ہنستے سنایا کہ میں ان سے کہہ رہا تھا، ہم میں سے بھی کوئی مر گیا تو اس 'مردِ ابریشم' نے یہی خود کلامی کرنی ہے: 'اب ایسے ناموافق موسم میں کون جائے!' اس پر سب قہقہہ بار ہو گئے، جیسے سب میری خود غرضی یا تن آسانی سے اچھی طرح واقف ہوں!!

پلوں کے نیچے سے کتنا پانی بہ چکا ہے! کیا کہوں کہ جب سے سر پہ ڈھائی بال نمایش پہ اترانے لگے ہیں؛ ڈاڑھی مکمل سفید ہو گئی ہے؛ دفتر کے سب اہلکار 'باباجی' کہتے ہیں۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے؛ طنزاً کہتے ہیں یا احتراماً! اسی سال کے آخری ماہ کے آخری دن ریٹائر ہونے والا ہوں۔ بیوی کے ساتھ اگرچہ عمر بھر چڑ چڑ لگی رہی لیکن اس کی ناگہانی وفات کے بعد اندازہ ہوا ہے کہ وہ میرا بہت بڑا سہارا تھی۔ میں نے کبھی مان کر کے نہیں دیا مگر میری زندگی اس پر ٹوٹلی ڈیپینڈ کرتی تھی! دونوں بچے الگ الگ ملکوں میں مقیم ہیں۔ گھر میں، میں اکیلا ہوں۔۔۔ بالکل ہی اکیلا۔۔۔ اب اس مثل کی سمجھ آئی ہے: وہی میاں دربار کو وہی چولھا پھونکنے کو! اس میں شبہ نہیں کہ میں طبعاً تنہائی پسند ہوں لیکن تنہائی کیسے کٹتی ہے اور کیسے کاٹتی ہے، یہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا! کیونکہ کوئی اس عذاب کو سمجھ نہیں سکتا کہ دفتر میں میٹنگ کے لیے اچانک بلاوا آ جائے تو مجھے فٹس پڑنے لگتے ہیں! شدت احساس کی حالت میں مجھے ہر فرد، وہ 'دوسرا فرد' محسوس ہوتا ہے جسے دہکتا ہوا دوزخ کہا گیا ہے! ناجنس کی خاموش موجودگی بھی بھسم کر کے رکھ دیتی ہے! اور یہ 'ناجنس' بھی عذر ہی لگتا ہے، شاید مارکیز کے تخلیق کردہ بوئندیا خاندان کی طرح میں محبت کرنے کا اہل ہی نہیں رہا!!

میں انکار نہیں کرتا کہ عین ممکن ہے کسی دوسرے کی نظر میں وہی اسٹیٹس میرا ہو، جو میں دوسروں کی بابت سوچے ہوئے ہوں۔۔۔ مجاہد۔۔۔ اپنا سانجھا بیلی مجاہد۔۔۔ یاد ہے نا؟ ہاں! وہی چین اسموکر خوب صورت شہزادہ۔۔۔ بھئی! اب تو وہ ٹاپ بیوروکریٹ ہے۔ ایک روز کسی کام کے سلسلہ میں اس کے پاس جانا ہی پڑا۔ اسی محبت، احترام سے پیش آیا! اس نے اپنے اسسٹنٹ کو فوراً فون کر کے دوٹوک ڈایریکشن دی اور مجھے کہا: آپ اس کے پاس چلے جائیں، کام ہو جائے گا! میں نے خوشامد اور اخلاص کو گوندھتے ہوئے کہا: بہت شکریہ! مگر واپسی پر سلام کر کے جاؤں گا! وہ جواباً مسکراتے ہوئے بولا: سلام فون پر بھی کہہ سکتے ہیں، میں قبول کر لوں گا!۔۔۔! یوں میں اس کے اسسٹنٹ سے ملے بغیر گھر کی جانب چل پڑا لیکن واپس آتے آتے ساری کبیدگی معدوم ہو گئی کہ بات اس کی درست تھی!!

سلامت! تم تو واقف ہو کہ جوانی میں میری خوش خورا کی مشہور تھی۔ شاید تم یقین نہ کرو کہ اب کسی مرتاض صوفی سے بھی زیادہ قلیل الطعام ہو چکا ہوں، یوں نائیٹ میئرز نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں اور اس کی وجہ مابعد الطبیعی نہیں بلکہ ڈینٹسٹ سے ملنے والی زمینی ہدایت ہے کہ دانتوں کو مزید آزمایش میں نہ ڈالیے گا وگرنہ آنے والی تکلیف کو، سہ نہ سکیں گے! اس سے مجھے لگا، جیسے رزق کا بھی کوٹا ہوتا ہے! ذیابیطس میری سرپرست بنی ہوئی ہے چناں چہ وہ مجھے علی الصباح ہانک کر پارک میں لے جاتی ہے۔ اس بہانے میں اپنے پاؤں سے التماس کرتا ہوں کہ تم زمین کے قریب ترین ہو، کوئی آہٹ تو سنو کہ کب تک نیوتا

متوقع ہے؟؟؟ اب یہ نکتہ طرازی کرنے نہ بیٹھ جانا کہ یہ فیصلے زیرِ زمین نہیں بالائے آسمان ہوا کرتے ہیں! خیر! اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ فیصلے کہاں ہوتے ہیں مگر کافکا کے کردار کی بات ہی سچ ہے:

''انسان مرتا ہے تو اس کی تمام خواہشیں جو پوری نہیں ہوئیں اور تمام خواب جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے، اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں!!''

اس اولڈ ایج میں بیتا سے رہ رہ کر یاد آتا ہے! وہ وقت بھی کیسا نشیلا تھا، کس قدر بے پرواتھے۔۔۔یاد ہے ایک دن ہم نے یہ ایڈونچر بھی کیا تھا کہ الفریڈ وولنر کے مجسمے کے عین سامنے سے مال روڈ کو میوزیم کی طرف اس معاہدے کے تحت کراس کیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رکھیں گے اور کوئی بھی آنکھ نہیں کھولے گا۔۔۔ جب ہم دوسری طرف پہنچ گئے تو قسمیں ڈال کر پوچھا: آنکھ کھولی تھی یا نہیں؟ تو دونوں ہی مان گئے تھے، ہاں! تھوڑی تھوڑی۔۔۔اور اب تم آنکھیں میچے چپ چاپ اکیلے ہی زندگی کی سڑک کو پار کر گئے ہو! کیا تم اپنے ان الفاظ کو بھول گئے ہو؟

''ہم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے تھے۔ یہ ضرورت آج تک برقرار ہے۔ ہم دونوں فاصلوں کی صلیب پر لٹکے ہوئے ہیں لیکن آج بھی ایک دوسرے کی ضرورت کو اسی شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں!!''

تمھارے ہونے سے ایک تسلی تو تھی کہ ملن اپنے امکان سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔۔۔ہم یاروں میں سے کوئی بھی تمھیں روک نہیں سکا، نہ کوئی تمھیں واپس لا سکتا ہے لیکن اس کا کیا کریں کہ کسی پل کسی کو چین نہیں پڑ رہا۔۔۔آخر سوچ سوچ کر ایک حل سوجھا کہ میں حزن کا مارا اپنے جذبے کی عنان تھاموں اور دو سو کلومیٹر کا سفر کر کے تمھارے شہر جا پہنچوں۔ کسی طرح تمھاری آخری آرام گاہ کا ایڈریس معلوم کر کے رہبر کو واپس پہنچا کر دوبارہ اکیلا قبرستان آؤں۔ کفش سے اپنے پاؤں کو آزاد کرا کے برہنہ تلووں کو گورستان کی کھردری مٹی سے آزادانہ ملنے دوں کہ مٹی کے ہجر میں بے قرار قدموا! کرلو اپنی اداسی دور! جی بھر کے! پھر تمھاری قبر کے پاس بیٹھ کر خود کو رونے دوں۔۔۔رولو جتنا رو سکتے ہو! اس کے بعد آنکھیں موند کر ساری گزران کو ترتیب وار دیکھوں۔۔۔جب یہ ہو چکے تو تمام ساعتوں کو ایک نقطے میں قید کر کے اپنی تتلی میں چھپالوں۔۔۔اپنے وجود کے بغاوت پر آمادہ جوارح کو سمیٹ سمٹا کر ارادہ بھی کر لیا۔۔۔اسی اثنا میں ہمارے مشترکہ حبیب، اسحٰق نے تمھاری قبر کی پک ٹوئیٹر پر اس کیپشن کے ساتھ شیئر کر دی:

وہ جس ویران سی جگہ پر آج لیٹا ہوا ہوا ہے، اتنا نفیس تھا کہ شاید وہاں ایک منٹ کھڑا ہونا بھی پسند نہ کرتا!!

مٹی کی ڈھیری اپنے ماتھے پہ ایک سرخ گلاب سجائے صورتِ تصویر سامنے تھی اور آنکھوں میں تیرتی نمنا کی اسے دھندلا کرنے پہ تلی بیٹھی تھی۔۔۔سو، پلکیں جھکائیں اور فاتحہ پڑھتے ہوئے سوچنے لگا؛ روحانی گلشنوں کا سارا کاروبار پہلے ہی سافٹ کاپیز کو قبول کرتا ہے؛ ایسے میں جسم کی مادیت کیا کردار ادا کر پائے گی کہ جس سلامت کو میں جانتا ہوں، وہ کہیں اور سلامت ہے۔۔۔اس گور میں کوئی اور پڑا ہوا ہے!!

تمھارا روم میٹ

- بقیہ -

سرد موسم کی تپش

''کیا بولوں''

''کچھ بھی بولو کہ زندگی کا یہ کٹھن سفر کچھ تو آسان ہو جائے۔''

''کیا چند دنوں اور نہیں رک سکتی۔''

''نہیں قسیم،، میرا ارز رویشن ہو چکا ہے۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔ مجبوریاں مجھے تم سے چھیننے کے لئے منہ کھولے کھڑی ہیں۔ قسیم میرا وجود شل ہو رہا ہے، اچھا چلوں۔''

وہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے مجھے دیکھا میری ڈبڈبائی آنکھوں کو دیکھا۔ اس نے اس ارتعاش کو دیکھا جو میرے پورے وجود پر سایہ فگن تھا۔ وہ پھر بیٹھ گئی۔

''نہیں قسیم نہیں، پلیز نارمل ہو جاؤ۔ دیکھو زندگی اسی کا نام ہے۔ آج یہاں، کل وہاں، پرسوں معدوم۔ زندگی کے اس رویہ کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ تم بھی نہیں میں بھی نہیں کوئی بھی نہیں.....نہیں قسیم پلیز نہیں۔ مجھے ہنس کر رخصت کرو کہ یہ لمحے ہمیشہ یادوں میں موجود رہیں۔ وہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے قسیم کو اپنی بانہوں میں لیا اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

''خدا حافظ قسیم'' وہ ایک جھٹکے سے الگ ہوتی ہوئی بولی۔

''خدا حافظ شبو''

میں نے دیکھا کہ شبو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔

ادھورانِروان

ڈاکٹر ذاکر فیضی
(نئی دہلی)

پروفیسر صاحب پچپن سال کی عمر میں بھی بہت اسمارٹ اور خوب صورت لگ رہے تھے۔اُن کے شاگردوں کا کہنا تھا کہ وہ بالوں کو رنگنے کے بعد چالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے۔انھوں نے سفید شرٹ پر لال ٹائی باندھی ہوئی تھی اور کوٹ نیلے رنگ کا تھا۔وہ لمبے سے آئینے کے سامنے کھڑے مُسکراتے ہوئے بال سنوار رہے تھے۔ٹھیک اسی وقت کمرے میں بیگم داخل ہوئیں۔شوہر کا حُلیہ دیکھ کر بے اختیار ہنستے ہوئے بولیں۔۔۔’’آج پھر۔۔۔‘‘

پروفیسر صاحب نے جھینپتے ہوئے کہا۔۔۔’’وقت بچتا ہے بھئی، سمجھتی نہیں ہو۔۔۔ٹائم از منی۔۔۔خیر چھوڑو۔۔۔بس بے وقوفوں کی طرح ہنستی رہو۔۔۔‘‘

بیگم صاحبہ نے سوچا انھوں نے اپنا آدھا دن تو بالوں کو رنگنے میں لگا دیا،تب ان کو ٹائم کی منی یاد نہیں آئی۔مگر پروفیسر صاحب کے مزاج کو دیکھتے ہوئے بولیں:

’’نہیں نہیں۔۔۔میرا مطلب۔۔۔سوری صاحب۔۔۔سوری۔‘‘بیگم نے بناوٹی انداز میں اپنے کان پکڑے۔لیکن انھیں پھر ہنسی آ گئی۔وہ اپنی ہنسی کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں:

’’مگر پھر ٹائی کوٹ کی بھی کیا ضرورت ہے صاحب،صرف شرٹ کافی نہیں؟۔۔۔کونسا آپ ڈپارٹمنٹ جا رہے ہیں۔۔۔آن لائن کلاس ہی تو لے رہے ہیں۔‘‘ بیگم نے صاحب کی قیمتی اور خوب صورت ٹائی اور کوٹ کے ساتھ بندھی پرانی لُنگی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

پروفیسر صاحب نے آئینے میں اوپر سے نیچے تک خود کو دیکھا وہ واقعی عجیب سے لگ رہے تھے۔معلوم ہوتا تھا،اوپر کا حصّہ ان کا ہے اور پیٹ سے نیچے کا علاقہ کسی اور کا ہے۔پھر خود ہی دل میں ہی دل میں سوچنے لگے۔۔۔’نہیں بھئی پیٹ کے نیچے کا حصّہ تو میرا ہی ہے۔میں شعبہ جاتا ہی کتنی دیر ہوں۔زیادہ وقت تو میں گھر پر ہی رہتا ہوں۔۔۔‘تب ہی انھیں خیال آیا کہ ویبینار کے لئے دیر ہو رہی ہے۔

بیوی سے بولے:

’’میں کلاس لینے نہیں جا رہا ہوں۔انٹرنیشنل ویبینار کرا رہا ہوں۔۔۔ایک پروفیسر کو آخر اپنے وقار کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔۔۔لباس پر دھیان دینا ضروری ہے۔۔۔‘‘

یہ کہتے ہوئے انھوں نے ہاتھ میں لیا کنگھا بیگم کو پکڑایا اور لُنگی کو دونوں ہاتھ سے سمیٹ کر بیڈ روم سے نکل کر اسٹڈی روم کی طرف چل پڑے۔

اسٹڈی روم میں ان کا سب سے عزیز شاگرد ساری تیاری کر چکا تھا۔ صرف پروفیسر صاحب کو اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کیمرہ آن کرنا تھا۔

’’بہت خوب،آپ نے میز کا رُخ بُک ریک کی طرف کر دیا۔۔۔یہ اچھا کیا۔۔۔پروفیسر کو پڑھا لکھا لگنا چاہئے۔‘‘ پروفیسر صاحب اپنی ہی بات پر زور سے ہنسے۔

شاگرد تکلّف میں صرف اتنا بول پایا:

’’کیسی باتیں کرتے ہیں سر،آپ تو بہت ہی قابل شخصیت ہیں۔‘‘

’’او کے۔۔۔اب تُم ہاسٹل جاؤ۔۔۔جلدی سے آن لائن ہو جانا۔۔۔آج کا سیمینار انٹرنیشنل ہے اور بہت اہم ہے۔‘‘ پروفیسر صاحب نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

شاگرد جو ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔استاد کا حکم سُن کر دو قدم پیچھے ہٹا اور ’’آداب سر‘‘ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔گھر سے باہر نکلتے ہوئے شاگرد نے بیگم صاحبہ کو سلام کیا تو۔۔۔پچاس سالہ بیگم نے بے حد حسرت بھری نگاہوں سے پچیس سالہ نوجوان کو دیکھا اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولیں:

’’پھر آئیے گا۔‘‘

’’جی میڈم۔۔۔‘‘ کہتے ہوئے وہ جلدی سے باہر نکلا۔اُس نے اس انداز سے آنکھیں اوپر کو چڑھائیں،جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔’جان بچی تو لاکھوں پائے۔‘

پروفیسر صاحب لوک ڈاؤن سے پہلے بھی ہمیشہ سرگرم رہتے تھے۔وہ اپنے ہم عصروں میں بہت فعال شخصیت مانے جاتے تھے۔کئی شاگرد پروفیسر صاحب کو پیار سے سیمینار ایکسپرٹ بھی کہتے۔نجانے کتنے اسکالرس کو انھوں نے اپنی صلاحتیں دکھانے کا موقع فراہم کیا تھا۔وہ اپنے شاگردوں کو ملک وغیر ممالک کی جامعات میں بھی لے کر جاتے رہتے۔کبھی کبھی اُن کے تعلق سے افواہوں کا بازار بھی گرم ہوتا ہے کہ وہ بے حد رومان پرست ہیں اور لڑکیوں پر زیادہ مہربان رہتے ہیں۔بہرکیف سچائی کُچھ بھی ہو،مانا یہی جاتا ہے کہ وہ انسان بہت اچھّے ہیں۔ہر کسی کی مدد کو حاضر رہتے ہیں۔

جب کورونا کی وبا پھیلی اور ساری دنیا کی طرح وہ خود بھی گھر کے قیدی قرار دیے گیے تب مہینہ بھر تو بیوی اور بچّوں کے ساتھ وقت گزارتے رہے۔مگر جلد ہی ان پر پہلے اُکتاہٹ طاری ہوئی اور پھر یہ اکتاہٹ وحشت میں تبدیل ہونے لگی۔تب انھوں نے سیمینار کو ویبینار میں بدلنے کا فیصلہ کیا۔وہ ہر مہینے کم سے کم ایک یا دو ویبینار ضرور منعقد کراتے ہیں یا کسی اور ویبینار کا حصّہ بنتے ہیں۔جس میں اکثر عالمی ویبینار ہوتے ہیں۔

آج کا ویبینار بھی عالمی تھا۔جس کا موضوع تھا:’زندگی اور فلسفۂ حیات‘۔ ویبینار شروع ہو چکا تھا۔نظامت کے فرائض ان کی بے حد عزیز شاگردہ حیا ادا کر رہی تھیں۔جنھوں نے پروفیسر صاحب کو ابتدائی کلمات کے لیے دعوت دی تھی۔ پروفیسر صاحب بہت غور سے تمام حاضرین کو دیکھ رہے تھے۔انھوں نے فرمایا:

’’محترم حاضرین! زندگی کی بہت سی جہتیں ہیں۔جن سے بے شمار

خیالات وافکار جنم لیتے ہیں۔ ہر مذہب نے اپنے اپنے انداز سے ان خیالات و افکار پر روشنی ڈالی ہے۔آج کا انسان بہت بے چین نظر آتا ہے۔نجانے کس خوشی، کس سکھ، کس آرام کی تلاش میں ہے۔انھیں مسائل اور نکتوں پر ہمارے مقالہ نگار بحث کریں گے۔ میں آپ سب کا دل کی گہرائیوں سے استقبال کرتا ہوں۔آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہماری دعوت کو قبولیت بخشی اور محنت ولگن سے پیپر لکھے۔تو آیئے مقالات کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔میں حیا صاحبہ سے درخواست کروں گا کہ آپ باضابطہ پروگرام کو آگے بڑھائیں۔شکریہ۔''

حیا کا بے حد پُرکشش مُسکراتا چہرہ اسکرین پر موجود تھا۔ پروفیسر صاحب نے حیا کو فُل اسکرین پر کرلیا۔ وہ اس کو بہت ہی غور سے دیکھ رہے تھے۔حیا نے اپنی بات شروع کی:

''میری آواز آرہی آپ لوگوں کو۔۔۔''

''آرہی ہے آرہی۔۔۔شروع کریں آپ۔۔۔'' پروفیسر صاحب فوراً بولے اور موبائل اٹھا کر حیا کو میسج بھی کیا، 'آپ کی آواز بہت صاف آرہی۔آپ بہت اچھے سے بول رہی ہیں۔آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے۔'

دور کسی مُلک میں بیٹھے ایک بُزرگ ادیب بولے:

''محترمہ، آپ کی آواز آرہی ہے بلکہ کانوں میں ترنّم بھی گھول رہی ہے۔''

''بہت بہت شکریہ سر۔'' کہتے ہوئے، حیا دھیرے سے ہنسی اور آگے بولی:

''میں سب سے پہلے اپنے استادِ محترم کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ انھوں نے مجھے یہ موقع فراہم کیا، میں اُن کی بے حد ممنون ہوں۔۔۔حاضرین جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آج کے انٹرنیشنل سیمینار کا موضوع ہے: 'زندگی اور فلسفۂ حیات'۔ ظاہر ہے کہ ایک بہت ہی اہم ٹوپک ہے، جس پر ہمارے ماہرین، دانشور، پروفیسرس اور اسکالرس اپنے قیمتی اور پُرمغز مقالات پیش کریں گے اور بحث کریں گے۔ ہمارے اس سیمینار کی مہمانِ خصوصی دیارِ غیر سے تعلق رکھنے والی پروفیسر رومانہ صاحبہ ہیں جو وہاں ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ میں اُن کا استقبال کرتی ہوں۔اور آج کے سیمینار میرا مطلب ہے ویبینار کی صدارت فرمارہے ہیں استادِ محترم ہمارے ہردل عزیز پروفیسر صاحب۔''

پروفیسر صاحب نے فُل اسکرین سے حیا کو ہٹا کر رومانہ صاحبہ کو کرلیا۔ وہ رومانہ صاحبہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔انھیں یاد آیا کہ جب دو سال پہلے وہ غیر مُلکی سفر پر گئے تھے تو رومانہ صاحبہ کی یونیورسٹی میں ایک سیمینار کے لئے جانا ہوا تھا۔ان سے مل کر باتیں کر کے کتنا اچھا لگا۔کس قدر سکون ملتا ہے، اس عورت سے بات کر کے۔اُف قیامت ہے رومانہ۔ وہ سوچنے لگے یہ عورت جتنی حسین ہے اس سے زیادہ اس کے جسم کے اتار چڑھاؤ۔اُف!'۔۔۔اس کا چہرہ کتنا چکنا ہے۔۔۔گلابی رنگت ہے۔۔۔کاش۔۔۔'

کاش سوچتے سوچتے پروفیسر صاحب کا ہاتھ اپنی رانوں پر آگیا۔

پروفیسر صاحب کو معلوم ہی نہیں ہوسکا کہ حیا نے اپنی بات مکمل کرلی تھی اب اسکالر اپنا مقالہ پڑھ رہا تھا۔مقالہ نگار اپنے مقالے کے درمیانی حصّے میں پہنچ چکا تھا۔وہ کہہ رہا تھا:

''۔۔۔اور۔۔۔من بہت ہی چنچل ہے۔وہ کسی کی نہیں سُنتا۔من ہمیشہ ہی نئے نئے سُکھ کی، لذّت کی، مزے کی بات کرتا ہے۔اگر ایک نغمہ آپ نے ایک بار سُنا تو بہت اچھا لگے گا۔دوسری بار سنیں گے تو اتنا مزہ نہیں آئے گا۔تیسری بار سُنا تو گھبراہٹ ہونے لگے گی۔دس بار سُننا پڑے تو آپ عاجز آجائیں گے۔سو بار آپ کو زبردستی سنایا جائے تو آپ پاگل ہو جائیں گے۔من کا سُکھ بڑا لحاظی ہوتا ہے۔۔بہت ہی جلد وہ ایک مزے سے اُب جاتا اور پھر کسی نئے کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔۔۔من کو کبھی اور کہیں بھی قرار نہیں ہے۔من سے زیادہ بے قرار کوئی نہیں۔''

مقالہ نگار مقالہ پڑھ رہا تھا۔ پروفیسر صاحب رومانہ کے ساتھ تصورات کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔انھیں نہ مقالہ نگار کی بات سمجھ آرہی تھی اور نہ ہی اندر سے بند کمرے کا دروزہ پیٹنے کی آواز آرہی تھی۔

''صاحب، دروازہ کھولئے۔۔۔ایک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یہ کیسے سیمینار ہیں جو دروازہ بند کر کے ہوتے ہیں۔۔۔'' بیگم نے جھنجھلا کر کہا۔

پروفیسر صاحب کو جب آواز آئی تو وہ ہڑبڑا گیے۔ پھر بھی اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے، پہلے اوڈیو اور ویڈیو بند کیں۔کان سے ہیڈفون اُتارا۔جلدی سے دروازہ کھولا۔

''کیوں۔۔۔کیا ہوا؟۔۔۔کیا آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔'' پروفیسر صاحب بے حد جھنجھلا رہے تھے۔

''آسمان واسمان کی بات بعد کو ہوگی۔ پہلے آپ مجھے یہ سمجھائے کہ آپ دروازہ کیوں بند کر لیتے ہیں؟'' بیگم آگ بگولہ ہو رہی تھیں۔

''ارے بھئی بتایا تو تھا۔۔۔باہر کی آوازیں آتی ہے۔۔۔بیک گراؤنڈ ساؤنڈ۔۔خیر چھوڑو۔۔۔جلدی بتاؤ کیا کام۔۔۔'' پروفیسر صاحب کی آنکھوں کے سامنے رومانہ کا چہرہ اور گردن کے نیچے کا حصّہ رقص کر رہا تھا۔

''بیٹی کو سمجھائے۔۔۔دو گھنٹے سے چیخ رہی ہوں نہیں سُن رہی۔۔۔''

بیگم نے بیٹی کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔۔۔''وہ بھی آپ ہی طرح دروازہ بند کر کے نجانے کس کس سے چیٹنگ کرتی رہتی ہے، کہتی ہے کوچنگ کلاس لے رہی ہوں۔۔۔پوچھو۔۔دروازہ بند کیوں ہے تو کہتی ہے کہ ۔۔۔ہاں۔۔۔آپ تو سمجھ گئے ہوں گے۔۔۔کیا کہتی ہے۔۔۔'' بیگم نے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے اپنے بتیس کے بتیس دانت دکھاتے ہوئے کہا۔

''بیگم! یہ بات آپ مجھے بعد کو بھی بتا سکتی تھیں، سیمینار کے درمیان۔۔۔'' پروفیسر صاحب نے ناگواری سے کہا اور دروازہ بند کرنے لگے۔

''آپ اور آپ کے سیمینار۔۔۔اوپر سے آپ کی بیٹی آئی اے ایس کی تیاری کرتی آپ کی بیٹی۔۔۔میں تنگ آگئی ہوں۔۔۔باپ بیٹی سے۔۔۔کسی کام کو ہاتھ تک ہاتھ نہیں لگاتی۔۔بس، آئی اے ایس بنیں گی۔۔۔'' بیگم نے ہوا

میں ہاتھ نچائے۔

وہ بے حد غصّے میں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔۔۔ پیچھے سے ان کی آواز آرہی تھی:

''ایک بارلوک ڈاؤن کھُل جائے۔۔۔ایسا جاؤں گی۔۔۔ پتہ چل جائے گا۔''

پروفیسر صاحب اپنی کُرسی پر آکر بیٹھ گئے۔جلدی سے ہیڈفون سر پر لگالیے۔

کوئی مقالہ نگار پیپر پڑھا رہا تھا۔ پروفیسر صاحب نے سیمینار میں موجود تمام خواتین کو باری باری فُل اسکرین کر کے دیکھا۔۔۔وہ پرکھنا چاہ رہے تھے کہ رومانہ سے زیادہ حسین اور پُرکشش کوئی اور لڑکی یا عورت ہے یا نہیں۔۔۔ کئی خاتون کو ایک ایک دو دو منت رُک کر دیکھا بھی۔۔۔ پھر مواز نہ کرنے لگے کہ سب سے زیادہ حسین اور سیکسی کون لگ رہی ہے تا کہ اسی پر فوکس کیا جائے۔۔۔بیس منٹ کی جستجو اور کشمکش کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ رومانہ جیسی ان میں کوئی نہیں۔۔۔بس تو طئے پایا کہ آج تخیّل کے آسمان پر رومانہ کے ساتھ ہی اُڑا جائے گا۔ یہ سوچ کر انھوں نے رومانہ کو فُل اسکرین پر کیا اور اپنی ٹائی درست کرتے کرتے نابھی کے نیچے تک لے گئے۔ ہلکی سی دل ہی دل میں سسکی بھری۔تا کہ آن اسکرین کوئی ان کے جذبات واحساس کو پہچاننے نہ پائے۔انھوں نے نشیلے انداز میں رومانہ کو دیکھا۔۔۔ پروفیسر صاحب حسیناؤں کی آنکھوں سے شراب پیتے تھے تو پروفیسر صاحب رومانہ کی آنکھوں سے پی رہے تھے جبکہ اب ایک اور مقالہ نگار انسانی تکلیف اور سُکھ پر روشنی ڈالتے ہوئے اُوشو کو کوڈ کر رہا تھا:

''اوشو کہتے ہیں کہ میں تصوّر ہی نہیں کرسکتا کہ کسی آدمی کو دُکھی ہونے کی ضرورت ہے، جب تک کہ وہ خود ہونا ہی نہ چاہے اور کوئی آدمی سُکھی نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ ہونا ہی نہ چاہے۔تو ہم ہونا تو چاہتے ہیں سُکھی اور انتظام سارے کرتے ہیں دُکھ کے۔۔۔''

مقالہ نگار وید، گیتا، قرآن، بائبل، مہاتما بدھ اور دیگر فلسفیوں کے حوالے دے کر 'زندگی کیا ہے' کے فلسفے پر روشنی ڈال رہے تھے۔نروان پراپتی کو سمجھا جارہا تھا۔موکش حاصل کیسے کیا جاتا ہے۔ان سارے نکتوں پر غور وفکر ہورہا تھا۔

اور۔۔۔خاص اسی وقت پروفیسر صاحب نروان پراپت کرنے کے لیے رومانہ۔۔۔رومانہ۔۔۔رومانہ۔۔۔ کی گردان کر رہے تھے۔۔۔وہ کُچھ ہی دیر میں چرم سیما پر پہنچ کر موکش حاصل کرنے ہی والے تھے کہ۔۔۔

بیگم پروفیسر صاحب کے لیے چائے لے کر آئیں۔۔۔ پروفیسر صاحب پہلی بار دروازہ بند کرنا بھول گیے تھے۔

بیگم میز کے قریب آئیں۔

پروفیسر صاحب مہاتما بدھ کی طرح ادھ کھلی آنکھوں سے رومانہ کو دیکھ رہے تھے۔اُن کا ہاتھ بہت تیزی سے ہل رہا تھا۔

تب ہی بیگم کی نگاہ پروفیسر صاحب کے چہرے سے ہوتی ہوئی ٹائی سے نیچے کی طرف گئی۔

بیگم نے توبہ کے لئے کان پکڑنے کی کوشش میں چائے کا کپ ہاتھ سے چھوڑ دیا، جو میز پر جا کر گرا۔چائے اُچھل کر ٹائی پر پھسلتی ہوئی نروان پراپتی میں گھل مل گئی۔لنگی کھل کر نیچے گر چکی تھی۔پروفیسر صاحب ہڑبراہٹ میں بنا سوچے سمجھے کھڑے ہوگئے۔وہ یہ بھول ہی گئے کہ کیمرہ آن ہے۔وہ سیمینار چل رہا ہے۔زندگی اور فلسفۂ حیات پر گفتگو ہورہی ہے۔

پروفیسر صاحب کی تپسیہ بھنگ ہوگئی۔ان کا نروان پورا ہوکر بھی ادھورا رہ گیا۔وہ نہ ہی موکش حاصل کر پارہے رتھے نہ ہی روک پارہے، صرف ہڑبراہٹ میں بیگم کو دیکھ کر حیران و پریشان تھے۔جبکہ وہ سیمینار میں شریک خواتین تیزی سے آف لائن ہورہی تھیں۔مرد حضرات لاحول پڑھتے ہوئے مُسکرا رہے تھے۔

ان ساری باتوں سے بے نیاز مقالہ نگار سر جھکائے اپنی ہی دُھن میں مگن پیپر پڑھے جارہا تھا:

''زندگی بھر دوڑ کر ہاتھ بھرتے ہیں اور پھر پاتے ہیں کہ ہاتھ خالی رہ گئے ہیں۔ زندگی بھر یہ ہاتھ خالی تھے۔ ساری دوڑ فضول جاتی ہے۔ کُچھ بھی نہیں ملتا۔صرف ملتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے دور دکھائی پڑتا ہے کہ زمین اور آسمان مل رہے ہیں۔مگر جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے رہتے ہیں زمین وآسمان کا یہ گھیرا بھی آگے بڑھتا رہتا ہے۔ہم زندگی بھر چلتے رہیں۔۔۔ساری دنیا کا، زمین کا چکّر لگالیں۔۔۔وہ جگہ کبھی نہیں آئے گی جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں۔ٹھیک ایسے ہی آدمی عمر سوچتا رہتا ہے یہ مل جائے، یہ مل جائے۔ یہ مل جائے۔سب مل جائے گا ایک دن ایسا لگتا ہے۔۔۔آگے آگے کہیں ملنے کی جگہ آجائے گی۔۔۔ دوڑتا ہے۔۔۔دوڑتا ہے۔دوڑتا ہی رہتا ہے۔۔۔آخر گر جاتا ہے۔ ملنے کا وقت نہیں آتا۔۔۔ہاتھ خالی رہ جاتا ہے۔

بقیہ : ریچھ

انہوں نے فیصلہ کیا ایک بیوہ ماں کو انصاف دلانے کے لیے ایوانوں کے دروازے کھٹکھٹائیں گے۔۔۔بچّی کا لاشہ مختلف چوراہوں سے گزارتے، نوحے کرتے وہ ایوانوں تک پہنچ گئے اور خوب چلائے، عمارت خاموش رہی۔۔۔اس کے اندر کوئی حرکت نہیں ہوئی۔۔۔سیکورٹی کو ڈسپلن کا حکم دیدیا گیا۔۔۔آدھی نفری تو ڈی چوک پر تھی، وہاں ایک بچّ کا فساد چل رہا تھا، مظلوم بستی اتنا اہم معاملہ نہیں تھا۔۔۔نقص امن کی خلاف ورزی کی دفعہ لگ گئی دارلحکومت کے راستے گلی ڈنڈا کھیلنے کیلئے نہیں ہوتے، ایوان کے سامنے سے تو جنازہ بھی نہیں گزرا تا جاتا ہے۔۔۔لاٹھیاں چل پڑیں۔۔۔مجمع بپھر گیا، لاشہ بین کرنے لگا، گرفتاریاں شروع ہوگئیں لیکن ایوانوں کے اندر سے فقط پھو کے غباروں کی سی آواز آئی، جیسے سڑکوں پر بغیر دانت کینا چنے والے ریچھ عمارت میں گھُنگرو بجارہے ہوں۔

کندھا

تابش خانزادہ
(نیویارک)

میں آج کے دور کی بات نہیں کر رہا ہوں جہاں ہر چیز بنی بنائی اور پلی پلائی ملتی ہے۔ مشینوں نے انسانی کام سنبھال کر انسان کو ایک بیکار سی مشین بنا دیا ہے۔ دو بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے لیے انسان ایک گھنٹہ بس کے انتظار میں گزار دیتا ہے۔ فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے کے لیے انسان کسی نہ کسی سواری کا انتظام کرتا ہے۔ شہروں کو چھوڑ اب تو گاؤں میں ہل کی بجائے ٹریکٹر آ گئے ہیں ر گندم کاٹنے والی مشین گندم کاٹتی ہے، گندم اور بھوسہ جدا کرتی ہے، گندم کی بوریاں بناتی ہے اور بھوسے کی بھی خبر لیتی ہے۔

دہائیوں پہلے ہمارے گاؤں میں نہ پکی سڑک ہوا کرتی تھی اور نہ ہی یہ مشینیں۔ میں اس دور کی بات کر رہا ہوں جب گاؤں کا ہر فرد چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے بھی ورزش کرتا تھا۔ پرائمری سکول ہمارے گاؤں سے پانچ میل کے فاصلے پر ہوا کرتا تھا۔ صبح بستہ بغل میں دبائے، بستے میں مکئی کی دو خالص گھی سے چپڑی ہوئی روٹیاں رکھ کر میں سکول کو سدھارتا تھا۔ سکول سے واپس آ کر بابا کے ساتھ جانوروں کا چارہ تیار کرنا، جانوروں کو کھلانا، جمعہ والے دن تڑکے اٹھ کر بابا کے ساتھ ہل جوتنا، بگائی کرنا، جانوروں کو پندرہ پندرہ میل دُور ڈنگر ہسپتال پیدل لے کر جانا بھی میری ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ ان مصروفیات کے باوجود میں اپنا شوق بھی پورا کرتا تھا۔ بچپن ہی سے مجھے کسرت کا شوق تھا۔ میری کسرت کا یہ حال تھا کہ دس سال کی عمر میں میری چھاتی ۳۸ اور میری کمر ۲۰ انچ کے سائز کی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں میری چھاتی ۴۸ انچ اور میری کمر ۲۲ انچ تھی۔ میرے کندھے ۳۰ انچ ہوتے تھے۔ مجھے اپنے کندھوں پر ہمیشہ ناز رہا ہے۔ بارہ سال کی عمر ہی سے میرے کندھے اتنے طاقتور تھے کہ میں گندم کی ایک بوری ایک کندھے اور دوسری دوسرے کندھے پر اٹھا لیتا تھا۔ ایک دن بابا کا گدھا بیمار تھا اور گھر میں آٹا ختم ہوا پڑا تھا۔ میں چودہ میل دُور اپنے کندھوں پر ایک بوری گندم اٹھا کر آٹے والی چکی سے پسوا کر پیدل لے آیا تھا۔ ایک مرتبہ ہمارے ہل کا پھل ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے ہل کا پھل کندھے پر رکھا اور آٹھ میل دور پیدل چل کر کریم بخش لوہار سے بنوا کر لے آیا۔ کیا مجال کہ کبھی میں نے ذرا بھی وزن محسوس کیا ہو۔ ایک مرتبہ ہمارا بیل بیمار پڑ گیا تو میں نے اپنے مضبوط کندھوں سے ہل کھینچا تھا اور کیا مجال ذرا بھی مجھے محسوس ہوا ہو۔

یہاں پر ہی بس نہیں میرے کندھوں نے دنیا کا ہر بوجھ برداشت کیا ہے ساٹھ سال کی عمر میں میرے کندھے اتنے مضبوط تھے کہ سائیں محمد شریف جب ہمارے گاؤں کا نمبردار بنا تو میں ایک بھرے جلوس میں اسے کندھوں پر اُٹھا کر اس کے گاؤں تک چھوڑ آیا۔ پینسٹھ سال کی عمر میں انور پہلوان کو اس کی کشتی جیتنے کی خوشی میں ایک گھنٹہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر مسلسل اور بے تکان ناچا تھا۔ میں اپنی ستر سالہ زندگی میں نہ آج تک کسی حکیم اور ڈاکٹر کے پاس گیا ہوں اور نہ ہی کبھی بیمار ہوا ہوں۔ مجھے یاد نہیں میں نے زندگی میں کبھی اسپرو کی ایک گولی تک کھائی ہو۔ ڈاکٹر صاحب مجھے کوئی بیماری نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔

میرے سامنے لیٹا ہوا یہ صحت مند بوڑھا اپنی رام کہانی اور اپنی صحت مندی کے بارے میں پچھلے ایک گھنٹے سے بولے جا رہا تھا۔ میں چند روز پہلے ایک دیہی کلینک میں ڈاکٹر کے طور پر تعینات ہو کر آیا تھا۔ اور ابھی ایک گھنٹہ پہلے لوگ اس بے ہوش بوڑھے کو ایک چارپائی پر لے کر آئے تھے کہ یہ ایک جنازے کو کندھا دیتے ہوئے بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ اس کے کندھے کو معمولی چوٹ بھی آئی تھی۔ اب جب سے یہ بوڑھا ہوش میں آیا تھا اپنی صحت مندی پر بولے ہی جا رہا تھا اور میری ایک بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔

اگر تم اتنے صحت مند ہو تو پھر تم جنازے کو کندھا دیتے وقت بے ہوش ہو کر کیوں گرے تھے؟ میں نے بوڑھے کریم سے پوچھا، میرے کندھوں پر اب سے پہلے کبھی اتنا وزنی بوجھ نہیں پڑا تھا ڈاکٹر صاب۔ خدا کسی باپ کے کندھوں پر اپنی جوان اولاد کے جنازے کا بوجھ نہ ڈالے، یہ کہہ کر بوڑھا کریم میری گود میں سر رکھے کسی بچے کی طرح دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

آخری مصرعہ

مجھے فرصت ہی فرصت ہے
سویرے جلد اُٹھنا ہے
نہ شب کو دیر سے سونا
کہیں باہر نہیں جانا
کسی سے بھی نہیں ملنا
نہ کوئی فکر لاحق ہے
نہ کوئی یاد باقی ہے

مگر یہ آخری مصرع
ذرا سا جھوٹ لگتا ہے

"برقِ ستم"

وحیدہ نسیم

(●)

روشن ہوں دل کے داغ تو لب پر فغاں کہاں
اے ہم صفیر آتش گل میں دھواں کہاں

ہے نام آشیاں کا مگر آشیاں کہاں
نکھرے ہوئے ہیں خاک میں تنکے کہاں کہاں

اٹھ اٹھ کے پوچھتا ہی رہا راہ کا غبار
کہتا مگر یہ کون لٹا کارواں کہاں

باقی نہیں ہیں جیب و گریباں کے تار بھی
لکھیں گے اے بہار تری داستاں کہاں

ہم اجنبی ہیں آج بھی اپنے دیار میں
ہر شخص پوچھتا ہے یہی تم یہاں کہاں

دیکھو کہ اب ہے برق ستم کی نظر کدھر
پوچھو نہ یہ چمن میں جلے آشیاں کہاں

عالم گزر رہا ہے عجب اہل درد پر
ہو دل میں مدعا بھی تو منہ میں زباں کہاں

اپنی خوشی وجود گلستاں پہ اے نسیمؔ
مانا کہ وہ سکون نشیمن یہاں کہاں

○

عبداللہ جاوید

(کینیڈا)

مسکرانا بہت آساں تھا کسی کے ہو تے
اب یہ عالم ہے کہ روتے ہیں سبھی کے ہوتے

آسمانوں سے اترنے میں اسے دیر لگی
ہم بھی تا خیر سے آتے تو اسی کے ہو تے

مانگ کر پینے کی عادت نہیں ڈالی اب تک
ہاتھ پھیلائے نہیں تشنہ لبی کے ہو تے

با خبر ہونے میں کیا کیا نہیں کھویا ہم نے
اس سے بہتر تو یہ تھا، بے خبری کے ہو تے

یوں دکھانے کو عدالت بھی ہے میزان بھی ہے
اصل سامان بھی کچھ داد رسی کے ہوتے

وہ زمانہ ہو کہ یہ ایک ہی رشتہ اپنا
ہر زمانے میں حسینؓ ابنِ علیؓ کے ہو تے

لحظہ بھر ہی سہی اپنے تئیں سوچو جاویدؔ
عشق کرنے کو چلے کج کُلہی کے ہو تے

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

چین جب تیز ہوا لے جائے
روشنی کالی گھٹا لے جائے

اس کی خطر میں یہاں ہوں کب تک
آ کے اب میری دعا لے جائے

گھر میں بیٹھوں تو اٹھا دیتا ہے
سیر کا شوق لگا لے جائے

دشت در دشت مسافت ہے کڑی
مجھ کو دریا ہی بہا لے جائے

میں نے وہ شعر سنایا ہے یہاں
شہر کا شہر اڑا لے جائے

خشک پتے نے سنبھالا ہے مجھے
اب کوئی آ کے ہرا لے جائے

میری آنکھوں کو لیے جائے نظر
میرا دل تیری ادا لے جائے

چاند کا پیار لیے جائے چکور
اور رفتار ہما لے جائے

رات جاتی ہے تو جائے ثاقبؔ
مجھ کو دامن میں چھپا لے جائے

○

زاہد سعید زاہد
(نیویارک)

اشکوں کا طوفان کہاں تک
جینے کا تاوان کہاں تک

آؤ پتھر مار کے دیکھیں
زندہ ہے، انسان کہاں تک

مان تو لُوں مَیں تیری باتیں
لیکن میری جان کہاں تک

اتنی قسمیں کیوں کھاتے ہو
باتوں میں قرآن کہاں تک

جھوٹی باتیں کر کے دیکھیں
دُنیا ہے نادان کہاں تک

دل کو پڑھنا سیکھو، زاہدؔ!
چہروں کی پہچان کہاں تک

فیصل راجہ (دوبئی)

کیا تماشا دکھا رہی ہے مجھے
عمر بڑھ کر گھٹا رہی ہے مجھے

تم زمانے کی رونقوں میں گم
اور تنہائی کھا رہی ہے مجھے

میں جدا تجھ سے ہو چکا لیکن
تیری چاہت نبھا رہی ہے مجھے

اک لرزتا ہوا چراغ ہوں میں
سانس میری بجھا رہی ہے مجھے

اے انا تیرے مشورے کیا ہیں
خود پرستی سکھا رہی ہے مجھے

مجھ سے تیری یہ بے حسی فیصل
دیکھ پتھر بنا رہی ہے مجھے

نذیر قیصر

(لاہور)

یوں تو سونے کو بھی سویا جا سکتا ہے
رات ابھی باقی ہے رویا جا سکتا ہے

نیند سے باہر پڑے ہوئے دوسایوں کو
ایک دیئے کی لو میں پرویا جا سکتا ہے

تیغ کی لہر لبوں سے چومی جا سکتی ہے
کوئی خواب لہو میں بویا جا سکتا ہے

اس شبنم میں ہونٹ بھگوئے جا سکتے ہیں
ان رنگوں میں ہاتھ ڈبویا جا سکتا ہے

ساری راتیں سونے والی ہوتی ہیں
کبھی کبھی دن کو بھی سویا جا سکتا ہے

احمد سوز

(ممبئی)

روٹیاں اپنی بیل لیتا ہوں
اپنی گاڑی دھکیل لیتا ہوں

مجھے آتا ہے خود کو خوش رکھنا
بیٹھ کر خود سے کھیل لیتا ہوں

دوسروں سے گلہ نہیں کرتا
جو بھی ہو خود ہی جھیل لیتا ہوں

طیش جب آنے لگتا ہے مجھ کو
سر پہ پانی انڈیل لیتا ہوں

جیسے تیسے گزر رہی ہے سوز
زندگی اپنی ٹھیل لیتا ہوں

نسیم سحر

(راولپنڈی)

اب یہ عالم ہے مِرے شہر کی ویرانی کا
کوچے کوچے میں ہے نظّارہ بیابانی کا

میری بستی میں تو ہے تیرگیوں کا ڈیرہ !
فائدہ کیا مہ و خورشید کی تابانی کا

مُجھ میں تو پہلے ہی رہتے ہیں خرابے اتنے !
''حکم ہے مجھ کو خرابوں کی نگہبانی کا''

پوچھنا ہے جو تُجھے، اُس کے خدوخال سے پوچھ
ماجرا پوچھ نہ مُجھ سے مِری حیرانی کا

اپنے اندر کا سفر کر نہیں پائے اب تک
جن کو ہے زعم بہت اپنی جہاں بانی کا

اپنے انداز میں کہتا ہوں مَیں اشعار نسیمؔ
مِیرؔ کا لہجہ نہیں، رنگ نہیں فانیؔ کا

ارشد سعید
(آسٹریلیا)

ڈھونڈتا رہتا تھا جس کو وہ نظارہ کہیں تھا
میری قسمت کا ستارا بھی ستارا کہیں تھا

ڈوبتی ناؤ کو دیکھا سرِ منزل میں نے
تھی سمندر کی ہوا، اور کنارا کہیں تھا

سرد چہرے پہ سجے لفظ تھے جو بن کی چمک
آنکھ میں اس کی بھی شائد کہ اشارہ کہیں تھا

رات محفل میں رہا حسنِ خیالِ جاناں
گوشہِ یاد میں اک دوست بھی پیارا کہیں تھا

گرم آنسو بھی وہاں تھے مری آہیں بھی وہاں
بوجھ تھا دل کا، کسی نے جو اتارا کہیں تھا

خواب میں منظرِ خوش رنگ جو دیکھا ارشدؔ
اُس نظارے میں بھی اک شوخ دلآرا کہیں تھا

○

مبارک صدیقی
(یوکے)

خزاں کی رت میں گلاب لہجہ بنا کے رکھنا کمال یہ ہے
ہوا کی زد پہ دیا جلانا جلا کے رکھنا کمال یہ ہے

ذرا سی لغزش پہ توڑ دیتے ہیں سب تعلق زمانے والے
سو ایسے ویسوں سے بھی تعلق بنا کے رکھنا کمال یہ ہے

کسی کو دینا یہ مشورہ کہ وہ دکھ بچھڑنے کا بھول جائے
اور ایسے لمحے میں اپنے آنسو چھپا کے رکھنا کمال یہ ہے

خیال اپنا مزاج اپنا پسند اپنی کمال کیا ہے
جو یار چاہے وہ حال اپنا بنا کے رکھنا کمال یہ ہے

کسی کی رہ سے خدا کی خاطر اٹھا کے کانٹے ہٹا کے پتھر
پھر اس کے آگے نگاہ اپنی جھکا کے رکھنا کمال یہ ہے

وہ جس کو دیکھے تو دکھ کا لشکر بھی لڑکھڑائے شکست کھائے
لبوں پہ اپنے وہ مسکراہٹ سجا کے رکھنا کمال یہ ہے

○

ریچھ

فرخندہ شمیم
(راولپنڈی)

ریچھ کی قلابازیاں ہر جانے آنے والے کو اپنی جانب متوجہ کر رہی تھیں۔۔۔اس کے پاؤں میں گھنگرو بھی بندھے تھے جن کی جھنکار توجہ کو مہمیز کر رہی تھی۔۔۔ریچھ اچھل اچھل کر کرتب دکھا رہا تھا۔۔۔تماش بین کبھی خوشی سے تالیاں بجاتے اور کبھی ریچھ کی جولانیوں سے ڈر کر دو قدم پیچھے بھی ہٹ جاتے تھے۔۔۔تاہم وہ بے خوف تھے کیونکہ۔ریچھ کے دانت نکالے جا چکے تھے۔۔۔ تماشا دکھانے والا اپنے مخصوص چغے میں ریچھ کی طاقت ور رسی سے اسے کنٹرول کرتا اور تماش بینوں سے پیسے بٹورتا جا رہا تھا۔۔۔اسے ریچھ کو ہدایات دینے کا فن پوری طرح آتا تھا اور ریچھ بھی اسے مکمل سمجھ رہا تھا۔۔۔دونوں کو یقین تھا کہ وہ اپنے اپنے شعبے میں حسن کارکردگی کا صدارتی تمغہ جیتنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔۔۔یہ ان دنوں کی بات ہے جب ریچھ سڑکوں پر ناچتے تھے۔آج کل اہم مقامات پر ناچتے ہیں اور ٹیکنالوجی کی مدد سے نت نئے تماشے کرتے ہیں۔

ان دنوں ابھی امپرومنٹ نہیں ہوئی تھی۔۔۔بچے، بوڑھے اور جوان بے فکر ہو کر میدانوں میں ریچھ کے تماشے دیکھتے تھے اور اس کے شعبدوں پر خوش ہو کے سکے اچھالنا اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے تھے۔۔۔بچیاں بھی اس وقت ریچھ سے نہیں ڈرتی تھیں۔۔۔خواہ انہوں نے چھوٹی چھوٹی فراکیں ہی کیوں نہ پہن رکھی ہوں۔۔۔یا سکول سے پیدل گھر واپس آ رہی ہوں اور راستے میں ریچھ تماشا دیکھنے میں لگ گئی ہوں۔۔۔تاخیر کے باوجود اپنے گھر پہنچ جانا ان کے مقدر میں لکھا ہوا تھا۔

شاید یہی اعتماد تھا کہ بچیاں چھوٹے چھوٹے کپڑوں میں بھی کھیلتی رہتی تھیں۔۔۔انہی بچیوں میں سیا یک ریچھ کے ساتھ بہت مانوس ہو گء تھی۔۔۔ اسے ریچھ کے ساتھ دوستی کا شوق ہو گیا اور وہ اپنی پاکٹ منی سے پیسے بچا بچا کر ریچھ کے لئے کھانے پینے کی چیزیں خریدتی اور سکول کے راستے میں پڑنے والے چڑیا گھر میں ریچھ کے پنجرے کے پاس رک کر اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی تھی۔،ریچھ بھی گویا اس کی باتوں کا جواب دیتا تھا۔بچی چاچا چڑیا گھر سے پوچھ چکی تھی کہ ریچھ کے دانت تو نہیں ہیں۔۔۔چاچا نے اسے تسلی کرا دی تھی کہ ریچھ سدھایا ہوا ہے اور بے ضرر ہے۔۔۔ویسے بھی وہ قیدی ہے اور پنجرہ مکیں میں جرات نہیں ہوتی، یہ تماشے تو آزاد منش کرتے ہیں۔۔۔بچی ریچھ کے پنجرے میں کھانے پینے کی چیزیں ڈالتی اور واپس آ جاتی چڑیا گھر کا ملازم بچی اور ریچھ کی اس عجیب رفاقت پر حیران رہ جاتا۔۔۔تاہم وہ یہ ضرور چیک کرتا تھا کہ بچی ریچھ کو کیا کیا کھلا رہی ہے۔۔۔یہ دیکھنا اس کی ڈیوٹی جو تھی۔۔۔تعجب کی بات نہیں، ایسا ایک زمانے میں ہوتا بھی تھا۔۔۔اور پھر ابھی اتنا زمانہ بھی کہاں گزرا ہے۔۔۔ٹیکنالوجی سے ذرا پہلے تک کا تو قصہ ہے یہ!

نئے ہزاریے نے دراصل بہت سی سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔۔۔بحر منجمد شمالی بحر منجمد جنوبی کے ساتھ کھڑے کھڑے باتیں کر لیتا ہے، کون شخص کس ملک میں کون سے رنگ کے کپڑے پہنے کہاں گھوم رہا ہے، یہ بھی پتہ چل جاتا ہے، بس اس ملک میں اپنی ایجنسی کا ہونا ضروری ہے۔۔جو ٹارگٹ کا اس طرح پیچھا کر سکے جس طرح کوئی کتا کسی بوٹی کا تعاقب کرتا ہے۔

ٹیکنالوجی میں یہ ایک عام بات ہے کہ کسی کا منہ اور کسی کا ننگا بدن اٹھا کر پتوں سے جوڑ دیا جائے اور پھر خوب پیسے کمائے جائیں۔۔۔وہ وقت بھی زیادہ دور نہیں ہے کہ برمودا مثلث کا سارا نحس بحری کپتانوں کی عیاشی کا روپ لیلے اور جہاز کے عرشے ماتم کرنا چھوڑ دیں۔

ٹیکنالوجی نے بہت سی حیرتیں پیدا کر دی ہیں، لیکن معصومیت حیرانیوں سے پاک ہوتی ہے۔۔۔وہ تو بس سکول سے گھر اور یا کبھی راستے میں چڑیا گھر کے جانوروں سے ملنے چلی جاتی ہے۔۔۔اکیلی بھی ہو تو بے خوف ہوتی ہے، سکول وین کے ڈرائیور انکل اور چڑیا گھر کے چاچا زو zoo اس کی حفاظت کرتے ہیں، اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اس کے گالوں کو پیار سے چھو لیتے ہیں۔۔۔لیکن۔۔،اس روز؟ یہ کیا

روڈ میپ میں اچانک تبدیلی لائی گئی۔۔۔یہ حکومت کی طرف سے نہیں تھی، بس ریاست کے اندر ریاست بنانا ایک معمول بن چکا تھا۔۔۔سیاست اور مذہب ایک پیج پر نہیں آ رہے تھے اور لاٹھیاں تیار کی جا رہی تھیں۔

ویگن ڈرائیور نے بتایا کہ شہر میں دھرنا ہے، پہلے اس بچی کو اور بعد میں باقی بچوں کو سکول پہنچائے گا۔۔۔ورنہ دوسرے بچے بھی لیٹ ہو جائیں گے۔۔۔کچی آبادیوں میں رہنے والوں کو ایسی قربانیاں اکثر دینی پڑتی ہیں حالانکہ ان کے شناختی کارڈ کا رنگ کوئی علیحدہ نہیں ہے۔

تمام بچے ایک ایک کر کے اپنے اپنے سکول میں اتار دی؟ گئے مگر، چھوٹی بچی وین میں اونگتی رہی۔۔۔ڈرائیور انکل نے ونڈ سکرین میں دیکھ دیکھ کر تسلی کر لی تھی، وہ مسلسل نیند میں ہے۔۔۔بے خوابی کے ان لمحوں میں بچی صرف اتنا جان سکی ڈرائیور انکل آج دانتوں والے ریچھ بنے ہوئے ہیں۔۔۔جس نے اپنے نوکیلے دانتوں سے اس کا بستہ اڑا دیا ہے۔

زلزلے نے پوری بستی کی بنیاد ہلا دی
کچی بستیوں میں صف ماتم پر نخالاشہ پڑا تھا

ڈرائیور بھاگ گیا اور ایک پیج پر آنے کی جدوجہد کرنے والے بے خبر رہے۔ بستی تارعنکبوتار کا کوئی اوتار تھی، بچی کے گھر میں ایک تانتا تھا مخلوق کا جو بندھا ہوا تھا۔۔۔اس کی ماں ہیجان میں تھی، بے جان بیٹی کا نچڑا ہوا چہرہ نامحرموں سے چھپانے کی وحشت میں بار بار اپنا دوپٹہ بدل رہی تھی۔۔۔لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

باقی صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ کیجیے

''لمحوں نے خطا کی۔۔۔!''

سید احمد قادری
(گیا، بہار)

مرزا صفیرالدین ہجرت درہجرت کے کرب کو جھیلتے ہوئے ،اب سے دس سال قبل جب امریکہ آئے تھے،تو انہیں ایسا لگا تھا جیسے کڑی دھوپ کی تیز نوکیلی تمازت اورلُو کے تھپیڑوں میں مسلسل چلتے ہوئے اچانک ایک ہرے بھرے باغ کی پر بہار فضا میں آگئے ۔ جہاں ہر طرف پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں ،طرح طرح کے رنگ برنگے خوشنما پھول اوران پھولوں کی خوشبو سے پورا باغ معطر تھا۔ان کے جسم کے رگ وپے میں اترتی ہوئی سرد ہوائیں تھیں۔وہ کئی دنوں تک اس گھنیری ٹھنڈی چھاؤں میں کھڑے ہوکر سرد ہواؤں کو اپنے جسم کے پور پور میں اتارتے رہے ۔مسلسل خاردار اوراندھے راستوں پر چلتے چلتے ان کا جسم لہولہان ہو چکا تھا، پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے اور روح بے چین تھی۔ لیکن چند دنوں میں ہی بیٹا، بہو اوران کے دونوں بچوں کی بے پناہ محبت اور پیار نے ان کے جسم وجان کی ساری تکان اور پریشانیوں کو دور کر دیا تھا۔ دھیرے دھیرے زخم مندمل ہونے لگے تھے۔

مرزا صفیرالدین کو امریکہ میں ہر طرح کی آسائش اور آرام میسر تھا۔ بیٹا، بہواور دونوں بچے ہر وقت ان کی دلجوئی کرتے رہتے ۔گرچہ صبح سویرے ہی بیٹا، بہواپنے اپنے جاب پر نکل جاتے اور بچے اسکول کے لئے روانہ ہوجاتے۔ اس کے بعد اچھا خاصہ وسیع وعریض سجا سجایا گھر،فریز میں طرح طرح کے کھانے پینے کی چیزیں، جو چاہو کھاؤ پیو،ٹی ۔وی دیکھو، نٹ پر دوستوں ،عزیزوں سے باتیں کرو،فیس بک پر سینکڑوں دوستوں کی بھیڑ تھی ،لیکن تنہائی کا عفریت پورے گھر پر قبضہ جمائے رہتا۔شروع کے دنوں میں مرزا صاحب نے اس تنہائی کے عفریت سے بھی دوستی کر لی تھی اوروقت گذاری کے لئے ٹیلی ویژن پر خبریں، سیریئل،انٹرنٹ پر اپنی دلچسپی کے ویب سائٹس،فون پر دوستوں اورعزیزوں سے گھنٹوں گفتگو۔لیکن دھیرے دھیرے ان سب سے بھی دل اچاٹ ہوگیا اور تنہائی کا عفریت انہیں کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔اس سے بچنے کے لئے وہ مختلف کتابوں اور رسالوں میں پناہ لینے کی کوشش کرتے ،لیکن انھیں یہاں بھی پناہ نہیں ملتی۔تھک ہار کر وہ نیند کی پناہ میں جانا چاہتے ،لیکن نیند بھی کوسوں دور کھڑی ان کے حال پر مسکراتی رہتی۔کبھی ہلکی سی نیند آتی بھی تو بچپن کی یادیں، جوانی کی پریشانیاں بند آنکھوں میں سپنا بن کر اترنے لگتیں اور کبھی انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ ان کے سرہانے ان کے ابّا ،اماں، بھائی جان، باجی سب کے سب کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں ،اٹھو جاگو صفیر۔۔۔کتنا سوؤگے ۔۔۔اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھتے،چاروں جانب بے چینی کے عالم میں نظریں دوڑاتے ۔۔۔نہیں یہاں تو کوئی نہیں۔۔۔وہ ہیں اورتنہائی ہے۔ہاں ان لوگوں کی یادیں ضرور ان کے دل ودماغ کو تڑپانے اور آنکھوں کو سمندر بنانے لگتیں۔

اب یہ زندگی انہیں بے کیف لگنے لگی تھی اور یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ اب زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہیں گے ۔۔۔کوئی انہیں بلا رہا ہے ، آجاؤ، صفیر۔۔۔زندگی میں تم نے بہت دکھ جھیلا ہے،لمحوں کی خطا نے کئی دہائیوں کی سزا دی ہے تمہیں۔۔۔سب کو۔۔۔آؤ۔۔۔اب تم بھی آرام کرو!زمانے کی گردشوں کی دھول میں بہت چل چکے۔۔۔اب آرام کرو۔

ایک ویک اینڈ میں، جب سبھی ساتھ مل کر کھانا کھا کر بیٹھے ،خوش گپیوں میں مشغول تھے ،اس دوران ان کا بیٹا مرزا اسلم نے محسوس کیا کہ، بات کرتے کرتے ابّا کہیں گم ہو رہے تھے ، اداس ،اداس سی ان کی آنکھیں خلاء میں کچھ ڈھونڈھ رہی ہیں۔مرزا اسلم نے فکرمند ہوتے ہوئے پوچھا:

''کیا بات ہے ابّا،آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟''

مرزا صفیرالدین، بیٹے کے اچانک اس سوال پر چونک پڑے اور کہا۔

''پریشان۔۔۔ہاں، ہاں۔۔۔بیٹا، میں پریشان تو ہوں۔دراصل ان دنوں مجھے اپنا ملک بہت یاد آرہا ہے اور میری دلی خواہش ہو رہی ہے کہ کچھ دنوں کے لئے میں اپنے ملک جاؤں اور۔۔۔''

مرزا صفیرالدین کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہو پائی تھی کہ بیٹا مرزا اسلم نے چونکتے اور پھر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کون سا ملک ابّا۔۔۔''؟

اس سوال پر مرزا صفیرالدین بھی چونک پڑے اور خود ہی بڑبڑانے لگے۔

''ملک کون سا ملک...؟میرا کون سا ملک۔۔۔؟،جسے میں اپنا کہوں ۔۔۔وہ، یہ یا وہ۔۔۔''

اور پھر اپنے بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

''ہاں ،بیٹا ،میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں ۔۔۔میں اس ملک کی بات کر رہا ہوں، جہاں ہم اپنی جڑوں کو چھوڑ آئے ،شاندار مستقبل سجانے کے لئے ،لیکن شاندار مستقبل تو چھوڑو، وہاں پناہ تک دینے کو کوئی تیار نہیں ہوا کہ ہم لوگوں کی وہاں آمد سے،ان لوگوں کا روشن مستقبل، اندھیرے میں ڈوب جانے کا خدشہ تھا اور ایک بار ہم اپنی جڑوں سے جو اکھڑے ،تو پھر ہمیں کہیں پناہ نہیں ملی۔۔۔دراصل ادھر کئی دنوں سے مسلسل ابّا میرے خوابوں میں آرہے ہیں،ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ۔۔۔مجھے ماضی کے دھندلکے میں لے جاتا ہے۔۔۔میں ان کی گود میں طرح طرح کی شرارتیں کرتا۔۔۔کبھی وہ میرے گالوں کو چومتے ، تو جواب میں، میں بھی ان کے گالوں اور پیشانی کو چومتا۔۔۔امّاں کی بھی بہت یاد آ رہی ہے۔میں اپنے ابّا کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنا چاہتا ہوں اور قبر کے قریب بیٹھ کر ان سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔میرے ابّا تو مجھے دس سال کی عمر

میں ہی روتا بلکتا چھوڑ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے تھے اور ان کے گذر جانے کے دوسال بعد ہی اماں اور ماموں وغیرہ نے آخری بار ان کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنے کی تاکید کی تھی۔اس وقت،ان کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔۔۔اور میں جس دن فاتحہ پڑھ کر گھر آیا تھا،اس کے دوسرے ہی دن تو وہاں سے ہم لوگ ایک نئے اور اندھے سفر پر اپنا سب کچھ چھوڑ کر نئی اور شاندار دنیا بسانے کے لئے اس ٹرین سے روانہ ہوئے تھے،جس ٹرین میں لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح سوار تھے۔ ہر کسی کے چہرے سے پریشانیاں جھلک رہی تھیں،لیکن آنکھوں میں سنہری خواب بسے تھے۔۔۔لگاتار کئی دنوں تک رُک رُک کر مسافت طئے کرنے کے بعد جب ہم بظاہر منزل پر پہنچے۔۔۔تو منزل کا کہیں پتہ نہیں تھا۔۔۔آس پاس ہر چہار جانب اداسیاں اور مایوسیاں چھائی ہوئی تھیں۔ سارے سنہری خواب کو بے دردوقت اور حالات اور ایک غلط فیصلے نے چکنا چور کر دئے تھے۔بے پناہی جیسے ہمارا مقدر بن گیا تھا۔۔۔برسہابرس تک ہم منزل کے متلاشی رہے۔۔۔میں نے بچپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا تھا،اور اس وقت تک ہماری اپنی کوئی پہچان نہیں تھی۔۔۔اجنبیوں کی طرح ادھر سے ادھر بھٹکتے رہے،منزل کی تلاش میں۔۔۔بالکل بنجارہ بن گئے تھے ہم لوگ،کبھی یہاں خیمہ،کبھی وہاں خیمہ۔۔۔ جسم زخموں سے چور اور روح لہولہان۔۔۔ایسے میں اپنی جڑیں بہت یاد آتی تھیں۔۔۔وہ کشادہ سا گھر۔۔۔گھر کے اندر بڑا سا آنگن۔۔۔گھر کے باہر وسیع و عریض دالان۔۔۔اور اس دالان کے آگے دانہ چگتی ہوئی مرغیاں،چن چن، چن چن کرتی ہوئی چینا مرغیاں۔۔۔گھر کے سامنے کا تالاب،تالاب میں طرح طرح کی اچھلتی تیرتی مچھلیاں،اٹھکھیلیاں کرتے ہنس بطخ اور چھوٹی بطخیں۔۔۔ مچھلی کے شکار کے لئے تالاب کے کنارے اترتے ہوئے بگلوں کے غول ،تالاب کے اردگرد جھومتے گاتے طرح طرح کے پرندے۔۔۔اور تالاب کے اردگرد لہلہاتے کھیت۔۔۔کھیتوں سے باسمتی چاول کی پھوٹتی بالیوں سے معطر کرنے والی خوشبو۔۔۔اور پھر چند قدم کے فاصلے پر میرا مکتب۔۔۔جہاں مولوی خیرالدین صاحب کے ہاتھ سے کھجور کی چھڑی شائد ہی الگ ہوتی اور ہر ایک غلطی پر ایک چھڑی،سڑاپ سے پیٹھ پر لگتی۔اس وقت کی،اس چھڑی کی وہ مار اور بعد میں ماسٹر بدری نرائن جی کے خلوص ومحبت کے ساتھ دی گئی تعلیم نے زندگی کے بوجھ کو ڈھونے میں بہت مدد کی۔۔۔ان دونوں کی بھی بہت یاد آتی ہے۔۔۔ ماسٹر بدری نرائن جی کا بیٹا کشور میرا بہت اچھا دوست تھا۔۔۔جب کبھی میں اس کے گھر جاتا تو اس کی ماں بڑے پیار سے مجھے کبھی ٹھیکوا،کبھی بتاشہ اور کبھی اصل گھی کا میٹھی کا لڈو کھانے کو دیتی تھیں۔دیوالی کے روز ان کے گھر پر جس طرح روایتی انداز میں چراغاں کیا جاتا تھا،اس سے نہ صرف ان کا گھر بلکہ آس پاس کے گھر بھی روشن ہوجاتے،جس کی خوبصورتی دیکھنے لائق ہوتی اور ہم سبھی مل کر پھُل جھڑیاں،گھرنی،انار وغیرہ کی روشنی سے لطف اٹھاتے۔کھانے کو دیوالی کی مٹھائیاں بھی ملتیں،خاص طور پر جھرواکالڈو اور لکھ ٹھو کی لذت کو میں آج بھی نہیں بھولا ہوں۔۔۔عید بقرعید،شب برات جیسے تہوار پر کشور،اس کی سب بہنیں صبح سویرے ہی میرے گھر آجاتیں اور پورا گھر اس دن ایک الگ نظارہ پیش کرتا، وہ سب جب گھر جانے لگتے تو انھیں پربیاں بھی اماں دیتیں،اور وہ سب خوش خوش سبھوں کو سلام کرتے،ان کے پاؤں چھوتے واپس جاتے۔۔۔لیکن سب کچھ ختم ہوگیا،سب بچھڑ گئے،سب کچھ اجڑ گیا۔۔۔ایک بار جو ہم اپنی جڑوں سے اکھڑے تو کہیں امان نصیب نہیں ہوئی مسلسل سفر۔۔۔سفر۔۔۔ہجرت۔۔۔در ہجرت۔۔۔ابّا کی قبر ہندوستان میں تو اماں بنگلہ دیش میں آرام فرما ہیں،باجی، پاکستان میں اور بھائی جان جرمنی میں۔۔۔اور۔۔۔اور۔۔۔'

یہ کہتے کہتے مرزا صفیرالدین سسکنے لگے،ان کی آنکھوں سے یادیں آنسو بن کر نکلنے لگے۔

اس طرح انھیں روتے ہوئے دیکھ کر ان کے بیٹا،بہو اور دونوں بچے سب حیران وپریشان ہوگئے تھے۔۔۔ان کی رقت آمیز باتیں سنتے ہوئے،ان کے بیٹا اور بہو کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے تھے۔ان کا بڑا پوتا امجد بھی بہت تعجب سے اپنے دادا کو روتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج دڈو بچوں کی طرح رو کیوں رہے ہیں؟ وہ صوفہ سے اٹھا اور اپنے دڈو کے قریب آکر اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں سے ان کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو خاموشی سے پوچھنے لگا اور فرط جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے دڈو نے اپنے پوتے کو سینے سے لگالیا اور سسکیاں بھرتے ہوئے بولے۔

''بیٹا تم اپنی جڑوں کو کبھی مت چھوڑنا،خواہ کیسا ہی طوفان آئے، آندھی آئے،اپنی جڑوں پر ہمیشہ قائم رہنا۔

ادلا بدلی

ابراہام لنکن نے کہا تھا:

''اگر میرے پاس ایک ڈالر ہو۔۔۔اور تمہارے پاس بھی ایک ڈالر ہو اور ہم ادلا بدلی کریں تو ہم دونوں کے پاس ایک ڈالر ہی ہوگا! لیکن!!! اگر ایک خیال میرے پاس ہو۔۔۔اور ایک خیال آپ کے پاس ہو اور ہم ادلا بدلی کریں تو ہم دونوں کے پاس دو دو خیال ہوجائیں گے''

زندگی کے حوالے سے اپنے تجربات،مشاہدات اور خیالات شیئر کرتے رہا کریں۔۔۔ہوسکتا ہے کہ آپ کا آئیڈیا کسی انسان کی روح میں جان ڈال دے۔۔۔!!!

دھوپ چھاؤں

رعنا کوثر

(نیویارک)

پیاری دبلی پتلی ہنستی مسکراتی اماں عمر کے مراحل طے کرتی ہوئی عمر رسیدہ ہونے کو آ رہی تھیں۔ عمر کے ساتھ کچھ اعضاء نے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور کچھ ابھی بھی کام کے تھے۔ جیسے کے کان جن سے اب سننا ممکن نہیں رہا تھا۔ مگر بھلا ہو نئے آلات کا کہ ان کو کان میں لگانے والا آلہ خرید کر دے دیا گیا تھا اور وہ اس سے کچھ سن لیتی تھیں۔ آنکھوں کا آپریشن ہو چکا تھا اس لیے دکھائی دے جاتا تھا۔ ہاتھ پیر ابھی چل رہے تھے۔ دل میں بھی ایک آلہ فٹ تھا۔ مگر حوصلہ، ہمت جوان تھا اس لیے رعب سے رہتیں اور کڑک دار آواز میں بات کرتیں۔

کہنے کو پانچ بچے تین بیٹیاں اور دو بیٹے سب امریکہ میں آباد۔ اماں کو بھی بلایا تھا یہاں وہ نیویارک میں ایک اونچی بلڈنگ کے دو کمروں کے فلیٹ میں اپنی سب سے چھوٹی بیٹی ثناء کے ساتھ رہتیں۔ کمرہ بہت آرام دہ تھا اس میں لگے ایک نئے زمانے کے پرسکون سے بستر پر اماں کا پیر ما تھا وہ سامنے کی کھڑکی سے جھانک کر باہر بھی دیکھ لیتیں سڑک پر کھڑکی کھلتی اور گاڑیاں چلتے پھرتے لوگ نظر آتے ان کا بھی دل بہل جاتا۔ ثناء تو کام پر چلی جاتی۔

اتوار کا دن ثناء گھر میں گزارتی صفائی ستھرائی کر کے وہ فون لے کر اماں کے کمرے میں آ گئی اور بولی اماں میں یہیں بیٹھی ہوں۔ کرونا وائرس ایسا وبائی مرض پھیلا تھا کہ آنا جانا ہی رک گیا تھا۔ اماں بولیں بیٹی ذرا میرا کان کا آلہ تو دے۔ ثناء نے احتیاط سے آلہ ان کے کان میں پہنایا۔ ''باہر بڑا سناٹا ہے اب ٹریفک نہیں چلتا کیا'' اماں بولیں اور کوئی آتا جاتا بھی نہیں۔ پھر خود ہی ان کو یاد آیا بولیں ہاں تم نے بتایا تھا کوئی وبا چلی ہے، جی اماں۔ ثناء نے کہا۔ شکر ہے اماں کو یاد آ گیا ورنہ وہ اکثر بھول ہی جاتیں اور ثناء سے پوچھتیں ''سب خیریت ہے کہیں کوئی بیمار تو نہیں اور کبھی تو بہت رسان سے کہتیں بیٹا سب کو کھانے پر بلا لیا کرو۔ بہت بری عادت ہے۔ اپنے بہن بھائیوں سے ملا کرو۔ اور ثناء بھی سمجھانے بیٹھ جاتی کہ ایک خطرناک جراثیم کی وجہ سے لوگ گھروں سے نہیں نکل رہے ہیں۔ حکومت نے منع کیا ہے۔ کبھی خاموشی سے سر ہلا کر کہتی اچھا بلا لوں گی آپ فکر نہیں کریں۔

وقت بوڑھے اور جوان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا۔ وہ سب کی عمر بڑھاتا رہتا ہے، سب کے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ آنا تو ویسے ہی کم تھا مگر فون ضرور آتے۔ وہ نئی ایجادات پر خوش ہوتیں دیکھو اللہ کا شکر ادا کرو کتنی دور بیٹھے ہیں اور سب سے بات بھی ہو جاتی ہے اور شکل بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اماں کی یادداشت بھی کبھی کبھار جواب دے جاتی ایک دن ثناء سے پوچھ بیٹھیں۔ بیٹا میرے کتنے بچے ہیں۔ وہ دکھ کو محسوس کر کے بھی شگفتگی سے بولی اماں! بچے بھی بھول گئیں آپ۔ اماں نے ذہن پر زور دیا اور بولیں ''پانچ ہیں'' نادولڑکے اور تین لڑکیاں؛ بہت عرصے سے کوئی آیا نہیں اس وبا کی وجہ سے۔ اتنی دفعہ یہ لفظ دہرایا گیا تھا کیا اماں جو اکثر بھول جاتی تھیں اب ان کو بھی یاد رہنے لگا تھا۔ بلکہ وہ جب بھی ڈاکٹر کے پاس جاتیں ثناء ماسک کا بہت خیال رکھتی منہ اور ناک بند ہونے سے ان پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔

ثناء اماں کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ اس سے بڑی نازتھی۔ پھر دو بھائی عاطف اور عاکف اور پھر بڑی آپا عذرا۔ عاطف نے جب فارمیسی کا امتحان پاس کیا تو امریکہ والوں نے آسانی سے انہیں ویزا دے دیا۔ وہ یہاں آ کر جیسے ہی بہتر طور پر کام کرنے لگے انہوں نے سب کو بلا لیا۔ اماں بہت خوش تھیں۔ جب آئیں تھیں تو خوب چلتی پھرتی تھیں طاقت تھی۔

عذرا آپا اپنے میاں اور بچوں سمیت آئیں تھیں ان کو تو الگ فلیٹ لے دیا۔ عاطف کی شادی پاکستان میں خاندان میں ہی کر دی اور عاکف کو نیویارک کی ایک اچھی فیملی کی لڑکی مل گئی۔ ناز کی بھی پاکستان جا کر شادی کر دی۔ اماں عاطف اور ثناء ہی اب فلیٹ میں رہ گئے تھے۔ اس کی بیوی کو پاکستان سے آنا تھا۔ اسی دوران میں ثناء نے کالج میں داخلہ لے لیا وہ گریجویٹ کرنے کی دھن میں تھی کہ اس کی بھابھی نے ایک رشتہ بتایا اچھے لوگ تھے۔ پاکستان سے آئے چند سال ہوئے تھے۔ لڑکا انجینئر تھا مگر گرین کارڈ نہیں تھا۔ ثناء کا فوراً وہاں رشتہ کر دیا گیا۔ بلکہ لڑکے والوں کے کہنے پر نکاح ہی کر دیا کہ جب وہ ایک سال بعد پڑھائی ختم کرے گی تو رخصتی کر دی جائے گی۔ اس دوران لڑکے کے پیپر بھی بن جائیں گے اور جاب بھی مل جائے گی۔ چلو جی فرصت ہوئی اماں خوش تھیں۔ عاطف کی بیوی بھی پاکستان سے آ گئی تھی۔ اس نے بھی الگ فلیٹ لے لیا۔ اب اماں اور ثناء ساتھ رہتیں۔ ثناء اکثر اس لڑکے سے بات کر لیتی جس سے اس کا نکاح ہوا تھا۔ اس کو محسوس ہوا وہ لڑکا اس کی ذات سے زیادہ اس کے گرین کارڈ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ خودغرضی اور خودپرستی اس میں نظر آنے لگی تھی۔ آخر ثناء نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اماں نے بہت کہا کہ یہ سب تمہارا وہم ہے۔ بعد میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ناراض بھی ہوئیں مگر ثناء نہ مانی اور وہ نکاح ختم ہو گیا۔

بہن بھائیوں کی مصروفیات بڑھ رہی تھیں۔ عذرا آپا نوکری کرتیں بچوں کے اخراجات تھے۔ میاں پاکستان سے آئے تھے ان کی کوئی کام کرنے کی عادت نہ تھی گھر کے کام کا بوجھ بھی پورا آپا پر تھا۔ ناز اکثر بچوں کو لے کر آتی وہ قریب ہی رہتی تھی۔ عاطف، عاکف نے گھر خرید لیے تھے بہت مصروف رہتے۔

ثناء کا نکاح ٹوٹے کچھ سال ہونے کو آ رہے تھے۔ اس کی تعلیم اور نوکری اچھی تھی مگر اس کے نکاح ختم ہونے نے اسے طلاق یافتہ بنا دیا تھا۔ اب جتنے بھی رشتے آتے وہ یا تو اس کے گرین کارڈ میں دلچسپی لیتے جس سے اس کو چڑ تھی یا پھر خود طلاق یافتہ بچوں کے باپ ہوتے۔ اماں اب بھی چاق و چوبند تھیں۔

مگر دل کی بیماری کا شکار ہوگئیں تھیں۔شوگر بلڈ پریشر ہوتا جارہا تھا۔

ثناء بہت خیال رکھتی وہ جانتی تھی اور کوئی اپنی مصروف زندگی سے وقت نہیں نکال سکتا۔اماں بھی اسی گھر اور اسی بیٹی کی عادی ہوگئیں تھیں۔وہ آپا کے ہاں جاتیں تو ان کے بچے انہیں امریکہ آنے کے بعد بدلے ہوئے نظر آتے۔وہ ان کی انگلش سے پریشان ہو جاتیں۔اماں تیز طرار خاتون تھیں۔تنک کر کہتیں اے انگریزو! اردو تو ایسے بھول گئے جیسے یہیں پیدا ہوئے تھے۔گھر آ کر بھی ثناء کو سناتیں؛ وہ گڑیا ابھی ساتویں میں گئی ہے فیشن دیکھ لو اس کے ''عاطف اور عاکف کی بیویاں نوکری کرتی تھیں اماں جیسے ہی ان کے ہاں رہنے جاتیں۔وہ بہت تھکاوٹ سے بولتیں ''اماں ہم تھک جاتے ہیں اب جب تک آپ ہیں ہمیں کھانا پکا دیا کریں'' اماں ایک دو دن تو پکا دیتیں پھر خود بھی تھک کر بیٹھ جاتیں اس دن سب پیزا کھاتے جو اماں کو ہضم نہ ہوتا وہ اپنے گھر آ کر ثناء سے کہتیں ''شکر ہے اپنا چھوٹا سا فلیٹ ہے ورنہ یہ لوگ تو مجھے نوکر ہی بنا لیتیں''۔

اماں بھی اب ثناء کو محبت سے دیکھ کر دعا کرتیں۔کہ اس کا رشتہ طے ہو جائے وہ بھی اب بوڑھی ہو رہی تھیں۔ثناء کام سے واپس آتی تو کھانا بنا ہوا ہوتا وہ اکثر پکا کر جاتی تھی اماں چاول پکا لیتیں اور اس کا انتظار کرتیں دونوں کھانا کھاتیں ثناء کو اماں دن بھر کی کہانیاں سناتیں۔کس بچے کا فون آیا کون سی پڑوسن گھر آئیں اکثر ان کے گھر میں دن میں خواتین کا آنا جانا رہتا۔کہیں درس ہوتا تو اماں چلی جاتیں۔دن اچھا گزر جاتا۔

کبھی کوئی بہن یا بھائی آ جاتا اماں کو اپنے گھر بھی لے جاتا، ویسے تو ثناء ان سے بہت محبت کرتی مگر جب وہ کہیں جاتیں تو اس کو لگتا جیسے آزادی مل گئی ہے۔وہ جاب سے واپسی پر شاپنگ کرتی کبھی کسی سہیلی کے پاس چلی جاتی ورنہ اماں اس کے انتظار میں بیٹھی ہوتیں اسے دیر ہو جاتی تو دس فون کرتیں۔کہاں ہو بیٹی، اتنی دیر کر دی وہ گھبرا کر کہتیں۔اس لئے وہ سیدھا گھر ہی آ جاتی۔پھر اماں کی عادت تھی وہ چاہتیں ہر کام فوراً ہی ہو جائے یہ کھانا کیوں ٹیبل پر رکھا ہے ابھی تک برتن دھونے میں دیر کیوں کر رہی ہو۔وہ اسے ٹوکتی رہتیں۔وہ اکثر جھنجھلا جاتی مگر جواب دیئے بغیر کام کرتی رہتی کبھی کبھی تو اس کی اور اماں کی ہلکی پھلکی ضد شروع ہو جاتی۔وہ جیسے ہی کھڑکی کے پردے روشنی کے لئے ہٹاتی اماں فوراً کہتیں۔باہر سے سب دیکھ رہا ہے پردہ گراؤ۔وہ سمجھاتی اماں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔روشنی بہت ضروری ہے۔وہ بھی بند نہ کرتی جب تک گھر میں روشنی اور دھوپ آتی وہ پردہ ہٹا کر رکھتی اور اماں ناراض ہوتی رہتیں۔حالانکہ وہ بہت تحمل مزاج تھی اماں کو جواب نہیں دیتی تھی ان کو ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی بس کبھی کبھار کی چھیڑ چھاڑ تھی۔

اماں بھی دھوپ چھاؤں جیسی تھیں ماں تھیں اس کی تنہائی کا سوچ کر گھر میں ہر بات کا دھیان رکھتیں۔ہر کھڑکی دروازہ ان کی نظر میں ہوتا۔دھوپ کی طرح تھیں۔وہ ہر آئے گئے کو اپنی ایسی تپش دکھاتیں کہ کوئی اس کڑکتی دھوپ میں کھڑا ہو کر ثناء کو تنگ نہ کر سکتا۔کوئی دروازے کے قریب بھی آتا تو ایسی کڑک دار آواز میں بولتیں کہ وہ بھاگ جاتا۔کوئی ان کے سوالوں کی گرمی برداشت نہ کر پاتا۔حالانکہ سماعت کمزور ہو چکی تھی مگر ساری حسّیں بیدار تھیں اور چھاؤں بن کر اس کو بہت سکون پہنچاتیں محبت بھری باتیں کرتیں۔پرانے قصے سناتیں گھر کا بے حد خیال رکھتیں کوئی کھڑکی دروازہ کھلا نہ ہو رات کو چولھے بند ہوں لائٹ بند ہو۔ثناء کو ہر فکر سے دور رکھنے کی کوشش کرتیں۔

جہاں اماں عمر کے حساب سے اس کے لئے دھوپ چھاؤں تھیں وہیں ثناء ایک بادِ صبا۔کبھی کبھی اس کو آزادی اچھی لگتی۔وہ سوچتی وہ بھی اپنی دوستوں کی طرح گھومے پھرے۔مگر سب غافل ہو چکے تھے سب نے اماں کو ثناء کی ذمہ داری سمجھ کر کبھی کبھار آنا یا فون کرنا ہی اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔حالانکہ ثناء بھی اماں کہیں جاتی تو ان کے بغیر دو دن ہی خوش ہوتی پھر گھر کی فضا بہت سونی لگتی۔اور پھر اماں کا بھی کہیں دل نہ لگتا ان کو ثناء کی فکر ہونے لگتی۔اب بہن بھائی اس انتظار میں ہوتے کہ امّاں بولیں تو ہم ان کو گھر چھوڑ کر آئیں اماں بھی اپنے گھر آ کر خوش ہوتیں اپنا کمرہ، بستر، تکیہ حتیٰ کے باتھ روم بھی وہ یاد کرتیں۔

ماہ و سال گزر رہے تھے۔اماں اب اسّی سال کی ہونے والی تھیں۔بڑے بھائی عاطف جس کہ یہاں پر سالگرہ خوب دھوم سے منائی جاتی انہوں نے اماں کی برتھ ڈے بھی منانے کا سوچا۔ان کے بچوں نے گھر سجایا۔ہر جگہ پپی برتھ ڈے کے بینر لگے تھے۔پانچ فریم میں پانچ تصاویر لگی تھیں۔ہر ایک میں اماں اپنا ایک بچہ اٹھائے مسکرا رہی تھیں۔شاید ماں کو کوئی بچہ بوجھ نہیں لگتا۔ثناء نے سوچا جب کہ اس کو سنبھال کر تو اماں کچھ کمزور لگ رہی تھیں۔کیک پر اسّی کی موم بتی لگی تھی۔اماں خوش بھی ہوئیں اور حیران بھی۔آج تک ان کی سالگرہ نہیں منائی گئی تھی ان کے بچپن میں صرف محبتیں تھیں۔پیدائش کا دن آ کر کب گزر جاتا پتا بھی نہ چلتا۔رات گئے اماں کی سالگرہ کی تقریب ختم ہوئی۔بچے کیک کھا کر خوش تھے اور بڑے اماں کو خوش کر کے سکونِ دل محسوس کر رہے تھے۔

دن یوں ہی گزر رہے تھے کہ عجب ایک وبا جسے کرونا وائرس کا نام دیا گیا ہر طرف پھیل گئی۔چھوت کی وبا تھی لوگ اپنے گھروں میں محصور ہو گئے۔اپنے آپ کو اور گھر کے بوڑھوں کو بچانے کے لئے خاص زور دیا جارہا تھا۔سال بھر ہو گیا تھا کوئی ایک دوسرے کے گھر نہ گیا تھا۔اماں بھی سب کو یاد کرنے لگی تھیں۔سب کہاں گئے۔میرے بچے۔میرے پوتا پوتی نواسا نواسی میرے محلے والے وہ پوچھتیں۔پھر کبھی یاد آ جاتا تو خود ہی خاموش ہو جاتیں کبھی ثناء کو بتانا پڑتا۔اب تو وہ بھولنے کی بیماری میں بھی مبتلا ہوتی جارہی تھیں۔

آخر کار وبا کا توڑ نکالا گیا۔''ویکسین'' کا وجود سکون کا باعث تھا۔اماں کو بھی لگوائی گئی۔ان کے سارے بچوں نے لگوائی۔سب کو سکون آیا۔

سب اماں کو یاد کر رہے تھے ناز تو بہت دور بھی نہیں رہتی تھی مگر لگتا تھا ایک صدی گزر گئی اماں کو دیکھے۔اس نے اداس ہو کر عذرا آپا کو فون ملایا اور بولی آپا

آپ سب کو دیکھے بہت عرصہ گزر گیا، خاص طور سے اماں کو دیکھنے کا بہت دل کرتا ہے۔ ہاں ناز مجھے بھی رہ رہ کر اماں کا خیال آتا ہے۔ آپا یاسیت سے بولیں۔ بس اپنے بچوں میں کھو کر فرصت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ آپا کو بہت احساس ہو رہا تھا۔ ہاں آپا سچ کہہ رہی ہیں۔ ناز بولی۔ اب تو بھائیوں کے بھی فون آ رہے ہیں سب اماں کو یاد کر رہے ہیں۔ دو قدم کی دوری اب دو سو قدم کی لگنے لگی ہے ہم نے ہر ذمہ داری ثناء پر ہی ڈالی ہوئی تھی۔ ناز بولی آپا نے کہا۔ تم کو تو پتہ ہے مجھے کرونا وائرس ہو چکا ہے تنہائی کی اذیت بھگت چکی ہوں۔ اسی دوران میں نے ثناء کے بارے میں بہت سوچا اگر اماں کو کچھ ہو گیا تو وہ کتنی اکیلی ہو جائے گی۔ میں تو اب اس کا رشتہ کرا کر ہی رہوں گی۔ آپا بولیں۔

سب لوگ ویکسین لگوا کر بہت خوش تھے۔ اماں کو بھی صحت مند پا کر سب شکر ادا کر رہے تھے۔

بڑے بھائی نے پھر اپنے گھر میں محفل سجائی تھی۔ ہال میں صوفوں پر گھر والے بیٹھے تھے۔ باہر کے کمرے میں مرد تھے۔ آج نکاح مبارک دیوار پر خوبصورت طریقے سے لکھا گیا تھا۔ بڑے دنوں بعد سب کے چہروں پر رونق تھی۔ اچھے کپڑے نکل آئے تھے سب اچھے سے کپڑے پہنے بیٹھے تھے آج ثناء کا نکاح تھا۔ صرف گھر والے تھے۔ وبا کی وجہ سے کسی کو نہ بلایا تھا۔ نکاح بہت سادگی سے پڑھایا گیا۔ سب بہن بھائیوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اس فرض سے کتنا غافل رہے تھے۔ گھر کے اندر بٹھا کر موت کے خوف نے سب کو بہت سارے فرائض یاد دلا دیئے تھے۔

اماں کچھ مطمئن اور کچھ اداس سی بیٹھی تھیں۔ کیا ہوا اماں؟ آپا نے کہا۔ ثناء رخصت ہو گئی آپ خوش ہیں نا! ہاں بہت خوش ہوں۔ اماں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ دوسرے دن ثناء آئی تو بہت خوش تھی اس کے شوہر اشفاق خوش اخلاق، سنجیدہ پڑھے لکھے انسان تھے۔ بہن بھائیوں کو امریکہ بلایا۔ سیٹ کیا اور اب اپنی شادی کا سوچا۔ ثناء نے اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا؛ اماں میں آپ کو لینے آئی ہوں؛ نہیں بیٹا میں اپنے گھر جاؤں گی۔ تمہارے گھر مجھے نیند نہ آئے گی اماں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ثناء کو جھٹکا لگا کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ وہ صرف میرا گھر نہیں ہے۔ میں نے اشفاق سے پہلے ہی بات کر لی تھی آپ کے لیے ایک الگ کمرہ بھی ہے۔ اماں نے پیار سے اسے دیکھا اور بولیں میری بیٹی تم اپنی زندگی خوشی سے جیو ابھی تو شروعات ہے۔ اشفاق بولے'' وہ گھر آپ کا بھی ہے اماں''۔ اب عاطف بھائی آگے بڑھے انہوں نے ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا'' اماں اب آپ میرے ساتھ رہیں گی''۔ انہوں نے بہو کے چہرے پہ ہلکا سا رنگ آتے ہوئے دیکھا۔ مگر پھر بھی حامی بھر لی اماں اب سب کے ساتھ رہیں گی ہم سب اماں کو اپنے گھر لے جایا کریں گے۔ آپا بھی جوش سے بولیں۔ سب بچے میرے اپنے ہیں جہاں کہو گے چلے جائیں گے ہمیں کون سا ایک گھر میں رہنے کا شوق ہے وہ تو ہم ثناء کی وجہ سے رہتے تھے۔ اماں نے خوش دلی سے کہا۔ ثناء نے دل میں کہا میری پیاری ماں یہ ساری باتیں آپ میری خوشی اور آزادی کے لیے کہہ رہی ہیں۔

سب خوش تھے۔ مگر ثناء بھی ایک فیصلہ کر کے اٹھی تھی اس سے پہلے کہ اس کو اپنی ماں کے بغیر رہنے کی عادت پڑے اور وہ اپنی زندگی میں مگن ہو جائے وہ انہیں اپنے گھر لے جائے گی۔

SALT BAY

ترکی کے شہر ارزرون میں ۱۹۸۳ء میں پیدا ہونے والے عالمی شہرت یافتہ شیف نصرت گوکی المعروف Salt Bay کے لندن میں واقع ریسٹورانٹ میں ۸۔ اکتوبر ۲۰۲۱ء کو ایک متمول خاندان کے اعشائیے کا اسٹرلنگ پونڈ میں بل حسب ذیل ہے:

1	Golden Tomahawk	850.00
3	Herb Crusted Fries	30.00
1	Sauteed Mushroom	12.00
1	Sauteed Broccoli	14.00
1	Asparagus	18.00
1	Mashed Potato	12.00
16	Nusret Baklava	400.00
4	Golden Baklava	200.00
1	Red Bull	11.00
2	Elra Still	18.00
1	Elra Sparkling	9.00
1	Petrus 1996 Btl	9100.00
2	Petrus 2003 Btl	19900.00
2	Dom Perignon Rose 2006 Btl	1620.00
	Subtotal	32,194.00
	15% Service Charge	4,829.10
	Total Due	37,023.10

نامکمل چہرے کے نقوش

افتخار بلوچ
(کراچی)

ناصر ایک عام آدمی تھا۔ سڑکوں کے کنارے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے گاڑیاں گننے والے لوگ جو ہر گزرتی گاڑی دیکھ کر اپنی خواہش کا معیار بدل لیتے ہیں۔ مگر قدرت نے ناصر کے اندر سائنس اور ادب کا ایسا آہنگ رکھ دیا تھا کہ اُس کی بنی ہوئی تصویر کسی تھیورم کی سچائی لگتی اور اُس کا کیا ہوا سائنسی کام کوئی تصویر محسوس ہوتا۔ مگر اُس کے فن کو پسند کرنے والے بہت کم لوگ تھے۔ بائیس کروڑ آبادی کے ملک میں صرف آٹھ دوست جو اُس کی صلاحیت کا اندازہ رکھتے تھے مگر اُس کی تصویر کے معنی و مفہوم تک وہ بھی نہ پہنچ پاتے۔ وہ کون ہے؟ اُس کا راستہ کون سا ہے اس ادھیڑ بن میں ناصر نے زندگی کے دس سال صرف کر ڈالے مگر کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ ہر کام کو شروع بڑی خوشدلی سے کیا کرتا مگر بے ترتیبی اُس کے ارادوں کو اور اُس کے فن کو گھیر لیا کرتی تھی۔ ناصر کی عامیت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ مجسم بے ترتیبی لگنے لگتا تھا۔ اُسے کبھی بھی یقین نہیں آیا تھا کہ اُس نے جتنے کام کیے ہیں کیسے کیے ہیں۔ ایک پل کے لیے وہ سوچتا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے ورنہ وہ تو کسی قابل نہیں مگر اگلے ہی لمحے وہ سوچنے لگتا کہ اُس کے اندر بھی کوئی صفِ لطیفہ موجود ہے آخر انسان کا اختیار بھی تو کوئی چیز ہے!

اُس کے کمرے میں جا بجا بجھے ہو سگریٹ، بکھری ہوئی کتابیں اور دھلے اور ان دھلے کپڑے بے ترتیبی میں پڑے رہتے۔ کمرے کے ایک کونے میں لکڑی کا سٹینڈ تھا جس پر تختہ کیلوں سے نصب کیا گیا تھا۔ تختے پر ایک بڑا کاغذ لگا کر وہ کئی بار خیال کو رنگ دینے کا سوچتا اور بغیر کچھ کیے سو جاتا۔ ایک میز پر پڑے ہوئے رنگوں کے ڈبے جن کے ڈھکن فرش پر پڑے رہتے۔ میز کی سطح پر رنگوں کے دھبے نہ سمجھ میں آنے والی تصویر بناتے ہوئے نظر آتے۔ ایک دفعہ اُس نے ان دھبوں کو بغور دیکھا تھا تو اُس کے چہرے پر مسکان ابھر آئی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے سوچا تھا کہ رنگ کسی بھی ترتیب میں ہوں کوئی تصویر ضرور بناتے ہیں یہ بے ترتیبی رنگوں کے لیے درست نہیں مگر اُسے افسوس بھی ہوا تھا کہ اُس نے تصویریں بناتے بناتے کتنے رنگ ضائع کر دیے۔ ناصر کے کمرے کی دیوار پر تین تصویریں چسپاں تھیں۔ ایک تصویر میں ایک بزرگ مرد کو بزرگ عورت کی ایڑی میں چبھا ہوا کانٹا نکالتے دکھایا گیا تھا اور دوسری تصویر میں ایک عورت کو اپنے کان سے بالی اتارتے دکھایا گیا تھا اور تیسری تصویر میں کچھ عورتوں کے دھڑ ساحل پر کھڑے تھے اور سر ریت پر پڑے تھے۔ سمندر کا رنگ سرخ تھا اور ڈوبتے ہوئے سورج کا رنگ نیلا۔ لہریں ریت پر پڑی کھوپڑیوں کو گہرائیوں میں لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آ رہی تھیں۔ تیسری تصویر بنانے کے بعد ناصر نے اپنی صلاحیت کو بہت داد دی تھی۔

تصویر مکمل کرنے کے چند روز بعد اُس کی ملاقات صارم سے ہوئی تھی۔ دونوں انجینئرنگ سے متعلقہ کمپنی میں نوکری کے لیے انٹرویو دینے آئے تھے۔ صارم ناصر کا یونیورسٹی کے دنوں کا دوست تھا جسے مصوری سے شغف تھا۔ انٹرویو لینے والے نے ناصر سے کسی معزز شخص کا حوالہ دینے کو کہا تھا جس پر ناصر خاموش رہا تھا۔ یونیورسٹی ختم ہوئے چھ ماہ بیت چکے تھے مگر وسیلہ روزگار کا سکھ اس کے قریب سے نہیں گزرا تھا وہ اب تک بیسیوں انٹرویو دے چکا تھا۔ اُس نے صارم کو جب تصویر کے متعلق بتایا تو صارم نے تصویر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جس پر ناصر نے اسے اگلے دن کی شام مدعو کر لیا۔

اگلے دن شام کے وقت صارم ناصر کے کمرے میں موجود تھا سگریٹوں کی بو اُس کی طبعیت کو بوجھل کر رہی تھی۔ صارم نے ناصر کے اتنی مقدار میں سگریٹ پینے پر ناگواری کا اظہار کیا۔ صارم کی نظر جونہی تختے پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ کسی کی تصویر کا مبہم سا خاکہ بنا ہوا ہے۔ صارم کے پوچھنے پر ناصر نے بتایا کہ وہ اپنی تصویر بنا رہا ہے مگر جس تصویر کے لیے اس نے صارم کو بلایا ہے وہ یہ ہے۔ ناصر نے ہاتھ کے اشارے سے دیوار پر چسپاں تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ صارم اٹھ کر تصویر کے پاس چلا گیا اور اُسے بغور دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد صارم نے ناصر سے بس اتنا ہی کہا:

"ناصر بھائی آپ کی بنائی ہوئی تصویر کا مطلب اور وجہ تو میری سمجھ سے باہر ہے البتہ تصویر خوبصورت انداز سے بنائی گئی ہے"۔

اُسی لمحے ناصر پر نارسائی کی ہوا گرم ہو گئی۔ تنہائی نے اُس کے رگ و پے سے جذبات نچوڑ لیے اور خالی جگہ کو بے حسی نے پُر کر لیا تھا جواب رگیں چیرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اپنی بے ترتیبی کو تنظیم میں بدلنے کی خواہش ہمیشہ اس کی اپنی ہی ذات ہی دفن ہو جاتی تھی۔ ناصر سوچتا تھا کہ آخر کیوں اُسے کوئی سمجھنے سے قاصر تھا بس تصویروں کی داد دینے کو آٹھ لوگ تھے تو اں صارم تھا وہ بھی بس داد ہی دے سکا تھا تصویر سمجھ نہیں سکا تھا۔ صارم اُس کے برابر آ کر بیٹھ گیا اور تصویر کا مطلب پوچھنے لگا مگر ناصر کا دماغ ایک سوال کا جواب ڈھونڈنے میں مصروف تھا کہ "خدا مجھے دکھا کر چھپانا چاہتا ہے یا چھپا کر دکھانا چاہتا ہے یا میں خود اپنے آپ کو اتنا فاش کر رہا ہوں کہ کسی کو احساس نہیں ہو رہا"۔

صارم کے دوسری بار پوچھنے پر ناصر نے کہا

"یہ تصویر اُن عورتوں کی عکاسی کرتی ہے جنہیں دریاؤں کا پانی بند ہو جانے پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا"۔

"ہیں! وہ کیسے ناصر بھائی" صارم نے حیران ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

"دریا بند ہو جاتے تھے تو لوگ عورتوں کی قربانی دیتے تھے اِسی لیے ان عورتوں کے سر ساحل پر پڑے ہیں" ناصر نے بیزار لہجے میں جواب دیا۔

" مگر سورج کیوں نیلا ہے؟" صارم نے پھر سوال کیا۔

"وہ اس لیے کہ آج تو یہ ہمارے سروں پر گردش روک دیتا ہے مگر اُن پر چمکا ہی نہیں کم از کم وہ اتنا تو ڈرتے کہ کہیں ایسا گناہ کرتے ہوئے یہ سورج ہی ہماری

بستیوں پر نہ آ گرے۔ ہم کوشش کرتے ہیں ہماری خواہش نہ ٹوٹے اور اس کی تپش ہمیں گھروں سے باہر نہیں نکلنے دیتی اور وہ پورے وجود کو مٹا دیتے یہ کچھ نہ کرتا" ناصر نے سورج پر برستے ہوئے کہا۔

صارم خاموش ہو گیا تھا مگر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس شخص کا دماغ کسی طرف کو ڈھلک گیا ہو۔ ناصر کے دل پر زندگی نے سخت کیفیات کی بارات بٹھا دی تھی۔ زندگی کی بے ترتیبی کو سدھارنے لگتا تو اُسے یوں لگتا کہ جیسے وہ زنجیروں میں جکڑ لیا گیا ہو یہاں تک کہ سوچ بھی نہ سکتا ہو۔ تنہائی اُس کی نظروں اور لہجے پر قابض ہو چکی تھی کبھی کبھی اُس کا دل کرتا کہ تصویر میں جو عورت اپنے کان سے بالی اتار رہی ہے ناصر خود یہ بالی اتارے اور چبا جائے۔ اُس کی صلاحیتوں کا ادراک کبھی نہیں ہوا تھا یوں نارسائی اُس کے دل و دماغ پر رقص کرتی رہتی اور وہ بلاوجہ اداس رہتا۔ وہ اِس بات پر شکر کیا کرتا تھا کہ اُسے یہ بلائے جان محبت کبھی نہیں ہوئی مگر اگلے ہی پل یہ شکر سخت محرومی میں بدلنے لگتا۔

صارم کو گئے ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا ناصر کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ باہر رات کتنا اندھیرا دان کر چکی ہے آخر اُس نے سوچا کہ کرنے کو جب کچھ نہیں ہے تو کیوں نہ تصویر مکمل کر لی جائے۔

اُس نے ایک دفعہ شیشے میں خود کو دیکھا اور تختے کے سامنے کھڑا ہو کر تصویر بنانے لگا اُس نے اپنے چہرے کا بیرونی خط بنا دیا۔ اُس کے تصورات میں اپنی پیشانی کا نقشہ ابھرنے لگا۔ ناصر کا خیال پیشانی کی دائیں جانب ایک زخم کے نشان پر چلا گیا۔ ہو بہو کرنے کی کوشش میں اُس نے نامکمل چہرے کے ماتھے پر وہ داغ بنا دیا۔ اُس داغ کو نمایاں کرنے کی کوشش اُس نے جاری رکھی یہ کام اُسے طبیعت پر بھاری محسوس ہونے لگا مگر اُس نے آخر داغ کو اتنا نمایاں کر دیا کہ دیکھنے والے کو اتنا اندازہ ہو جاتا کہ یہ داغ ہے مصور کے فن میں کوتاہی نہیں۔ اب اُس کے لیے تصویر بنانا مشکل ہو رہا تھا اُس کی سوچیں صارم کی ناسمجھی پر مرکوز تھیں مگر اُس کی انگلیاں تصویر کے بال بنانے میں مصروف تھیں۔ ناصر نے ہاتھ روک کر سوچا تصویر کس طرح خوبصورت بنائی جا سکتی ہے بال دائیں جانب سے بناؤں یا بائیں جانب سے۔ وہ ایک بار پھر شیشے کے سامنے چلا گیا۔ اُس نے دائیں جانب سے بال بنائے لمحہ بھر کو اپنے حسن کا احساس ہوا پھر اُس نے بائیں جانب سے بال بنائے ایک مرتبہ پھر خوبصورتی بول اٹھی اُس کے لیے فیصلہ مشکل ہو گیا۔ ابھی ناصر اسی تذبذب میں تھا کہ نجانے طبیعت کا کون سا عنصر بول اٹھا

"بال بکھرے ہوئے اچھے لگتے ہیں"۔

ناصر نے اپنی انگلیاں اپنے ہی بالوں میں ڈال کر تیزی سے گھما دیں اور خود ہی بول اٹھا یہ اصل تصویر ہے حقیقی معنوں میں میرا چہرہ جو مکمل طور پر میری زندگی کا عکاس ہے۔ اُس پر اداسی نے حملہ کر دیا تھا وہ بوجھل نظروں سے تصویر کو دیکھتا اُس کی طرف بڑھا اور اُس نے بکھرے ہوئے سیاہ بال بنا دیے اُسے تصویر سے بیزاری ہونے لگی۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگا۔ رات گزرتی رہی ناصر کتاب پڑھتا رہا۔ کچھ وقت کے بعد اُسے کتاب سے بیزاری محسوس ہونے لگی مصنف نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی تھی جو ناصر کے مزاج سے میل کھاتی۔

اگلی صبح ناصر کی آنکھ تو کھل گئی مگر وہ اور سونا چاہتا تھا اُس نے تصویر کی طرف ایک نظر دیکھا نامکمل تصویر جس میں پریشانی کا عنصر ابھرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اُس نے سوچا کیوں نہ کمپنی کو کال کر کے پتہ کیا جائے کہ نوکری کے حوالے سے اُن لوگوں نے کیا سوچا؟۔

وہ فون نمبر ملانے لگا مگر کمپنی کے متعلقہ آدمی نے اُسے مایوس کر دیا انہوں نے کسی اور کو چن لیا تھا۔

ناصر زیرلب بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ سو گیا۔ کافی دیر بعد جب اُس کی آنکھ کھلی تو باہر عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ ناصر نہا دھو کر آوارہ گردی کرنے چلا گیا۔ رات دیر تک وہ سڑکوں پر پھرتا رہا لوگوں کو دیکھتا رہا شہر کی رونق میں دل لگانے کی کوشش کرتا رہا۔

رات جب گہری ہو گئی تو وہ کمرے میں واپس آیا اُس کی افسردگی میں اضافہ ہو چکا تھا اور فرار کا تسکین کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ آخر کار اُس نے تصویر کی آنکھیں بنانا شروع کی دیں۔ اُس نے شیشے میں اپنی آنکھیں دیکھیں، پلکوں کا اندازہ لگایا ابرو دیکھے آنکھوں کی چمک کا اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر تصویر کی آنکھوں میں افسردگی بھرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بہت دیر تک انگلیاں چلانے کے بعد اُسے محسوس ہوا کہ اب تصویر کی آنکھیں اس قابل ہیں کہ ویرانی کی عکاسی کر سکیں۔ اُس نے سوچا کیوں نہ آنکھ سے ڈھلکتا ہوا آنسو بھی بنایا جائے مگر خود ہی اُس نے یہ کام کرنا پسند نہ کیا وہ معنویت کا بڑا قائل تھا۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ یہ تصویر دیکھنے والا نظر نہ آنے والے آنسو بھی دیکھے۔ تصویر مکمل کرنے کے ارادے کو التوا میں ڈال کر اُس نے ایک اور کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا۔

اگلے دن کی دوپہر ہو رہی تھی مگر ناصر ایسے سویا ہوا تھا جیسے کئی صدیوں تک جاگنے کے بعد اب اُسے ذرا فرصت ملی ہو۔ اُس کا فون بج اٹھا۔ اُس نے ایک آنکھ کھول کر فون کی سکرین دیکھی تو اُس کے چھوٹے بھائی باقر کی کال تھی۔

"ہاں باقر کیا ہوا" ناصر نے کال ریسیو کر کے کہا اُس کی آواز سے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کال سننا ہی نہ چاہتا ہو۔

"بھائی! باجی کی منگنی ٹوٹ گئی ہے جس کی وجہ سے امی کو ڈیپریشن کا اٹیک ہوا ہے آپ جلدی گھر آئیں" باقر کی آواز بکھرنے کے قریب تھی۔

ناصر کی نیند کافور ہو گئی۔ فکر کا ایک دریا اُس کے دماغ میں بہنے لگا جس کی رفتار میں ناصر کی اپنی ذات بہہ گئی۔

آدھی رات بیت چکی تھی جب وہ گھر پہنچا۔ دیکھا تو سارے لوگ جاگ رہے ہیں اور امی کے پاس بیٹھے ہیں مگر سائرہ نظر نہیں آ رہی۔ سائرہ ناصر کی چھوٹی بہن تھی جو یونیورسٹی سے گریجویشن کر رہی تھی۔ ناصر نے ماں کے سامنے جانے سے پہلے سائرہ سے ملنا مناسب سمجھا اور سائرہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ ناصر نے سائرہ کے کمرے میں جا کر دیکھا تو وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ سائرہ کی نظر ناصر پر پڑی تو وہ دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی اُس نے آنسو بھی پونچھے مگر آنسو جاری

رہے۔ ناصر نے سائرہ کو تسلی دی اُسے مسکرانے کو کہا اور ماں کے پاس چلا گیا۔ وہ سفر سے آیا تھا مگر تھکن کی جگہ فکر اُس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ ماں نے جیسے ہی ناصر کو دیکھا وہ خوش ہونے لگی۔ بار بار اُس نے ایک ہی بات کہی

"یہ سارے بھی چلے جائیں اب تُو پردیس نہیں جائے گا تیرے بغیر میرا دل بہت گھبراتا ہے"۔

ماں کو سمجھاتے سمجھاتے رات بوڑھی ہو گئی۔ جب رات کے ماتھے پر چاندی ابھرنے لگی تو ناصر ذرا ستانے کے لیے بستر پر دراز ہو گیا مگر نیند اُس سے کوسوں دور تھی۔ وہ اپنے خاندان اور اپنے مستقبل کے امکانات سوچتا رہا۔

صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ناصر نے باقر کو الگ لے جا کر پوچھا

"انہوں نے منگنی توڑنے کی کوئی خاص وجہ بتائی ہے؟" اُس کی آواز میں تفکر نمایاں ہو گیا تھا۔

"نہیں بس اتنا ہی کہا کہ لڑکا اب نہیں چاہتا۔ مجھے تو لگتا ہے اُسے کوئی اور لڑکی پسند آ گئی ہے"۔ باقر نے غصے کا ابتدائیہ بنتے ہوئے کہا۔

ناصر کے دل میں الفاظ کا طوفان پیدا ہو گیا مگر وہ چھوٹے بھائی کے آگے کچھ بولنے سے قاصر تھا۔ اُسے بار بار ایک خیال آتا تھا کہ آخر خوشی کے لیے یہ گھر ممنوعہ علاقہ کیوں بن گیا ہے اُسے قسمت سے گلے ضرور تھے مگر طبیعت کی انصاف پسندی اپنی خرابیوں کا ادراک بھی کروا دیا کرتی تھی۔ منگنی ٹوٹنے سے اُس کے خاندان کی عزت پر داغ آ چکا تھا اور یہ داغ اُس وقت تک رہنا تھا جب تک سائرہ کے بال سفید نہ ہو جائیں!

اُسے گھر آئے ہوئے دو دن گزر گئے تھے وہ سارا دن اپنی ماں کو اور سائرہ کو سمجھاتا رہتا یہ کوشش اُس کی اپنی طبیعت پر بوجھل پن پیدا کر دیا کرتی۔ باپ کی اداسی اور فکر اس کا دل اور جلاتی مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا وہ بے بس تھا جزوی اختیار کا کوئی قلمدان اُسے عطا نہیں ہوا تھا۔

اگلے دن دوپہر سے کچھ پہلے کا وقت تھا جب اُس کا فون بجنے لگا۔ ناصر نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف موجود شخص نے اسے بتایا کہ وہ ایک کمپنی سے بات کر رہا ہے اور کل بارہ بجے آپ کا انٹرویو ہے۔ ناصر ایک حقیقت پسند آدمی تھا اُس نے سوچا ہو سکتا ہے یہ لوگ مجھے نوکری دے دیں یوں میری والدہ کی پریشانی تھوڑی کم ہو جائے۔ اُس نے باقر کو مشورے کے لیے بلایا تو باقر نے اس کے جانے کی شدید مخالفت کی اور گھر کی صورتحال کو سامنے رکھ کر دلائل دیتا رہا مگر ناصر کو امید نے جکڑ لیا تھا وہ تھوڑی دیر بعد گھر سے روانہ ہو گیا۔

پانچ چھ گھنٹے کے سفر میں وہ صرف یہ سوچتا رہا کہ اُس کی غیر موجودگی میں امی کیا سوچتی ہونگی؟ کہیں وہ اور پریشانی کا شکار نہ ہو جائیں۔ نجانے باقر امی کو سمجھا بھی پائے گا یا نہیں؟ کئی سوال ناصر کے ذہن میں سر اٹھاتے رہے مگر وسیلہ روزگار کی امید نے اس کا سفر جاری رکھا۔

اگلی صبح وہ وقت پر انٹرویو دینے پہنچ گیا۔ انٹرویو لینے والا اس سے مختلف سوالات پوچھتا رہا ناصر نے جن کے معقول جوابات دیے۔ انٹرویو ختم ہونے کے بعد اُس نے خاص طور پر گذارش کی کہ اُسے جواب سے جلد از جلد آگاہ کر دیا جائے ساتھ اپنی مشکلات کا بھی بتایا۔ متعلقہ افسر نے ناصر کی گزارشات سن کر کہا کہ وہ لوگ ناصر کو کل صبح تک اطلاع دے دیں گے۔

ناصر کو ایک اور رات اپنے کمرے میں گزارنی پڑی۔ بکھری ہوئی کتابیں اور نامکمل تصویر۔

اُس کا ذہن مسلسل سائرہ اور ماں کی حالت کا طواف کر رہا تھا۔ بے یقینی اس کے رگ و پے میں گردش کرنے لگی تھی مگر وہ پرامید تھا کہ اُسے نوکری مل جائے گی اور یوں گھر کی مخدوش صورتحال بہتر ہو جائے گی۔ رات گزرتی جا رہی تھی آخر اُسے تنہائی نے بیزار کرنا شروع کر دیا۔ وہ کہاں جائے؟ کسے جا کر بتائے؟ کب تک سارا غبار اپنے اندر رکھے؟ وہ مسلسل سوچتا رہا کہ کیسے زندگی کو بہتر کیا جا سکتا ہے؟ کوئی جواب نہ بن پڑنے پر آخر اس نے تصویر مکمل کرنے کی ٹھان لی۔ وہ اٹھا ایک بار پھر اس نے شیشے میں دیکھا اور خود کو کاغذ پر اتارنے لگا۔ رات بہت دیر کے بعد اُس نے تصویر مکمل کر لی تھی۔

بکھرے ہوئے بال، اداس آنکھیں اور نیم وا ہونٹ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔

تصویر مکمل کرنے کے بعد اطمینان کی کنکری نے فکر کی جھیل میں ارتعاش پیدا کرنے کی کوشش کی مگر خود ہی گہرائیوں میں گم ہو گئی ناصر بھی سو گیا۔

اگلی صبح اٹھتے ہی اُس نے کمپنی میں کال کی تو اُسی شخص نے جواب دیا کہ "ہم معذرت خواہ ہیں ہم نے ایک اور موزوں گریجویٹ کو چن لیا ہے آپ حوصلہ نہ ہاریں اور امید رکھیں"۔

ناصر کا دماغ گھومنے لگا۔ امید کا آسمان اداسی کے صحرا میں دفن ہو گیا۔ ناصر نے فون میز پر رکھا اور دیواروں کو دیکھنے لگا۔ اُس کی نظریں کسی جگہ نہیں رک رہی تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے کہ اُس کی نظر تصویر پر رک گئی۔ ناصر تصویر کی طرف بڑھا تصویر کے سامنے پہنچنے تک کئی گالیاں اُس کے ہونٹوں سے گزر گئیں اور ایک آنسو رخسار تک پہنچا ہی تھا کہ ہاتھ سے مسلا گیا۔

تصویر کے نیم وا ہونٹوں پر ناصر کے ہاتھ رقص کرنے لگے۔ جب وہ کام سے رکا تو تصویر کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل چکی تھی۔ مسکراتے ہوئے ہونٹ جن کے پیچھے دانتوں کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔

ناصر نے پیچھے مڑ کر ایک نظر تصویر کو دیکھا اپنا سامان باندھا اور گھر روانہ ہو گیا۔

فطرت کے عناصر

اگر ایٹمی جنگ ہوئی تو موجودہ دنیا کا سامنا چین یا امریکہ حتیٰ کہ ایک دوسرے سے بھی نہیں ہوگا۔ ہماری دشمنی کرۂ ارض سے ہوگی۔ فطرت کے عناصر آسمان، فضا، زمین، ہوا اور پانی ہمارے خلاف صف آرا ہو جائیں گے اور ان کا غضب نہایت ہولناک ہوگا۔

ارون دھتی رائے

"عشق کا معیار"

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

نہ تم آئے نہ چین آیا نہ نیند آئی شبِ ہجراں
دلِ بے چین کو پر یاد تیری رات بھر آئی

جوانی تھی سَمے تھا کیا، سبھی کچھ یاد ہے مجھ کو
بہت چاہا مگر رُت لوٹ کر وہ پھر نہیں آئی

بہت نادانیاں ہوتی رہی ہیں عمرِ رفتہ میں
مگر نادانیوں پر کیوں پشیمانی نہیں آئی

تیرے وعدے جنہیں سچ جان کر جیتے رہے برسوں
نبھانے کی مگر ان کو کبھی نوبت نہیں آئی

ہمیں تھا اعتبار اس پر، امیدیں تھیں بڑی اس سے
مگر ظالم نے آنکھیں پھیر کر میرے دل کو چوٹ پہنچائی

گلہ کچھ بھی نہیں اس پر قصور اپنا ہی نکلا ہے
ہمیں پہچان لوگوں کی زمانے میں نہیں آئی

ریاضؔ اس کو بُھلا کر ختم کر دو تلخ یادوں کو
بہت سُکھ اور بھی ہیں گر وفا اُس میں نہیں پائی

○

شاہد صدیقی

(کینیڈا)

جب رند وہاں خود جاتے ہیں مئے خانہ کو جاناں کیا کہیے
جب دور مئے چلتا ہو پیمانے کو جاناں کیا کہیے

جب اپنے ہی من کی کہتا ہے سمجھائیں تو کچھ سُنتا ہی نہیں
جب ہوش و خرد ہی باقی نہیں دیوانے کو جاناں کیا کہیے

جو سُنتا ہے سُر دھنتا ہے جو پڑھتا ہے رو دیتا ہے
روداد ہی میری ایسی ہے افسانے کو جاناں کیا کہیے

لغت کا یہی تو حاصل ہے مٹ جائے تو اک کامل ہے
پھر جلنا مقدر ہو ہی چکا پروانے کو جاناں کیا کہیے

شاہدؔ میں شکایت کس سے کروں قسمت کا لکھا تو ہوگا ہی
جب اپنے ہوئے سب بے گانے، بے گانے کو جاناں کیا کہیے

○

ڈاکٹر عمر قیاز قائل

(بنوں)

شب کی جلتی ہُوئی شمعوں کے پرستار بتا
تُو تھا کس درجہ محبت کا طلب گار بتا

ہم تو لے آئے ہیں دامن میں وفا کے موتی
کون اب اِن کو خریدے گا خریدار بتا

سچ تو اِس عہد میں کوئی بھی نہیں کہتا مگر
جو تیرے پاس ہے سچ اِس کو سرِ دار بتا

تُو نے اِس دِل کی بہاروں کو خزائیں دے کر
اپنے کتنے ہیں لُٹائے گُل و گلزار بتا

آ گیا دِل کا لہو کھینچ کے اِن آنکھوں میں
اور کس روز تُو آئے گا مرے یار بتا

جاں ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہے تیرا قائل
اِس سے بڑھ کر ہے کوئی عشق کا معیار بتا

○

تصور اقبال

(اٹک)

کھولا ہے آج پھر کسی نے اک محاذ دیکھ
اپنے ہی دوستوں سے ہے یہ ساز باز دیکھ

یہ بھی کسی کے ذہن کا ہے اختراع کوئی
کاغذ کا اُڑ رہا ہے کہیں اک جہاز دیکھ

گویا یہ اُن پہ بوجھ ہیں فرضِ خدا نہیں
پڑھتے ہیں کس طرح سے یہ بندے نماز دیکھ

دیکھا ہے خالی آنکھ نے اک خواب آج ہی
ہوتا ہے اس طرح تو کہیں شاذ شاذ دیکھ

ہم نے بھی اپنے ضبط کا اظہار تو کیا
کرتا ہے بات بات پہ وہ اعتراض دیکھ

شاید کہ مل ہی جائے کوئی اُن دنوں کی شے
الماریاں بھی کھول تُو سارے دراز دیکھ

میں نے کہا نہیں تھا یہ دھوکا فریب ہے
کھُلنے لگے ہیں پیار کے آخر وہ راز دیکھ

اُس حُسنِ دل فریب کا سکہ بھی چل گیا
اوپر سے کر رہا ہے وہ اقبالؔ ناز دیکھ

○

جنید آزر

(اسلام آباد)

خیالِ نو کی طلب میں ہیں کل کے دروازے
کھلے ہوئے ہیں ابھی تک غزل کے دروازے

قدیم ہو کے بھی عہدِ جدید میں ہی کھلیں
روایتوں کی حدوں سے نکل کے دروازے

لرزتے ہیں جو بہت رتجگوں کی دستک سے
فصیلِ خواب گرا دے گی ہلکے دروازے

بھٹکتے پھرتے ہیں آسیب کتنے گلیوں میں
مہیب رات ہے کھولو سنبھل کے دروازے

گزر رہی ہے گلی سے برات خوشبو کی
بجا رہی ہے ہوا ہلکے ہلکے دروازے

تو آنے والے کی قسمت پہ رشک آتا ہے
گلی میں جھانکتے ہیں جب مچل کے دروازے

کبھی تو زیست سرائے میں ہو قیامِ ابد
کبھی تو بند ہوں آزر اجل کے دروازے

○

برجیش عنبر

(جودھپور)

اندھیری رات میں یہ کس کا نقشِ پا چمکا
مسافروں کی نگاہوں میں راستہ چمکا

سلگتی ریت میں اک چہرہ آب سا چمکا
اداس آنکھوں میں جینے کا حوصلہ چمکا

شبِ فراق میں کوئی ستارہ ٹوٹا تو
ہمارے سوچ میں انجانا وسوسہ چمکا

فضا میں پھیل گئے کتنے یاد کے جگنو
دیارِ شوق میں جب کوئی رُت جگا چمکا

بکھر رہی تھی خیالوں میں خواب کی خوشبو
وجود بن کے کہاں کوئی خوش ادا چمکا

چھپائے چھپ نہ سکا بھیڑ میں بھی عنبرؔ
نہ جانے کیسے مجھی پر وہ دائرہ چمکا

○

ڈاکٹر نزہت شاہ
(نیویارک)

سمندر پار رہتے ہیں۔۔۔حدیں کب پار کرتے ہیں
وطن سے دور رہ کر بھی وطن سے پیار کرتے ہیں

وہ خوشبو سوہنی دھرتی کی نئے جذبے جگاتی ہے
محبت اپنی مٹی سے۔۔۔دیوانہ وار کرتے ہیں

سیاحت نہ، سیاست نہ، صحافت سے لگاؤ ہے
ذرا بھر شاعری کر کے۔۔۔رقم اشعار کرتے ہیں

گلی بھی اور محلّہ بھی۔۔۔شہر بھی یاد آتا ہے
ذہن پہ وقتِ پارینہ کے سائے وار کرتے ہیں

ملاقاتیں ہی مقصد ہیں کہ تم آؤ یا ہم آئیں
شکایت ایک دوجے سے یونہی بیکار کرتے ہیں

○

انجم جاوید
(کراچی)

وقت گہرے نشان چھوڑ گیا
آئینے پر چٹان چھوڑ گیا

نا مکمل سا خواب دیکھا تھا
عمر بھر کی تکان چھوڑ گیا

جاتا لمحہ عجب شکاری تھا
ذھن پر اک مچان چھوڑ گیا

زخمی ھاتھوں نے پھول توڑا ھے
خون اپنا نشان چھوڑ گیا

وہ بھی کیا شخص تھا کہ تیروں کو
ھاتھ پر بے کمان چھوڑ گیا

رو رھی تھیں ھواہیں جنگل کی
اک پرندہ مکان چھوڑ گیا

بے زمینی کا دکھ اُٹھانے کو
کھیت اپنے۔کسان چھوڑ گیا

○

شیوشرن بندھو
(فتح پور)

بند ہو چکے ہیں سب روشنی کے دروازے
جانے اب کھلیں گے کب روشنی کے دروازے

زندگی میں پھر کوئی تیرگی نہیں رہتی
یہ ہمارے ہیں مکتب روشنی کے دروازے

گھر کے گوشے گوشے کو روشنی میں رہنے دو
بند مت کرو صاحب روشنی کے دروازے

ختم ہو گیا جس دن عشق کا حسیں سورج
ڈھونڈتے رہیں گے سب روشنی کے دروازے

چاندنی بدن والے بہترین چہرے پر
جیسے ہوں تمہارے لب روشنی کے دروازے

دل میں جن کے نفرت ہے بندوں ایسے لوگوں کو
کھولتا نہیں ہے رب روشنی کے دروازے

○

جاوید زیدی

(یو ایس اے)

یہی لوگ سارے زمانوں میں تھے — وہی قصّے سب داستانوں میں تھے
بشر، بالا فطرت سے ہو نہ سکے — زمیں پر رہے آسمانوں میں تھے
دلِ محلّوں میں سودے جو بک نہ سکے — وہ دیر و حرم کی دوکانوں میں تھے
وہ اَرفع، وہ اعلیٰ، وہ معصوم لوگ — حقیقت میں کم ہاں فسانوں میں تھے
راستوں میں تمنّا کے جو تھے شہید — منزلوں کے قریں وہ نشانوں میں تھے
ہم آزاد زیدی، کبھی نہ ہوئے۔۔۔ — قفس میں کہیں آشیانوں میں تھے

○

محبوب خان اصغر

(حیدرآباد، دکن)

کس سمت جانا ہوتا ہے لیکن کہاں چلے — حق الیقیں بھلادیا سوئے گماں چلے
چلتے ہیں اہلِ ہوش وخرد یوں خمیدہ سر — جیسے قتیلِ جہل گہہ بے اماں چلے
ایسا چلن ہو ارض وفا کی بساط پر — ہمراہ سبزہ زار کے کوہِ گراں چلے
جو بے نیاز ہیں شجرِ سایہ دار سے — وہ لوگ زیرِ سایہ ابرِ رواں چلے
اس درجہ دل کو چھونے لگے رفعتوں کے خواب — زیرِ قلم سحاب چلے آسماں چلے
ذہنوں کی سرزمیں پہ ہے اصغؔر غبار سا — اے کاش شرحِ صدر کی موجِ رواں چلے

○

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

(سکھر)

تجھ پہ کوئی غزل نئی لکھوں — اور اِک دو نہیں کئی لکھوں
خوب صورت غزال سی آنکھیں — گہری، خاموش، کجلئی لکھوں
تیری باتیں بہار کی خوشبو — تیرا لہجہ میں چمپئی لکھوں
کیا حسیں ہے ترا تکلم بھی — تیرے الفاظ جھرنئی لکھوں
تیری زلفیں گھٹائیں ہوں جیسے — تیری رنگت کو نقرئی لکھوں
تیری چاہت کی گرمجوشی پر — میں دسمبر کو بھی مئی لکھوں

○

۔ ناول ۔

خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار

(میامی)

قسط.....۳

واہ، واہ ،سبحان اللہ، یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، اماں خلیفہ! ہماری بینائی بچکولے کھارہی ہے یا واقعی آپ مسلمان ہوگئے ہیں؟

''صاف کہیے جو کہنا چاہتے ہیں، آ نتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہوں تو عام باتیں بھی صقیل لگتی ہیں۔ آپ تو ویسے بھی باتوں، باتوں میں طنز کے تیر چلانے کے ماہر ہیں؟''

''واللہ آپ ہماری تعریف فرما رہے ہیں یا ہماری ہجو تحریر کرنے کا ارادہ ہے؟ (حضرتِ خلش نے ناگوری سے دریافت کیا)

''آپ فرمائیے، آپ کی طبیعت کس جانب مائل ہے؟''

''اماں! گولی ماریئے ،طبیعت و بیعت کو، آپ صرف یہ بتلا دیجیے کہ تمام عمر اخباروں اور روز ناموں کو، فشارِ خون اور خللِ دماغ کا موجب گردانے کے بعد آپ کے خیالات میں تبدیلی کب اور کیونکر واقعی ہوئی؟''

''لاحول ولاقوۃ (چھاتی سے لگے اخبار کو کن کھجورے کی مانند خلش صاحب کی جانب اُچھالتے ہوئے)

خلش صاحب! کان کھول کر سُن لیجیے نہ تو ہمارے خیالات اتنے ناپختہ ہیں کہ ربر کی گیند کی مانند کبھی اِدھر کو پچک جائیں اور کبھی اُدھر کو اور نہ ہم آپ، ہمارا مطلب ہے لوگوں کی مانند نابالغ ہیں۔ یہ تحفہ تو اُن کا ہے۔۔۔اُن کا۔۔۔؟''

''اُن کا،کن کا۔۔۔؟''

''اماں! وہی اپنے ہواہوائی۔۔۔!''

''ہواہوائی۔۔۔؟''

''لگتا ہے آپ بھول گئے!''

''ہواہوائی۔۔۔؟ کہیں آپ بانکے بلم عرف ہواہوائی بمبئی والے کا ذکر تو نہیں فرمارہے؟''

''جی جی، آپ کا قیاس درست ہے۔''

''کہاں ہیں، کہاں ہیں اپنے بانکے بلم، کب آئے، واپس کب جا رہے ہیں، چائے کی پتی تو ضرور لائے ہوں گے پرتگال والی؟''

''اماں! یہ پرتگال سے آپ کا قارورہ کیونکر جاملا؟''

''مرزا صاحب! قارورہ وروہ بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔ بات فقط اتنی ہے کہ پچھلی بار جب بانکے بلم بمبئی سے تشریف لائے تو والدہ محترمہ کچھ علیل تھیں۔ بانکے بلم نے اپنے بیگ سے ایک پڑیا نکال کر والدہ صاحبہ کو دیتے ہوئے کہا۔''

''خالہ بی! یہ دوائی پانی میں اُبال کر دن میں کئی بار پیجیے۔نزلہ، کھانسی، زکام، ریشہ سب جاتا رہے گا۔''

''ائے بیٹا! یہ دوائی ہے یا اللہ دین کا چراغ؟''

''خالہ بی! یہ پُرتگال کی چائے ہے چائے۔ پُرتگالی لوگ اس کو سنہری چائے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور جب بھی اُن کے ہاں کسی کو نزلہ، زکام، کھانسی یا گلے کی شکایت ہوتی ہے تو ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے سنہری چائے پینے کو ترجیح دیتے ہیں۔''

''ایک بات کان کھول کر سن لیجیے! بیک وقت اتنے سوالات کے جوابات حاتم طائی تو کیا اُس کا باپ بھی نہ دے پاتا وہ بھی اپنے ہواہوائی بمبئی والے کی نسبت، توبہ، کیجیے توبہ۔۔۔!''

''ارے صاحب صبح ہی صبح، کون توبہ کر رہا ہے اور ایسی کیا نوبت آن پڑی کہ توبہ وہ بھی آپ کے روبرو۔۔۔؟''

''اماں لعنت بھیجیے، ہمیں اتنی فرصت کہاں کہ کسی کے پھٹے میں پیر پھنسائیں'' (قاضی شہاب الدین اور قاضی رفیع الدین کے مشترکہ سوال پر خلیفہ عبدالرشید نے کسیلے منہ جواب دیا تو خلش دہلوی نے صورت حال کی وضاحت ضروری جانی)

''اماں اس میں اچھنبے کی کیا بات ہے۔ رسمِ دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے۔ بقول پنجابی دوستوں کے سناؤ لیے چوندی، چوندی''

''ٹھہریئے، ٹھہریئے، ہم بھی آ رہے ہیں (بلّن میاں اور نور محمد عرف نورو چائے والے نے چند قدم کے فاصلے سے آواز لگاتے ہوئے اپنی شرکت کو یقینی بنایا)

''ماجرا کیا ہے۔۔۔؟''

(خلش دہلوی نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے، ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو خلیفہ عبدالرشید نے آنکھوں پر لگے دبیز چشمے میں آنکھوں کے بٹنوں کو گاڑتے ہوئے اخبار کا تیاپانچا کرنا شروع کیا)

''خواتین و حضرات (غلطی درست کرتے ہوئے) ہمارا مطلب ہے حضرات! دل تھام کر سنیئے؟''

''جی جی سنایئے! سب لوگ ہمہ تن گوش ہیں۔''

''ام۔۔۔ری۔۔۔کا ۔۔۔ہوں ۔۔۔ امریکہ کی ایک یونیورسٹی نے ایسا ریڈیو ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ نہ صرف آپ دور دراز کے علاقوں میں اپنے اقربا سے بات چیت کر سکتے ہیں بلکہ طرفین ایک دوسرے کی تصویر بھی دیکھ

سکتے ہیں۔''

''ہیں۔۔۔؟''

''اجی یہ کیونکر ممکن ہے؟''

''ضرور یہ افواہ کسی من چلے نے اڑائی ہوگی!''

''اماں پہلے پوری خبر تو سُن لو، پھر سو فتے میں چلے جانا'' (قاضی رفیع الدین نے بزرگانہ طریق پر حیرت میں مبتلا احباب کو تلقین کی)

''اب آئی سمجھ میں'' (خلیفہ عبدالرشید نے خبر کا خلاصہ کرنے کے بعد اخبار گود میں رکھ کر اطمینان کا سانس لیا)

''اس کا مطلب یہ ہوا امریکہ کا صدر جاپان کی طرح کسی اور ملک پر چڑھائی کا حکم دے گا تو اُس کی براہِ راست کارروائی ہم گھر بیٹھے دیکھ سکتے ہیں۔''

''اماں شبھ شبھ بولو، شبھ شبھ، اس بات کو یوں بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ نہرو جی دلّی میں تقریر کریں گے اور پورا ہندوستان گھر بیٹھے دیکھے گا۔'' (نوب شین مرزا نے نورو چائے والے کی بات کو صحیح سمت دیتے ہوئے کہا)

''چھوڑیئے نواب صاحب!

کس زمانے کی بات کرتے ہو
دل دکھانے کی بات کرتے ہو
ہم کو اپنی خبر نہیں یارو
تم زمانے کی بات کرتے ہو

یہ تو وہی بات ہوئی کب باپ مرے گا کب بیل بٹیں گے۔ یہ کوئی اللہ دین کا چراغ تھوڑی ہے کہ آج اخبار نے خبر چھاپی اور کل نہرو جی نے تقریر پیل دی۔''

نورو میاں! آپ کی گفتگو سے مایوسی صاف چھلک رہی ہے۔ یقیناً اس میں وقت لگ سکتا ہے۔ دس، بیس سال یا اس سے بھی زیادہ۔ جن سہولیات سے بنی نوع انسان آج فیضیاب ہو رہا ہے اس کی بنیاد، سو دو سو نہیں ہزاروں سال پہلے پڑی ہوگی۔ آپ کی گفتگو میں وقت کی نسبت جو وسوسے سر اُبھار رہے ہیں اُن کی بابت پہلے زمانے کے ایک سخن ساز کہہ گئے ہیں:

ہمارے بعد محفل میں افسانے بیاں ہوں گے
بہاریں ہم کو ڈھونڈیں گی ہم نہ جانے کہاں ہوں گے
نہ ہم ہوں گے، نہ تم ہو گے، نہ دل ہوگا مگر پھر بھی
ہزاروں منزلیں ہوں گی، ہزاروں کارواں ہو گے

''یہ لیجیے، ایک خبر اور سُن لیجیے! حکومت پاکستان نے گذشتہ مہینے حسن محمود کو مصر میں اپنا سفر مقرر کیا تھا۔ آمدہ ہفتے نامزد سفیر حسن محمود اپنے عہدے کا چارج لینے پہنچ رہے ہیں۔''

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟''

''یقیناً نہیں ہے۔ اب جو بات ہم آپ کو بتلانے والے ہیں اُس سے آپ کے کان ضرور کھڑے ہوں جائیں گے۔''

''ایسی بات ہے تو دیر نہ کیجیے!'' (عبدالشکور خان نے ہمہ تن گوش ہو کر کہا)

''گذشتہ ہفتے قریبی ملک میں محترمہ وجے لکشمی پنڈت بطور سفیر مقرر ہوئی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہدے کا چارج سنبھال بھی لیا ہے۔ اب آئی بات سمجھ میں!'' (خلیفہ عبدالرشید نے عبدالشکور خان کی جانب آنکھ میچتے ہوئے اعتماد میں لینے کی کوشش کی)

''معاف کیجیے گا حضور! آپ ناحق، ہمارے حواسِ خمسہ کو برمانے کی کوشش فرما رہے ہیں؟''

''اچھا۔۔۔! یہ بات ہے تو اُس وقت آپ کے خون میں بلاسبب تلاطم کیوں پیدا ہوا تھا جب ہم نے اطلاع دی تھی کہ نازنین نے گھر سے بھاگ کر نذیر قوال کے بجائے اپنے ہندو دوست پریم کمار سے شادی کر لی ہے اور نازنین کے گھر والوں نے اُس خبر کو دبانے کے لیے نازنین کی موت کی افواہ شدومد سے پھیلانے کی کوشش کی تھی۔''

''وہ بات اور تھی!''

''کیوں اور تھی جناب؟''

''اس لیے۔۔۔ اس لیے۔۔۔ کہ۔۔۔ ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں مگر اسلام پر حرف آتا نہیں دیکھ سکتے؟'' (شکور صاحب نے جذبات پر قابو رکھنے کی ناکام کوشش میں گلے میں آیا بلغم پوری قوت سے کھینچ کر تھوکا)

''اور جب کوئی مسلمان لڑکا کسی ہندو لڑکی کو ورغلاتا، اُس سے شادی اور عشق فرماتا ہے تو اُس وقت ہمارے خون کی گرمی مٹر گشت پر کیوں نکل جاتی ہے؟''

''کیا آپ کو علم ہے کہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی بیگم رعنا لیاقت علی الموڑہ کے ہندو خاندان میں پیدا ہوئی تھیں۔ جن کا پیدائشی نام شیلا آئرن پینت تھا۔ انہیں بچپن میں الموڑا کی چپالی (الموڑہ کی بیٹی) کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا ازاں بعد اس خاندان نے عیسائیت قبول کر لی۔ ۱۹۳۱ء میں نوابزادہ لیاقت علی خان سے ملاقات کے بعد شیلا آئرن پینت نے اسلام قبول کیا اور ۱۹۳۲ء میں دونوں نے شادی کر لی۔ یہ شادی ہر طرح سے کامیاب شادیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق نواب زادہ لیاقت علی خان اور بیگم رعنا لیاقت علی خان کی شادی کے موقع پر کسی حلقے کی جانب سے اعتراض اٹھانا کسی نے خوشی کے شادیانے بجائے۔''

''اماں چھوڑیئے بھی! آپ بھی کس گورکھ دھندے میں ٹانگ اڑا بیٹھے، یہ دیکھیے کیا خوب خبر ہے (خلیفہ عبدالرشید سے اخبار لیتے ہوئے) نامور فلم ساز، ہدایتکار اور اداکار سہراب مودی نے اپنی زیرِ تکمیل فلم ''مرزا غالب'' کی شوٹنگ کے دوران، مرزا کے مزار کی خستہ حالی دیکھ کر فوری طور پر مرزا کے نئے

مزار کی تعمیر اپنے خرچ پر کرانے کا حکم صادر کر دیا۔ سہراب مودی نے بڑے ہی جذباتی انداز میں اپنے ادارے کے اراکین کو فلم ''مرزا غالب'' کی ریلیز سے پہلے مرزا کا مزار تعمیر کرنے کی ہدایت کی۔ آمدہ چند روز میں سہراب مودی کی ہدایت پر مرزا کے نئے مزار کی تعمیر شروع ہونے کی قوی اُمید ہے۔''

''خلیفہ عبدالرشید صاحب! آپ ہمارے لیے ہمیشہ سے قابل احترام ہیں۔''

''عزت افزائی کے لیے آداب بجاتا ہوں۔ (سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکاتے ہوئے)

''مگر آج! (خلیفہ عبدالرشید کی مداخلت بیجا سے صرفِ نظر کرتے ہوئے) اپنے دل کی بات کہے بنا کوئی چارہ نہیں۔''

''بسر و چشم کہیے، محفل ہمہ تن گوش ہے۔''

''ہم آج تک یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ کونسی خواہش، جواز اور سبب ہے جو آپ یہ اندر سبھا ہر روز بلا ناغہ سجا کر بیٹھ جاتے ہیں (دلارے میاں نے سانس کے وقفے میں پانی کے گلاس کی جانب اشارہ کیا تو فخری باربر نے آگے بڑھ کر پاس رکھے تانبے کے نقشین مراد آبادی جگ سے اُسی طرح کے نقشین گلاس میں پانی انڈیل کر دلارے میاں کو پیش کر دیا) قابل اعتراز بات اس کا طول دینا ہے۔ گذشتہ نشست میں بات چھوٹے پیرزادہ کے بڑے کارنامے کو آشکار کرنے سے شروع ہو کر، چبائی ہوئی ہڈی کو پھر سے چچوڑنے پر ختم ہوگئی۔ ایسی ہی صورت حال کا آج سامنا ہے۔؟''

''قصہ کچھ یوں ہے دلارے میاں۔۔۔!'' (نواب شبن مرزا نے صورت حال کی نزاکت بھانپتے ہوئے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی تو خلیفہ عبدالرشید نے نواب شبن مرزا کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا)

''آپ کی گفتگو حقیقت اور فسانے کا عمدہ نمونہ ہے۔ جواب دینا اس لیے مناسب نہیں کہ بڑھتی عمر اور اختصار میں ہمیشہ اینٹ کتے کا بیر رہا ہے، ویسے بھی آپ نے کونسا ہمیں لٹھ دے مارا ہے کہ ہم تلوار سونت کر میدان میں اُتر آئیں۔ البتہ اندر سبھا کا ذکر کرنے سے پہلے چند مہوشاور مہ جبینوں کا انتظام ہو جاتا تو آپ کی بات میں وزن کے ساتھ منطق بھی آ جاتی۔ چلیئے نہ آپ کہیں جانے پر آمادہ ہیں، نہ ہمیں کسی قسم کی جلدی ہے۔''

یار زندہ صحبت باقی

ہمارے خیال میں چھوٹے پیرزادہ کے نئے کارنامے کی نسبت ہم سے زیادہ اپنے چھکن میاں باخبر ہیں۔ ہماری معلومات کا ذریعہ بھی چھکن میاں ہی ہیں۔'' (آیئے چھکن میاں! میلہ لوٹ لیجیے)

''اجی خلیفہ صاحب! کیوں شرمندہ کرتے ہیں!''

چہ پدّی چہ پدّی کا شوربہ

ہمارے منہ میں جتنے دانت ہیں وہ ہم سے زیادہ آپ جانتے ہیں۔ آپ کی حیثیت تو کوچہ خداداد میں دائی کی مانند ہے جو منہ کے ساتھ پیٹ کی خبر بھی رکھتی ہے۔

''دانت، کونسے والے، اصلی یا نقلی۔۔۔؟'' (ایک آواز)

''اماں بات یہ ہے کہ ہمارے اکثر شارناتھی دوست آپس میں ایک جملہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں پنجابی زبان تو نہیں آتی البتہ! اردو زبان میں ہی آپ کی نذر کیے دیتے ہیں''

''راہ پیا جانے یا واہ پیا جانے''

(چھکن مرزا نے ترکی بہ ترکی جملہ اُچھال دیا)

''بزرگوں کی محفل کو لونڈوں کی منڈلی نہ بنایا جائے (وجاہت مرزا نے چاروں جانب سر گھماتے ہوئے تنبیہہ کرنا مناسب جانا)

''آپ لوگ ہم سے بہتر جانتے ہیں (چھکن میاں نے اہلِ محفل کو مخاطب کرتے ہوئے توجہ طلب نظروں سے دیکھا) مدرسہ کے واقعے کے بعد بڑے پیرزادہ نے چھوٹے پیرزادہ کو مدرسہ سے اٹھا لیا تھا۔ ایک عرصہ تک نہ چھوٹے پیرزادہ محلے میں نظر آئے اور نہ لڑکوں کی منڈلی میں کسی نے اُن کو دیکھا۔ بڑے پیر صاحب کے رعب اور دبدبے کے باعث براہِ راست چھوٹے پیر صاحب کی بابت دریافت کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

کچھ دنوں بعد آڑے پاجامے، کرتے، واسکٹ اور کھچڑی دار پٹے ادھیڑ عمر ایک صاحب کو ہر شام آتے دیکھا تو لوگوں کا تجسس بڑھنے لگا۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے نئے آنے والے حضرت کی بابت دریافت کرتا تو جواب میں کوئی شانے اُچکا کر ہونٹ سکوڑتے ہوئے سر کی جنبش اور کوئی ''خدا معلوم'' کہہ کر جان چھڑا لیتا۔ اہلِ محلہ کو ایک مرتبہ پھر خلیفہ عبدالرشید کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ ایک روز جب محفل شباب پر تھی حضرتِ خلش دہلوی نے قصہ چھیڑ دیا۔''

''اماں خلیفہ! یہ جو ہر روز شام کو نستعلیق طرز کے ایک صاحب پیر خانے پر آتے اور جاتے نظر آتے ہیں، ان کا حدود اربعہ کیا ہے؟''

''بھلا بتلاؤ! آپ نے ہمیں خفیہ پولیس کا ہرکارہ سمجھا ہے یا مخبر؟''

''لاحول بلا قوۃ! مرزا صاحب کبھی کبھی تو آپ اس قدر بدلحاظ اور بدذوق جاتے ہیں کہ جی جل کر کباب ہو جاتا ہے۔'' (نواب شبن مرزا نے خلیفہ عبدالرشید کا اُگالدان اُٹھا کر پان کی گلوری کو بدذائقہ معجون یا سفوف کی مانند اُگلتے ہوئے رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے جملہ مکمل کیا)

''بات صاف ہے، اختصار ہمیں آتا نہیں، طوالت آپ کو بھاتی نہیں، کیوں نہ خاموشی اختیار کی جائے۔''

''لگتا ہے! دلارے میاں کی بات اب تک پھانس بن کر خلیفہ کے سینے میں اٹکی ہوئی ہے۔''

''اب اتنے تھُڑدِلے بھی نہیں ہیں''

''تو پھر بتلایئے نا! ہم اپنے روّیے پر شرمندہ ہیں۔''

''توبہ استغفار (گناہ گار تو نہ کیجیے خلیفہ عبدالرشید نے دلارے میاں کی معذرت کو خوش دلی سے قبول کرتے ہوئے بیان جاری رکھا) ہماری اطلاع کے مطابق مذکورہ صاحب محکمہ تعلیم میں کسی اچھے عہدے پر فائز ہیں اور فائق بجنوری کے نام سے شعر بھی کہتے ہیں۔ قریب چھ ماہ پہلے بجنور سے تبادلہ کرا کے دلّی آئے ہیں۔ دارالخلافہ ہونے کے سبب دلّی میں ترقی کے مواقع اُن کے خیال میں زیادہ ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ چونکہ بڑے پیر صاحب اور فائق بجنوری صاحب کے خاندانی مراسم ہیں اس لیے انہوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے فائق صاحب کے تبادلے میں مدد فرمائی اور فائق صاحب اُس احسان مندی کا قرض چکانے کی غرض سے چھوٹے پیر صاحب کو ٹیوشن پڑھانے آ رہے ہیں''

''بڑے پیر صاحب کے تو عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے خانوادے سے بھی دیرینہ مراسم رہے ہیں۔''

''عبدالرحمٰن بجنوری۔۔۔! وہی مرزا غالب والے۔۔۔؟'' (بلّن میاں نے حیرت کا اظہار کیا)

''جی جی، مرزا غالب والے عبدالرحمٰن بجنوری۔'' (خلیفہ عبدالرشید نے اعتماد کے ساتھ تصدیق کی)

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ فائق صاحب کا تعلق عبدالرحمٰن بجنوری کے خانوادے سے ہے۔''

''آپ کے دل میں کسی طرح کا شک ہو تو فائق صاحب سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔''

''صرف دریافت ہی نہ کیا جائے بلکہ فائق صاحب کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام رکھا جائے۔ اماں! اس خاندان کے نہ صرف اردو شاعری بلکہ مرزا اسداللہ خان غالب پر بڑے احسانات ہیں۔ کوئی ہے جو بتلا سکے کہ مرزا غالب کی وفات کے دس، بیس یا پچاس سال بعد کتنے لوگ مرزا یا اُن کے کلام سے آشنا تھے۔'' (خلش دہلوی کے بیان میں جوش و ولولہ اور منطق اہل محفل کے چہروں پر شفق بن کر اُمڈ رہی تھی اور ہر کسی کے دل کی دھڑکن میں مرزا نوشہ بہ انداز سخن دستک دے رہے تھے)

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے، بیاباں مجھ سے
درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں
صورتِ دُود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے
غمِ عشاق نہ ہو، سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے، جادۂ صحرائے جنوں
صُورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو!
پُر ہے سائے کی طرح، میرا شبستاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں، گر تُو مجھے گردن مارے
ہو نگہ، مثلِ گُلِ شمع، پریشاں مجھ سے
بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے ہے!
سایہ خُورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں، تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں، مُجھ سے
نگہِ گرم سے ایک آگ ٹپکتی ہے، اسدؔ!
ہے چراغاں، خس و خاشاکِ گُلستاں مجھ سے

آج کا دن پیر خانے کے لیے بہت نیک اور سعد ہے۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے، بڑے پیر صاحب اور اُن کے اہلِ خانہ نے کئی کڑے کوس کاٹے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ چھوٹے پیر صاحب کے اُستاد فائق بجنوری نے جس استقامت اور برداشت کے ساتھ رواداری کا مظاہرہ کیا وہ نہ صرف قابل داد بلکہ قابل قدر بھی ہے وگرنہ کوئی اُستاد شاگرد کی نالائقی اور نااہلی پر اگر یہ الفاظ کہہ دے کہ:

''آپ پرلے درجے کے نالائق ہیں''

جواب میں شاگرد شرمندگی، ندامت یا معذرت کے بجائے ترکی بہ ترکی یہ کہے کہ:

''آپ خود ہوں گے۔''

کوئی اور استاد ہوتا یا تو کھینچ کر ایسا زناٹے دار تھپڑ گال پر رسید کرتا کہ صاحبزادے کے چودہ دونی اٹھائیس طبق روشن ہو جاتے۔ یا بنا کچھ کہے سُنے اُلٹے پیروں اپنی راہ لیتا اور پلٹ کر کبھی اُس گھر کا رخ نہ کرتا۔

خدا معلوم فائق بجنوری صاحب کی خاندانی تربیت کا اثر تھا یا وہ مزاجاً صلح جو انسان ہیں یا ہو سکتا ہے بڑے پیر صاحب کے اس قدر زیر بار یا ممنونِ احسان تھے کہ یہ در پہ چھوٹے پیر صاحب کی نافرمانیاں اور نالائقیاں درگزر کیے جاتے تھے۔

یوں تو ہر روز گھریلو ملازم شفّو میاں فائق صاحب کے آتے ہی طشتری میں رکھ کر پانی کا نقشین گلاس میز پر سجا جاتے۔ دس سے پندرہ منٹ گزرنے کے بعد دوسری طشتری میں چائے کی کیتلی، دودھ دان، شکر دان کے ساتھ ایک پلیٹ میں بسکٹ، پھل اور نمکو بھی لے آتے۔ طشتری کو میز پر رکھنے کے بعد ادب سے کپ میں چائے کا قہوہ ڈالنے کے بعد شکر اور دودھ کی بابت روز دریافت کرتے۔ شفّو میاں کے روز روز شکر اور دودھ کی مقدار دریافت کرنے پر فائق صاحب نے ایک رز وکہا:

''ہمارے خیال میں اب تک تو آپ کو ہمارے مزاج اور مذاق سے بخوبی آگاہ ہونا چاہیے تھا۔''

کچھ دیر توقف کے بعد شفّو میاں نے نہایت ادب سے عرض کیا:

''جی بالکل ہونا چاہیے تھا، ہماری تربیت کا تقاضا ہے کہ ہم ہر آنے والے مہمان کی خدمت میں چائے، کوفی یا مشروب پیش کرتے وقت شکر اور دودھ کی مقدار لازمی طور پر دریافت کریں۔''

''بھلے ہی وہ مہمان روز آتے ہوں؟''

''جی حضور!''

''اس تکلف کی کوئی وجہ تو ہوگی؟''

''اس باب میں پیر صاحب کا فرمان ہے کہ انسان کا مزاج اور مذاق وقت کے ساتھ اور صحت کے معاملات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ دوسری وجہ پیر صاحب یہ فرماتے ہیں کہ ہر روز دریافت کرنے سے بھول چوک کا اندیشہ بھی نہیں رہتا۔''

''اور تیسری وجہ؟''

''تیسری وجہ نہیں بتلائی پیر صاحب نے۔۔۔''

''جیسے ہی بتلائی تو آپ کی خدمت میں ضرور عرض کر دیں گے۔''

''واللہ شفّو میاں! آپ بھی کمال کرتے ہیں، بقول ولی اللہ محبؔ:

اے بندہ پرور اتنا لازم ہے کیا تکلف
اُٹھایئے غریب خانہ چلئے بلا تکلف''

کہاں اس قدر ادب آداب کہاں شفّو میاں کی غیر موجودگی میں استاد شاگرد سے ایک گلاس پانی طلب کرے اور شاگرد پانی پلانے کے بجائے ڈھٹائی سے کہہ دے:

''ہم نے تو کبھی خود اُٹھ کر پانی نہیں پیا پھر آپ کو کیونکر پلا سکتے ہیں۔''

اس بار بھی فائق بجنوری نے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے صرف اتنا کہا:

''چلئے کوئی بات نہیں، کتاب کھولئے۔''

اُس روز کی بابت بتلاتے ہوئے تو ہمیں خود شرم آتی ہے۔ بھلے ہی فائق صاحب کو محکمہ تعلیم سے معقول مشاہرہ ملتا تھا۔ چھوٹے پیر صاحب کے علاوہ شہر کے کوتوال مستجاب خان کے دو بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتے تھے مگر اس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ وہ واسکٹ میز پر رکھ کر واش روم جائیں اور اُن کے پیٹھ پیچھے واسکٹ کی جیب سے ایک، دو نہیں پورے دس روپے اُڑا لیے جائیں!

قصہ مختصر یہ کہ اگر آج چھوٹے پیر صاحب درجہ اوّل کے بجائے سیدھے درجہ ششم میں داخل ہو گئے ہیں تو یہ صرف بڑے پیر صاحب کی صاحب سلامت اور میل ملاپ کا ثمر ہے۔ اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ بڑے پیر صاحب نیشنل ہائی سکول ترکمان گیٹ کی انتظامی کمیٹی کے چیئرمین اور شہر کی بڑی سیاسی اور سماجی شخصیت ہیں مگر ایک حقیقت جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی وہ ہے فائق بجنوری صاحب کی محنت، مروت اور مشقت جس طرح فائق بجنوری نے بُھس بھرے دماغ میں علم کی شمع جلائی اور بد دماغ، بدمزاج اور بدتہذیب شاگرد کی تمام جاہلانہ حرکتوں کو درگزر کیا، سب کچھ اُسی کی بدولت ممکن ہوا۔ ایک سے زائد بار بڑے پیر صاحب نے نہایت شاندار الفاظ میں فائق صاحب کی خدمات کے اعتراف میں بڑے بڑے الفاظ حسنہ کہے مگر آج تو مارے خوشی کے بڑے پیر صاحب الفاظ اور احساس کا خزانہ لٹانے پر آمدہ تھے۔

بہت جی خوش ہوا ہے حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

پہلا اعتراض سکول کی جانب سے تحریری شکل میں چھوٹے پیرزادہ کے ناترا شیدہ بال، کلائی پر قیمتی گھڑی اور جیب میں قیمتی رومال کے حوالے سے بڑے پیر صاحب کو موصول ہوا جس پر فوری عمل کرتے ہوئے بال سلیقے سے ترشوائے گئے، کلائی پر بندھی گھڑی اور جیب کا رومال ضبط کر لیے گئے ساتھ ہی چھوٹے پیرزادہ اور اہلِ خانہ کو اس حوالے سے مکمل پاسداری کا پابند بنا دیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد سکول کی جانب سے تحریری شکایت میں چھوٹے پیر صاحب کے پرتکلف ناشتے اور شاہ خرچیوں کی نسبت توجہ پر بڑے پیر صاحب نے ناشتے کی نسبت اہلِ خانہ کو تنبیہہ کے ساتھ چھوٹے پیرزادہ کے جیب خرچ کو قطعی طور پر بند کرتے ہوئے حکم صادر کیا کہ چھوٹے پیر صاحب کو جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ والدہ صاحبہ کے بجائے براہِ راست بڑے پیر صاحب سے طلب کرے جس قدر ممکن ہو سکا چھوٹے پیر صاحب کی خواہش پوری کی جائے گی البتہ! الّم غلّم کی قطعاً گنجائش نہ ہوگی۔

چند ہفتے ہی مشکل سے گزرے ہوں گے کہ سکول سے ایک اور تحریری شکایت نامہ بڑے پیر صاحب کو موصول ہوا جس میں چھوٹے پیر صاحب کے اساتذہ کے ساتھ رویئے کی سخت الفاظ میں نہ صرف شکایت بلکہ مذمت کی گئی تھی۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ چھوٹے پیر صاحب کی جماعت کے اکثر طالب علم اُس روز مہابھارت کا دیا ہوا پاٹھ ''چیڑ ہرڑن'' یاد کر کے نہ آئے تھے لہٰذا ماسٹر ترپاٹھی صاحب نے پوری کلاس کو مرغا بننے کا حکم صادر فرمایا:

''قریب پانچ ہزار قبل مسیح، پانڈوں نے اندر پرست میں نیا محل بنوایا اور کوروؤں کو محل دیکھنے کی دعوت دی۔ کوروؤں کی جانب سے اکیلا دریودھن پانڈوں کا محل دیکھنے آیا۔ محل دیکھ کر دریودھن کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ سامنے کی دیوار میں اُسے دروازہ اور باہر کا خوبصورت منظر نظر آیا تو وہ جھٹ پٹ وہاں سے نکلنے کے لیے آگے بڑھا مگر وہ دروازہ نہیں دیوار پر بنے خوبصورت نقش و نگار تھے جس سے ٹکرا کر دریودھن گرتے گرتے بچا۔ اپنی خفت مٹانے کے لیے دریودھن پھر سے محل کے مختلف حصوں میں گھوم پھر کر محل دیکھنے لگا ہے۔ ایک جگہ ایسے ہی بھرم میں دریودھن نہ چاہتے ہوئے بھی پانی میں گر جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر دروپدی زور سے قہقہہ لگا کر کہتی ہے:

''اندھے کا پُتر اندھا''

یہ سن کر دریودھن آگ بگولہ ہو جاتا ہے اور اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کو زندگی کا واحد مقصد بنا کر واپسی کے لیے چل پڑتا ہے۔

شکنی ماما کے مشورے پر دریودھن نے پانڈوں کو ہستنا پور مدعو کیا اور یودھشٹر کو جوا کھیلنے کی دعوت دی۔ کھیل شروع ہوا اور باری باری پانڈوں اپنا سب کچھ ہار گئے۔ اُس کے بعد یودھشٹر نے ایک ایک کر کے اپنے چاروں بھائی بھیم، ارجن، نکُل، سہدیو کو داؤ پر لگا دیا مگر قسمت نے یاوری نہ کی۔ چارو نا چار یودھشٹر نے تھک ہار کر خود کو بھی داؤ پر لگا دیا مگر اس بار بھی قسمت نے یاوری نہ کی۔ تھکا ہارا یودھشٹر واپس جانے کے لیے کھڑا ہوا تو دریودھن نے معنی خیز انداز میں کہا:

''تم نے تو بہت جلد ہمت ہار دی، ابھی تمہارے پاس داؤ لگانے کے لیے ایک چیز باقی ہے۔''

یودھشٹر نے سوالیہ نظروں سے دریودھن کی جانب دیکھا تو دریودھن نے ''پنچالی'' یعنی پانچ بھائیوں کی اکلوتی بیوی دروپدی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''تم چاہو تو آخری داؤ کے طور پر دروپدی کو لگا سکتے ہو۔ اگر تم یہ آخری داؤ جیت گئے تو اب تک ہارا ہوا سارا مال تمہیں واپس کر دیا جائے گا۔''

یودھشٹر کے پاس دریودھن کی تجویز قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یودھشٹر کی آخری کوشش بھی پہلی تمام کوششوں کی طرح ناکام ہوئی۔ وہ اپنے مال و متاع اور چاروں بھائیوں کے ساتھ دروپدی کو بھی جوئے میں ہار گیا۔

دریودھن نے دوشاسن کو حکم دیا کہ دروپدی کو سبھا میں لایا جائے۔ دوشاسن دروپدی کو بالوں سے کھینچتا ہوا سبھا میں لے آیا اور دریودھن کے حکم پر دروپدی کو بے لباس کرنا شروع کر دیا۔ دروپدی کی داد و فریاد کا کسی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ سبھا میں بیٹھے تمام لوگ حیرت سے دروپدی کا اپمان دیکھتے رہے۔ کسی میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر دروپدی کی مدد کو آتا۔

سبھا کے لوگوں سے مایوس ہو کر دروپدی نے شری کرشن کو مدد کے لیے پکارا۔ کرشن جی نے ظاہر ہوئے بغیر دروپدی کی مدد کی۔ دوشاسن تمام تر جوش و جذبے کے ساتھ دروپدی کی ساری اتارنے میں منہمک تھا مگر ساری ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ جب ساری کے کپڑے کا ایک پہاڑ بن گیا اور دوشاسن پسینے میں شرابور تھک ہار کر بیٹھ گیا تو اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

ساری بیچ ناری ہے کہ ناری بیچ ساری ہے
ساری کی ہی ناری ہے کہ ناری کی ہی ساری ہے''

کلاس کے تمام طالب علم بلا چُوں چراں مرغا بن گئے مگر لمڈھیک ڈیل ڈول کا ایک لڑکا اپنی جگہ چُوں کا تُوں کھڑا رہا۔ ماسٹر ترپاٹھی صاحب نے غصے سے مرغا نہ بننے کی وجہ دریافت کی تو چھوٹے پیر صاحب نے بے ادبی سے کہا:

''ہم مرغا بنتے نہیں، بناتے ہیں!''

ایک دفعہ تو ترپاٹھی صاحب نے بے خیالی میں ڈنڈا ہوا میں لہراتے ہوئے کہا:

''ٹھہر تو سہی، تیری مٹّے شاہی ابھی نکالتا ہوں۔''

دوسرے ہی لمحے اُن کے ذہن میں بڑے پیر صاحب کے جاہ و جلال اور اونچے رسوخ کا خیال کوندا اور ہوا میں لہراتا ڈنڈا خود بہ خود نیچے ہو گیا۔ ملازمت کے طویل عرصے میں ترپاٹھی صاحب کو پہلی بار اس قدر بے عزتی کا سامنا تھا جس کے زیر اثر پیر پٹکتے، جھلاّتے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کی جانب تیز قدموں سے جاتے دکھائی دیئے۔

بڑے پیر صاحب نے تحریری شکایت کا جواب دینے کے بجائے خود سکول آ کر معاملہ نبٹانا مناسب جانا۔ ایک طرف تخلیئے میں ہیڈ ماسٹر صاحب کو آئندہ اس عمل کو نہ دہرانے کی درخواست کی دوسری جانب چھوٹے پیر صاحب کو بلا کر کلاس روم لے جایا گیا اور وہاں موجود دیگر طالب علموں کی موجودگی میں ترپاٹھی صاحب سے معافی منگوائی گئی۔ چھوٹے پیر صاحب لفظ معافی پر خاصے جز بز ہوئے اور جسمانی حرکات و سکنات سے بڑے پیر صاحب کو غچہ دینے کی پوری کوشش کی مگر بڑے پیر صاحب کی آنکھوں میں لال ڈورے دیکھ کر چھوٹے پیر صاحب کی ایک نہ چلی۔ ہر چند معافی مانگنے والے کا لہجہ اور انداز قطعی ناپسندیدہ تھا مگر ایک طرف ہیڈ ماسٹر منظور احمد خاں اور دوسری طرف بڑے پیر صاحب کی موجودگی۔ چارو نا چار جس بے دلی اور بے توجہی سے معافی مانگی گئی اُسی بے گانگی اور بے مروتی سے معافی دے دی گئی۔

اُس روز کے بعد نہ تو ترپاٹھی صاحب نے چھوٹے پیر صاحب سے کسی قسم کا براہِ راست کلام کیا نہ چھوٹے پیر صاحب نے جھوٹے منہ اپنے روّیہ پر شرمندگی، ندامت تو دور کی بات ترپاٹھی صاحب کے پریڈ کو سنجیدگی سے لینا ہی چھوڑ دیا۔ دل ہوا تو آ گئے نہ دل ہوا تو کسی ہم جماعت سے ہوم ورک لے کر کاپی کا پیٹ بھر دیا۔

غالباً یہ آٹھویں جماعت کا واقعہ ہے۔ چھوٹے پیر صاحب کی تنگڑی جی ہاں ان تین سالوں میں غیاث الدین، وجے دوبے اور چھوٹے پیر صاحب کی دوستی اتنی قربت میں بدل گئی تھی کہ اس کو تنگڑی کا نام دیا گیا تھا۔ اس تنگڑی کی مرضی کے بغیر کسی بھی طالب علم کو کوئی کام کرنے کا اختیار نہ تھا۔

اُن دنوں آٹھویں جماعت کے امتحانات بورڈ کے زیر تحت ہوا کرتے تھے اس لیے سالانہ امتحان کے دنوں میں آٹھویں جماعت کو تیاری کرانے کے لیے سکول میں ٹھہرایا گیا تھا۔

کسی روز یہ تنگڑی نو سے بارہ فلم دیکھنے نکل جاتی، کسی روز نور محل ہوٹل نہاری، پائے اور بریانی اڑانے پہنچ جاتی اور کسی روز بازار کا مٹر گشت ضروری قرار پاتا۔ اُس روز گوپی چائے والے کی دکان پر جا پہنچے جس کی چائے دودھ میں خشخاش ملا کر اونٹانے کے سبب پورے شہر میں لذت اور ذائقے کے لیے مشہور تھی

جس کے باعث پینے والوں کے ٹھٹ لگے رہتے تھے۔ چائے پینے کے بعد دوستوں کی تگڑی مٹرگشت کرتے ہوئے بانکے مرزا کی دوکان پر پان کھانے جا پہنچی۔ پہلے پہل تو بانکے مرزا نے تینوں دوستوں کا گرمجوشی سے حال احوال دریافت کرتے ہوئے آنے کا سبب پوچھا۔ چھوٹے پیر صاحب بولے:

''یہ آپ ہمیں سے کیوں دریافت کر رہے ہیں۔۔۔؟''

''دیکھئے میاں صاحبزادے! گھما پھرا کر بات کرنے کی ہمیں عادت ہے اور نہ مزاج، صاف صاف لفظوں میں آنے کا سبب بتلایئے۔''

''منہ لال کرنے آئے ہیں اور کس لیے (بانکے مرزا کے قریب ہو کر) کرادو نا!''

''تو یوں کہیے نا! گلوری سے شوق فرمانے آئے ہیں'' (خاص دان سے پان نکالتے ہوئے)

''گلوری کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہوگا۔ منہ لال یا گلابی کرنے کا؟''

''ہم آپ کو صاف صاف بتلائے دیتے ہیں کہ آپ ہمارے بچوں کی مانند ہیں۔ اس لیے ہم آپ کی کسی بات کا جواب دینگے نہ جی میلا کریں گے۔''

''بیچ میں، ایک بار پھر کہیے نا، پیار سے'' (غیاث الدین نے جملہ مکمل کرنے پر آنکھ مارنا ضروری جانا)

بانکے مرزا نے خاموشی سے تینوں لڑکوں کو اُن کی مرضی کے پان لگا کر دئے اور جب انہوں نے سگریٹ طلب کیے تو بانکے مرزا نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا:

''اللہ! اس عمر میں، سگریٹ پئیں گے آپ! بُری بات، بہت بُری بات ہے۔ یقین مانیے اگر آپ کے بزرگوں کا پاس نہ ہوتا تو ہم کسی صورت آپ کو سگریٹ تو کیا، گلوری بھی نہ دیتے۔''

''اماں بانکے مرزا! ہم تو بڑی اُمید لے کر آئے تھے آپ کے پاس مگر آپ تو عطار کے لونڈے سے بھی زیادہ گھامڑ نکلے!'' (غیاث الدین ٹھٹھول کے انداز میں)

''آپ نے وہ کہاوت تو ضرور سنی ہوگی بازار میں بیٹھنے والے یا والی کو۔۔۔ سے کیا غرض، سو آپ کا کام سودا فروخت کرنا ہے، کیجیے اور دام وصول لیئے''

اللہ توبہ۔۔۔! (بانکے مرزا نے ناگواری سے سگریٹ کی ترپل لڑکوں کی جانب بڑھائی) تینوں دوستوں نے پانچو پچپن، کیپسٹن، کیونڈر پاسنگ شو چھوڑ کر چار مینار جیسے تیز تمبا کو کی تین سگریٹس لے کر سلگائیں اور بنا ادائیگی کیے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر نامور فلمی ولن پران کی طرز پر دھوئیں کے چھلّے بنانے لگے۔

سکول کب آیا کسی کو پتہ نہ چلا۔ ہوش تینوں دوستوں کے تب اُڑے جب ہیڈ ماسٹر منظور صاحب کو سکول کے مین گیٹ کے باہر کھڑا پایا جن کے ہاتھ میں مولا بخش لہرا رہا تھا وہ بھی موٹا والا!!!

LIFE NEVER COME AGAIN

1. The STOMACH is

injured when you do not have breakfast in the morning.

2. The KIDNEYS are

injured when you do not even drink 10 glasses of water in 24 hours.

3. GALLBLADDR is

injured when you do not even sleep until 11o'clock and do not wake up to the sunrise.

4. The SMALL INTESTINE is

injured when you eat cold and stale food.

5. The LARGE INTESTINES are

injured when you eat more fried and spicy food.

6. The LUNGS are

injured when you breathe in smoke and stay in polluted environment of cigarettes.

7. The LIVER is

injured when you eat heavy fried food, junk, and fast food.

8. The HEART is

is injured when you eat your meal with more salt and cholesterol.

9. The PANCREAS is

injured when you eat sweet things because they are tasty and freely available.

10. The Eyes are

injured when you work in the light of mobile phone and computer screen in the dark.

11. The Brain is

injured when you start thinking negative thoughts.

12. The SOUL gets

injured when you don't have family and friends to care and share with you in life their love, affection, happiness, sorrow and joy.

خوش باش شہزادہ

(آسکر وائلڈ)

ترجمہ : فیروز عالم

(امریکہ)

آسکر وائلڈ (۱۸۵۶۔۱۹۰۰) آئرلینڈ میں پیدا ہوا تھا مگر اس نے زیادہ عمر لندن میں گذاری۔ اپنی خوش لباسی اور اچھے اخلاق سے وہ جلد لندن کی اعلیٰ سوسائیٹی کا حصہ بن گیا شروع میں اس نے شاعری کی مگر جب اسکا پہلا ناول شائع ہوا تو وہ کچھ پہچانا جانے لگا مگر جب اس کے اسٹیج ڈرامے مقبول ہوئے تو وہ شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ مگر اسی دوران اس پر ایک سخت اخلاقی جرم کے سلسلے میں دو سال کی جیل ہوگئی جس کے بعد وہ سخت تنزلی کا شکار ہوا اور آخر کار نہایت بدحالی اور غربت کے عالم میں پیرس میں انتقال کر گیا۔

☆

دارالحکومت کے مرکزی چوک میں ایک بہت اونچے مینار پر شہزادے کا مجسمہ نصب تھا۔ اس ملک کی تاریخ میں اس کی حکومت کا دور سب سے سنہری دور تھا اسی لئے اسے یہ اعزاز بخشا گیا تھا۔ اسکے جسم کے چاروں طرف سونے کی مہین اور باریک پتریوں کا جال بنا گیا تھا، اسکی آنکھوں میں زمرد کے ہیرے جڑے ہوئے تھے حتیٰ کہ اسکی تلوار کے ہتھے پر بھی ایک بڑا سرخ یاقوت جگمگا رہا تھا۔ صبح و شام اس کے اطراف سے گذرنے والے نہ صرف اسکو یاد کر کے دل ہی دل میں اس کو تہنیت کے ہار پہناتے تھے بلکہ اس مجسمے کی خوبصورتی پر بھی وہ پھولے نہ سماتے تھے۔ وہ یہ کہتے نہ تھکتے تھے کہ یہ اسی قابل تھا کہ اس پر کڑوڑوں روپے خرچ کر کے ایسا ہی لاجواب مجسمہ تعمیر کیا جاتا جس کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ مائیں اپنے ننھے بچوں کا ہاتھ تھامے جب اس کے پاس سے گذرتیں تو ان سے کہتیں تم بھی ایسے ہی بننے کی کوشش کرنا۔ کوئی کہتا یہ کس قدر خوش لگتا ہے، اسکی آنکھوں کی چمک اور اسکے ہونٹوں کی دائمی مسکراہٹ بتاتی ہے کہ وہ کس قدر خوش اور مطمئین ہے۔

ایک رات ایک فاختہ جو اپنے غول کے ساتھ گرم ممالک کی جانب پرواز کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئی اس شہر سے گذری۔ یہ ان پرندوں کا معمول تھا کہ سردیوں میں یہ جنوب کی طرف نقل مکانی کرتے تھے۔ اس دفعہ بھی انکا ارادہ مصر میں دریائے نیل کے کنارے لگے درختوں کے جھنڈ میں بسیرا کرنے کا تھا مگر یہ فاختہ ان سے بچھڑ گئی تھی اور اب رات ہونے والی تھی۔ اس نے سوچا یہیں کہیں رات کو بسیرا کر لیا جائے اور دن کی روشنی میں پھر سے منزل کی جانب اڑان کی جائے۔ اڑتے ارتے وہ اسی شہر میں پہنچ گئی تھی۔ اس نے بلندی سے شہر کا چکر لگایا اس کی نظر بھی اس مجسمہ پر پڑی۔ اس کا دل اس مجسمہ کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسی مجسمہ کے پاس رات گذارے گی۔ اس نے غوطہ لگایا اور مجسمے کے قدموں کے درمیان جو تھوڑی سی جگہ تھی اس میں پر سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ یہاں تازہ ہوا تھی، ایک خوبصورت نظارہ تھا اور اچھی خاصی گرمائی تھی۔ وہ اپنی قسمت پر ناز کرنے لگی۔ اب رات ہو چکی تھی اس نے سونے کی تیاری کی اور ابھی اس نے اپنا سر پروں میں چھپایا ہی تھا کے پانی کا ایک قطرہ اس پر گرا۔ اس نے سوچا، اف بارش پڑنے لگی، یہ جگہ تو بہت ہی غیر محفوظ ہے اور مجھے بارش سے نہیں بچا سکتی، ایسے قیمتی مجسمے اور اس شان و شوکت کا کیا فائدہ جو کسی کو بارش سے نہیں بچا سکے، مجھے یقیناً کسی چمنی کی تلاش کرنی چاہیے۔ ابھی اس نے اڑنے کی تیاری کی ہی تھی کہ اس پر دوسرا اور تیسرا قطرہ گرا۔ اس نے اوپر دیکھا، لیکن یہ کیا !! آسمان تو صاف تھا، مگر اسے نظر آیا کہ شہزادے کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور یہ بارش نہیں بالکہ اس کے آنسو تھے۔ فاختہ حیران ہوگئی اس نے پوچھا تم کون ہو۔ شہزادے نے کہا لوگ مجھے ''خوش باش شہزادہ'' کہتے ہیں۔ اگر تم خوش باش شہزادے ہو تو تم رو کیوں رہے ہو، تمہارے آنسوؤں نے تو مجھے بھگو دیا ہے۔ شہزادے نے کہا ''جب میں نوجوان تھا مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ آنسو کسے کہتے ہیں، میں ایک بڑے محل میں رہتا تھا جہاں غموں کا داخلہ منوع تھا۔ میں پھولوں کلیوں اور شفاف نہروں والے باغوں میں گھوم تا تھا اور سال کے آخیر پر مرمریں فرش اور ست رنگے فانوسوں کی جگمگاتی روشنیوں میں رقص کرتا تھا۔ مجھے سب خوش نصیب اور ''ہمیشہ خوش شہزادہ'' کہتے تھے۔ مگر اب میرے مرنے کے بعد مجھے شہر کے سب سے اونچے مینار پر کھڑا کر دیا گیا ہے جہاں سے میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں، وہ کچھ بھی جو میں محل میں رہتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اب میں دیکھ سکتا ہوں کہ میرے شہر میں کس قدر دکھ، کس قدر کس مپرسی اور کس قدر افلاس ہے اور ایک طبقہ کس قدر اذیت میں زندگی گذار رہا ہے۔ اور اگر چہ اس مجسمے میں نصب میرا دل ایک سخت دھات، شاید فولاد سے بنایا گیا ہے مگر اسکی روح ویسی ہی نرم ہے جیسی اس وقت تھی جب میں زندہ تھا۔ اب میں سوائے رونے کے کچھ نہیں کر سکتا''

شہزادہ بولتا چلا گیا ''یہاں سے کچھ دور ایک گلی میں ایک شکستہ مکان ہے، اسکی ایک کھڑکی کھلی ہے اور میں اس سے دیکھ سکتا ہوں کہ چراغ کی مدھم روشنی میں ایک عورت بیٹھی ہے اس کا چہرہ اترا ہوا ہے، اسکی آنکھیں تھکن سے اپنی چمک کھو چکی ہیں۔ اسکی انگلیاں سوئیوں کے ننھے ننھے زخموں سے سرخ ہیں کیونکہ وہ سلائی سے اپنا پیٹ بھرتی ہے۔ وہ ایک زریفت کے لباس پر خوبصورت ستارے ٹانک رہی ہے جو ملکہ کی خاص کنیز کے لئے ہے تا کہ کل کے شاہی محفل رقص میں وہ ملکہ کا ساتھ دے سکے۔ اس نیم تاریک کمرے کے ایک کونے میں اسکا ننھا بچہ بخار میں مبتلا ہے اور کتنی دیر سے موسمی کا عرق مانگ رہا ہے مگر اس کے پاس اس کے لئے کوئی رقم نہیں۔ اے میری پیاری فاختہ، ایک میری پیاری فاختہ کیا تو اپنی چونچ

سے یہ سرخ یاقوت جو میری تلوار میں جڑا ہے، نوچ کر اسے نہیں پہنچا سکتی۔ میرے پیر تو سنگ مرمر اور گارے میں قید ہیں میں کچھ کرنے کے قابل نہیں۔'' یہ سن کر فاختہ کہنے لگی مگر مجھے تو اپنے ساتھیوں کے پاس جانا ہے جو یقیناً نیل کے گرم پانیوں کے اوپر ادھر ادھر پرواز کر رہے ہونگے، پھر وہ میرا انتظار بھی کر رہے ہونگے۔ اس پر شہزادہ خوش آمدی لہجے میں بولا ننھی فاختہ کیا تو میرا یہ کام نہیں کریگی۔ بس ایک رات کی بات ہے۔ کیا تیرا دل اس عورت کے لئے نہیں دکھ رہا، پیاری فاختہ بس ایک کام، یہی کام'' فاختہ کہنے لگی مگر یہاں بہت سردی بھی ہے، میں یہاں سے جلد گرم علاقے کی طرف پرواز کر جانا چاہتی ہوں۔ شہزادے نے پھر درخواست کی کیا تیرا دل اس ننھے بچے کی پیاس دیکھ کر بھی نہیں پسیجتا۔ اب فاختہ کو بھی اس بچے پر ترس آیا کہنے لگی۔ ''اچھا، سردی تو ہے مگر ایک ہی رات کی بات ہے چلو میں تمہارا یہ کام کر دیتی ہوں'' یہ کہہ کر فاختہ نے اپنی چونچ سے یاقوت نکالا اور شہر کی جانب اڑ گئی۔ وہ شہر کے سب سے بڑے کلیسا پر سے گذری جہاں ہر مینار پر سونے میں لپٹے فرشتوں کے مجسمے نصب تھے، اس کے بعد اسے موسیقی کی آواز اور روشنیوں نے چونکا دیا اس نے نیچے دیکھا، وہ شاہی محل پر پرواز کر رہی تھی جہاں رقص ہو رہا تھا۔ پھر محل کی ایک بالکنی سے ایک نوجوان لڑکی نکلی اس کے ساتھ ایک سجیلا نوجوان بھی تھا۔ وہ اپنے ساتھی سے کہنے لگی:

''میں نے کل کے گرینڈ بال کے لئے اپنے لباس پر ستارے ٹنک وائے ہیں، مگر یہ کمبخت سلائی کرنے والیاں بہت ہی کام چور اور کاہل ہوتی ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اسے تیار نہ کر سکے۔ فاختہ نے یہ سن کر اپنا منہ موڑا اور پرواز میں مصروف رہی۔ اس کے بعد وہ شہر کے درمیان دریا پر سے گذری جسکے پل پر جگہ جگہ نیلگوں روشنیاں بکھیرتے لیمپ استادہ تھے۔

آخر کار وہ شہر کے افلاس زدہ محلے کے اور پر آئی جہاں اسے وہ گھر نظر آ گیا وہ کھڑکی میں سے اندر داخل ہوئی، ماں تھکن سے چور ہو کر سو گئی تھی مگر بچہ بخار سے بچچین تھا اسکا چہرہ تمتما رہا تھا۔ فاختہ نے ہیراماں کے سلائی کے بقچے کے پاس رکھا پھر بچے کے چہرے کے قریب کافی دیر اپنے پر پھڑ پھڑائے، وہ جیسے اسے پنکھا جھل رہی تھی، بچے نے غفلت میں سوچا اوہ یہ کون ہے جو مجھے ٹھنڈی ہوا سے پنکھا جھل رہا ہے اور دوبارہ غفلت میں چلا گیا۔ اس کے بعد فاختہ واپس آئی اور شہزادے کو اپنا حال سنایا۔ پھر کہنے لگی مجھے حیرت ہے کہ اب بھی کافی سردی ہے مگر اس کام کے بعد مجھ میں عجب سی گرمائی آ گئی ہے۔ شہزادے نے کہا اس لئے کہ تم نے ایک نیک کام کیا ہے۔ اچھے کام سے انسان کے اندر ایک خاص حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔

جب صبح ہوئی تو فاختہ نے دھوپ کا مزہ لوٹا، اس نے شہر کی بھی خوب خوب تفریح کی، کبھی کلیسا کے چونچ دار میناروں پر بیٹھی، کبھی دریا کے پانی میں غوطے لگا لگا کر پروں کو جھٹکے دئے، جب سورج غروب ہونے لگا تو وہ واپس شہزادے کو الوداع کہنے پہنچی کیونکہ آج وہ مصر کی جانب پرواز کرنے والی تھی۔ وہ شہزادے سے کہنے لگی ''کیا تمہارا مصر میں کچھ کام ہے یا تم اہل مصر کو کوئی پیغام دینا چاہتے ہو، اس لئے کہ میں اب روانہ ہونے ہی والی ہوں'' اس پر شہزادے نے کہا پیاری پیاری فاختہ کیا تم ایک رات اور نہیں ٹھہر سکتیں؟؟ میری پیاری چڑیا میری بات مان لو۔ ایک رات اور، بس ایک رات'' وہ کہنے لگی ''مگر میرا مصر میں انتظار ہو رہا ہے۔ میرے ساتھی بیقرار ہیں۔ وہاں خوبصورت نظارے ہیں اور دریائے نیل کا گرم اور صحت بخش پانی۔۔!!'' ''مگر پیاری فاختہ بس ایک رات اور۔۔'' فاختہ دل کی نرم تھی، اس نے دیکھا کہ شہزادے کی آنکھیں نم تھیں، اس نے پوچھا مگر کیوں؟؟ شہزادہ کہنے لگا میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک بوسیدہ گھر کی دو چھتی میں ایک غریب نوجوان لڑکا بیٹھا کسی کتاب پر جھکا ہے مگر اس کے لیمپ کا تیل بس اب ختم ہی ہوا چاہتا ہے۔ روشنی اس قدر مدھم ہے کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ پھر سردی سے وہ بار بار جھرجھری لیتا ہے اس لئے کہ نہ تو اس گھر میں کوئی آتشدان ہے نہ ہی انکے پاس جلانے کی لکڑیاں، شہر کے ایک بڑے ادارے نے اسکا ناول شائع کرنے کا وعدہ کیا ہے مگر مجھے یقین ہے ان حالات میں وہ یہ ناول پورا کرنے سے پہلے ہی مر جائیگا۔'' یہ سن کر فاختہ بھی اداس ہو گئی وہ کہنے لگی اچھا، تو تم یہ چاہتے ہو کہ میں اسے بھی یاقوت دے آؤں'' اس پر شہزادہ کہنے لگا مگر میرے پاس دوسرا یاقوت نہیں ہے۔ تم ایسا کرو میری آنکھ سے یہ زمرد نوچ کر اسے دے آؤ۔ وہ اسے بیچ کر جلانے کی لکڑیاں اور لیمپ کا تیل لے آئیگا اور اپنا ناول مکمل کر لیگا'' اس پر فاختہ خود رونے لگی، نہیں نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ شہزادہ ملول ہو کر کہنے لگا پیاری فاختہ ایسا ہی کرو، میں تمہاری خوشامد کرتا ہوں، ایسا ہی کرو۔ فاختہ نے اسکی آنکھ سے زمرد نوچا اور اڑتی ہوئی اس لڑکے کے گھر پہنچی۔ داخلہ آسان تھا کیونکہ اسکی چھت میں ایک سوراخ تھا۔ وہ لڑکا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا اور اس پر کچھ غنودگی بھی طاری ہو گئی تھی، فاختہ نے نہایت چپکے سے اس کی کتاب کے اوپر ہیرا رکھا اور آہستگی سے واپس اڑ آئی۔ لڑکے نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں تو بہت خوش ہوا۔ اس نے سوچا یقیناً اس شہر میں میرے کچھ سراہنے والے بھی ہیں، اب میں اپنا ناول مکمل کر لونگا۔

فاختہ وہاں سے اڑتی ہوئی سمندر کے کنارے آئی جہاں بندرگاہ میں کئی جہاز پانی میں ہلکورے لے رہے تھے۔ وہ مسرور ہو کر کچھ دیر بادبان کی نوک پر بیٹھ کر ین ہلکوروں کا مزہ لینے لگی۔ درنوں مزدور سامان اتارنے میں مصروف تھے۔ اس نے خوشی سے سرشار ہو کر چیخ چیخ کر سب کو بتایا کہ میں آج اس سرد علاقے سے مصر کے گرم ریگستانوں کی جانب پرواز کروں گی۔ مگر اسے یہ دیکھ کر کچھ مایوسی ہوئی کہ ان مزدوروں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور وہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ کچھ دیر بعد وہ اڑ کر اپنے مستقر پر واپس پہنچی اور شہزادے سے کہنے لگی'' شہزادے میں میں تمہیں الوداع کہنے آئی ہوں اس لئے کہ میں آج رات ہی یہاں سے پرواز کر لوں'' شہزادے نے کہا ''اے ننھی چڑیا کیا تو کچھ اور دیر میرے ساتھ نہیں رہ سکتی؟'' اس پر فاختہ بولی ''اے میرے پیارے شہزادے یہاں اب پہلے ہی کافی سردی ہو چکی ہے اور کنون جانے کہ کب برف پڑنی شروع ہا جائے۔ تم جانتے ہی ہو ہم یہ سردیاں نہیں سہہ سکتے اس لئے جلد سے جلد اس موسم میں گرم

علاقوں کو ہجرت کر جاتے ہیں۔تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس وقت جب یہاں سردی میں لوگ ٹھٹھر رہے ہیں دریائے نیل کے ساحل پر نرم اور گرم ریت میں مگر مچھ کاہلی سے لیٹے دھوپ سینک رہے ہونگے۔تیز دھوپ میں کھجور کے درختوں پر میٹھی کھجوریں پک رہی ہونگی۔نہیں میں یہاں اب نہیں ٹھہر سکتی۔میرے ساتھی وہاں فرعون کے مقبروں کے کونوں کھدروں میں اپنے گھونسلے بنا رہے ہونگے اور وہ میری یاد میں بیقرار ہونگے۔میرے اچھے شہزادے میں اب مزید نہیں ٹھہر سکتی۔ مگر تم ایک بہت ہی نیک دل اور نرم طبیعت ہو، میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔بلکہ جب موسم گرما میں واپس اس طرف سے گذرون گی تو تمہارے لئے دو ہیرے، ایک یاقوت جو سرخ گلابوں سے زیادہ سرخ اور ایک زمرد جو گہرے سمندروں کی طرح سبزی مائل نیلا ہوگا لاؤں گی۔۔مگر اب میں نہیں رک سکتی''

شہزادہ کہنے لگا''اچھا جیسی تمہاری مرضی، مگر یہاں سے کچھ دور ایک چوک میں ایک غریب لڑکی ماچس کی ڈبیاں بیچ رہی ہے۔بس یہی اسکے معاش کا ذریعہ ہگر ابھی کچھ دیر پہلے اس کی ڈبیوں کا پورا تھیلا گٹر مے گر گیا اور تیلیاں گیلی ہو گئیں۔وہ ایک کونے میں بیٹھی رو رہی ہے،اتنی سردی میں نہ اسکے پیروں میں جوتے ہیں نہ ہی اسکے سر پر کوئی ٹوپی ہے۔وہ گھر جانے کی ہمت نہیں کر رہی کیوں کہ اسکا باپ بہت ظالم ہے اور وہ اسکو بری طرح پیٹے گا۔تم میری دوسری آنکھ سے بھی ازمرد نوچ لو اور اس کو دے آؤ اس سے اسکی بڑی مدد ہو جائیگی''اس پر فاختہ کی اپنی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ کہنے لگی،ٹھیک ہے میں آج رات اور تمہارے پاس رک جاتی ہوں مگر میں تمہاری دوسری آنکھ سے ہیرا نہیں نوچ سکتی، ہرگز نہیں کیونکہ پھر تو تم بالکل اندھے ہو جاؤ گے۔''شہزادے نے کہا''مجھے آج رات تمہاری ضرورت صرف اسی وجہ سے ہے۔میرے بات مانو اور وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں''فاختہ نے اسکی آنکھ سے ہیرا نوچا اور اڑتی ہوئی گئی اور ہیرے کو لڑکی کے ہتھیلی میں رکھ کر پھر سے اڑ گئی۔لڑکی نے خوشی سے اس چمکتے ہوئے شیشے کے سبز ٹکڑے کو دیکھا اور خوشی خوشی گھر بھاگی۔

مگر جب فاکتہ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ شہزادہ اب اندھا ہو چکا ہے۔اس کے دل میں درد کی لہر اٹھی کہ اس نے نیکی کے لئے اپنی بینائی قربان کر دی۔فاختہ اس کے کندھے پر بیٹھ گئی اور اس سے کہنے لگی کہ اچھے شہزادے اب تم اندھے ہو چکے ہو،تمہیں کسی کی ضرورت ہوگی اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کہیں نہیں جاؤنگی اور ہمیشہ ہی تمہارے ساتھ رہونگی۔مگر شہزادہ کہنے لگا نہیں نہیں تمہیں ضرور گرم علاقوں طرف اڑ جانا چاہئے، یہ موسم تمہارے لئے نہیں ہے میں التجا کرتا ہوں کہ گرم علاقوں کی طرف چلی جاؤ۔فاختہ کہنے لگی نہیں میں اب تمہارے پاس رہوں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے اور وہ اس رات اس کے پیروں میں سو گئی۔

پھر ہر دن سردی بڑھتی گئی حتیٰ کہ نالیوں میں بہتا پانی جم نے لگا۔ فاختہ جب اڑان بھر کر واپس آتی تو شہزادے کو بتاتی کہ جہاں شہر میں امراء رنگ رلیوں میں مصروف ہیں وہاں ایسے محلے بھی ہیں جہاں بچے بھوک سے بلکتے ہیں اور بیمار دواؤں کو سسکتے ہیں۔شہزادے کے پاس اب کوئی ہیرے نہ تھے مگر اس نے فاختہ سے کہا کہ میرے جسم پر جو سونے کے تاروں کا بنا ہوا جال ہے تم اسے نوچ نوچ کر ان غریبوں میں بانٹ دو۔فاختہ نے ایسا ہی کیا۔اب اس مجسمہ کی خوبصورتی ختم ہو چکی تھی، نہ تلوار کے دستے پر سرخ یاقوت، نہ ہی آنکھوں میں چمکتے زمرد کے ٹکڑے اور نہ ہی جسم پر جھلملاتا سونے کے تاروں کا لباس۔ادھر فاختہ بوڑھی اور کمزور ہو چکی تھی اور سردی نے اس پر زبردست اثر کیا تھا وہ اس قدر کمزور ہوگئی تھی اب اس سے اڑا بھی نہیں جاتا تھا۔وہ بس مجسمے کے قدموں میں پڑی رہتی تھی۔اسے معلوم تھا کہ وہ اب زیادہ دن نہیں زندہ رہ سکتی۔اس نیں بڑی ہمت کر کے ایک اور اڑان بھری اور شہزادے کے کندھے پر بیٹھ گئی اس نے شہزادے سے کہا''الوداع میرے دوست، میرے پیارے شہزادے۔۔''شہزادے نے کہا ''الوداع میری پیاری۔تم واقعئی تم میرے ساتھ بہت عرصے ٹہریں، اب تمہیں مصر چلے جانا چاہئے''فاختہ کہنے لگی''مگر میں مصر نہیں جا رہی۔۔میں اب موت کی وادی کی جانب جا رہی ہوں۔موت جو ابدی سکون لیکر آتی ہے''یہ کہا اور کچھ ہی لمحوں بعد وہ ٹھٹھر کر اس کے پیروں میں گر گئی۔

شہریوں نے دیکھا کہ یہ مجسمہ بدشکل ہو چکا ہے اور انکے شہر کی خوبصورتی پر دھبہ ہے تو انہوں نے اسے گرا دیا، ملبے کو پگھلا دیا گیا۔اگرچہ سب کچھ جل کر خاک ہو گیا مگر اسکا دل جو کسی سخت فولادی دھات کا تھا نہ جل سکا۔شہر کے میئر نے کہا یہ کم بخت بھٹی میں بھی نہیں پگھل سکا اسے اب کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دو۔وہیں چڑیا کا مردہ جسم بھی پڑا تھا۔اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فرشتے کو حکم دیا کہ فلاں شہر میں کوڑے کے ایک ڈھیر پر دو بہت ہی نایاب اور انمول چیزیں پڑی ہیں تم وہ میرے لئے لے آؤ کیونکہ وہ مجھے بہت مرغوب ہیں۔ فرشتہ اڑا اور جب اس نے واپس آ کر فاختہ کا مردہ جسم اور شہزادے کا دل اللہ کے حظور پیش کیا تو اللہ تعالیٰ نے خوش ہو کر کہا''تم بالکل صحیح چیزیں لائے ہو، میرا اشارہ انہی کی طرف تھا کیونکہ مجھے یہ بہت محبوب ہیں۔

''نایاب ہیرے''

حال ہی میں سائنس دانوں نے ڈھائی ہزار نادر پتھروں کی دریافت کا دعویٰ کیا ہے۔اس میں چار نادر ہیرے FINGERITE, AMICITE, NAVADAITE اور LCHNUSAITE اتنے نایاب ہیں کہ وہ صرف پانچ یا چھ مقام پر ہی دستیاب ہیں۔ان پتھروں کی دریافت سے جہاں ہیرے، یاقوت اور زمرد وغیرہ کی اہمیت کم ہوگی وہیں محبت کے متوالوں کو نادر و نایاب پیش کش کے مواقع بھی میسر ہو جائیں گے۔ان پتھروں کی دریافت سے بجلی اور بیٹری کی صنعت میں انقلاب برپا ہونے کی پیشگوئی کی جا رہی ہے۔

" سماعت کے دریچے "

ڈرو۔۔۔اس آج سے

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

شجر ملکوں پہ
پنجے مارتے، چڑیا وجودوں پر،
عقابی ملک، استحصالی کے درپے۔۔۔
ہمارے آج کی تصویر بنتے ہیں۔۔۔!

ڈرو۔۔۔اس آج سے،
جس آج میں بھیڑوں کے گلّوں پر
۔۔۔بھیڑیے یلغار کرتے ہیں!

ڈرواس آج سے
جس آج میں ہرنوں کی ڈاروں کو،
کہیں۔۔۔شیروں نے گھیرا ہے۔۔۔!

ڈرواس آج سے
جس آج میں، گنّے کے کھیتوں سے
کساں مغرور،
ہاتھی۔۔۔دندناتے ہیں۔۔۔!

ڈرواِس آج سے، جس آج میں
کمزور ملکوں کی فضاؤں میں
ڈروں اُڑتے ہیں، دہشت کے۔۔۔
کہاں جائے گا کوئی ملک،
اپنا آسمان لے کر۔۔۔؟

ڈرواس آج سے، جس آج میں
اقوام عالم کی مجالس میں
۔۔۔اگر کمزور ملکوں کی۔۔۔
کوئی آواز اٹھتی ہے،
سماعت کے دریچے اور دروازے
نہیں کھُلتے۔۔۔۔!!

یک طرفہ محبتیں

رضیہ اسماعیل
(یوکے)

کہتے ہیں
محبت دوطرفہ عمل ہے
مگر۔۔۔
میری سب محبتیں یک طرفہ تھیں
جنہیں میں نے چاہا
وہ کسی اور در کے اسیر تھے
جنہوں نے مجھے چاہا
وہ میرے دل و ذہن پر
کوئی نقش نہ چھوڑ سکے
مگر۔۔۔
یک طرفہ محبتیں بھی
جواب مانگتی ہیں، حساب مانگتی ہیں
آنسوؤں کا، آہوں کا
خواہشوں کا، حسرتوں کا
بے نور صبحوں اور تاریک راتوں کا
ٹوٹتی انگڑائیوں اور کرچی کرچی خوابوں کا
مگر۔۔۔
جواب کون دے گا!
حساب کون دے گا!
جب کہ کسی نے سوال ہی نہ سنا ہو!

تُو مری نظم ہے جانِ من!

فیصل عظیم

(کینیڈا)

تو مری نظم ہے
خود میں مربوط کم، اپنی دُھن میں رواں
پیچ در پیچ، آزاد اور بے نیاز۔۔۔۔اور مبہم
اندرونی و بیرونی آہنگ، اظہارِ صد رنگ میں
نغمگی انگ میں، تیری آواز اور رنگ میں

یہ اُٹھان
یہ کمان
یہ کماں سے نکلتے ہوئے تیر، سب بر ہدف
تیز، چست
رمز میں اور اظہارِ بے باک میں بھی اشارے لیے
اپنے ہی استعارے لیے
جو کہانی کہے
کہ کے بھی ان کہی، ان سنی ہی رہے
وصلِ معنی کے پہلو میں پہلوئے تشنہ لبی ہی رہے
کچھ کمی ہی رہے
تجھ کو پا کر تجھے اور پانے کی تجدیدِ ابلاغ کے کیف میں بار بار
سطر در سطر پڑھتا چلوں
زلفوں، پیشانی، آنکھوں سے عارض، لبوں سے ترے
پاؤں کی آخری پور تک
مرے لمس سے
لوحِ دل پر تری روشنائی پہ اک حرف آئے نہیں!
سر بسر تو جمی کی جمی ہی رہے
سارے اسرار کھلتے رہیں بند دروازوں پر اور اسرار کے
اور بھی بے پنہ ہوں معانی ترے ایک اقرار اور بیش انکار کے
میں تعاقب میں جن کے رہوں عمر بھر
تو مری نظم ہے جانِ من!

○

نیل کا کنارہ

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی

(قاہرہ)

دیکھتے ہیں مصر والے جب کنارا نیل کا
یاد آجاتا ہے ان کو سارا قصہ نیل کا

چیر کر سینہ ہوئے جو پار موسیٰ نیل کا
کر گیا فرعون کو غرقاب دھارا نیل کا

مصر آؤ دوستو تم کو اگر فرصت ملے
کم سے کم اک بار تو دیکھو نظارہ نیل کا

عمر بھر وہ بھول پاتا ہی نہیں ہے ذائقہ
جو کوئی پیتا ہے میٹھا پانی دریا نیل کا

غور سے دیکھیں تو یہ لگتا ہے اکثر دوستو
آسماں پر پڑ رہا ہے نیلا سایہ نیل کا

عشق، تنہائی، خوشی اور غم کے ان لمحات میں
قاہرہ والوں کو ملتا ہے سہارا نیل کا

اس کی موجیں خون بن کر دوڑتی ہیں جسم میں
ان رگوں میں موجزن ہے قطرہ قطرہ نیل کا

بیٹی ہے تو اے ولا اس غیر فانی نیل کی
تیرا ہر اک شعر ہے گویا کہ نغمہ نیل کا

○

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

سُمیرا سلیم کاجل (اسلام آباد)

خُدا حافِظ ۔۔۔ مِرے ہَم دیس لوگو جا رہا ہُوں مَیں
ہمیشہ پاک دھرتی پر مَیں گونجوں گا صَدا ہُوں مَیں

خُدا حافِظ ۔۔۔کہوٹہ کے پہاڑو اَب خُدا حافِظ
نظر مَیں اَب نہ آؤں گا مگر تُم سے جُدا ہُوں مَیں

خُدا حافِظ ۔۔۔ مِری اے تجربہ گاہو خُدا حافِظ
تُمھیں روشن رَکھا مَیں نے حقیقت مِیں دِیا ہُوں مَیں

خُدا حافِظ ۔۔۔ اے میرے ساتھیو جیتے رہو دائم
تُمھارے دَرمیاں رہ کر سَدا خُوش ہی رہا ہُوں مَیں

خُدا حافِظ ۔۔۔اے میرے دُشمنو اَب یاد آؤں گا
وَفا داری نہ کی تُم نے مگر پھر بھی وَفا ہُوں مَیں

خُدا حافِظ ۔۔۔اے میرے دیس کے غُربت زَدہ لوگو!
کَفَن مِیں بھی تُمھارے واسطے محوِ دُعا ہُوں مَیں

خُدا حافِظ ... وَطَن کے اے وزِیرو، اے مُشیرو اَب
تُمھارا کیا تھا ماضی، حال کیا ہے جانتا ہُوں مَیں

خُدا حافِظ ... وَطَن کے اے چراغو، تُم نہ گھبرانا
بَچایا تُم کو آندھی سے ہَواؤں سے لَڑا ہُوں مَیں

خُدا حافِظ ... قلَم کارو، اے فَن کارو، اَدا کارو
جو مَنزِل سے مِلا جا کر وُہی اِک راستہ ہُوں مَیں

خُدا حافِظ ۔۔۔ وَطَن کی فوج کے ہر اِک سپاہی کو
عدُو سے ڈَٹ کے لَڑنا تُم تُمھارا وَلوَلہ ہُوں مَیں

خُدا حافِظ ۔۔۔ سُمیرا کامیابی ہی سمیٹو تُم
وَفادارِ وَطَن رِہنا یہ تُم سے کہہ رہا ہُوں مَیں

○

جاوید نسیم

جمیل عثمان (یو ایس اے)

خبر آئی ہے کہ عم زاد میرا چل بسا ہے
وہ میرا بھائی، میرا دوست
اب اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے

ہمارے درمیاں کتنے سمندر، کتنے دریا، کتنے صحرا تھے
مگر پھر بھی ہمارے درمیاں دوری نہ تھی اتنی
ہم اکثر فون پر گزرے دنوں کو یاد کرتے تھے

وہ عبداللہ کے باغوں سے جامن توڑنا چھپ کے
وہ جن بی کی مرغی کو چرا کر ذبح کر دینا
بکا کر دوستوں کی دعوتیں کرنا
پتنگیں لوٹنا گلیوں میں، تالابوں میں پیرا کی
تماشا ریچھ کا اور بس میں کنڈکٹر سے چالاکی

وہ کیا دن تھے کہ ہم ہر فکر سے آزاد رہتے تھے
"یہ غم کیا چیز ہے؟" ہم پوچھتے تھے کچھ بزرگوں سے
مگر کوئی جواب ان کا سمجھ میں ہی نہیں آتا
پھر اپنی بے خودی کے راستوں پر لوٹ جاتے ہم
کہ جیسے زندگی یونہی ہمیشہ پرسکوں ہوگی

کسے معلوم تھا ہم یوں جدا ہو جائیں گے اک دن
ہوئے اک گھر سے دو گھر، پھر محلے دو
بٹے دو شہروں میں، پھر ملک بھی دو ہو گئے آخر
اسی پر بس نہیں، یہ فاصلے بڑھتے گئے اتنے
کہ ہم تقسیم ہو کر رہ گئے دو براعظم میں

تو کیا یہ بعد_ مشرق اور مغرب بھی نہ تھا کافی؟
جو اس دنیا کو چھوڑا اور چلا وہ دوسری دنیا؟
وہ کیا دن تھے کہ جب ہم ایک گھر میں ساتھ رہتے تھے
اور اب ہماری دنیائیں بھی مشترکہ نہیں ہیں

دماغ

ڈاکٹر رؤف خیر
(حیدرآباد،دکن)

مجھ کو ملا ہے دل تو ملا آپ کو دماغ
اب سوچنا ہے ایک ہوں کیسے دل و دماغ

اس کھیل میں تو مشرق و مغرب کا ہاتھ ہے
اِن سازشوں کے پیچھے نہیں ایک دو دماغ

بم باریاں دلوں پہ وہ کرتے ہیں رات دن
ممکن نہیں یہ دیکھ کے چھلنی نہ ہو دماغ

دنیا کھڑی ہے اپنی تباہی کے موڑ پر
ایسے میں عرش پر تو نہ رکھا کرو دماغ

خوش فہمیوں میں کچھ ہیں غلط فہمیوں میں کچھ
کرکے دکھاؤ ٹھیک اگر کر سکو دماغ

چاروں طرف ہے ایک قیامت مچی ہوئی
حیران ہیں یہ ذہن و دل و دیدہ و دماغ

ہمدرد ہیں وہ خیرؔ ، یہ دل مانتا نہیں
بہروں کے سامنے ہے کھڑا گومگو دماغ

○

سفر خدشات کا

سلیم انصاری
(جبل پور)

سفر زندگی کی علامت ہے لیکن
مجھے خوف آتا ہے
گھر چھوڑنے سے
مسافت سے وحشت سی ہوتی ہے مجھ کو سے
مجھے وہم سا ہو گیا ہے
کہ میں جب بھی نکلوں گا گھر سے
کوئی میری بیوی کے چہرے سے تابندگی چھین لے گا
کوئی میرے معصوم بچّوں کی
کلکاریاں اور ہنسی چھین لے گا
کوئی خواب آنکھوں سے
لفظوں سے مفہوم
اور میری سوچوں سے خود آگہی چھین لے گا
یہ خدشات پیروں کو جکڑے ہوئے ہیں
کہ میں گھر کی دہلیز بھی آج تک لانگھ پایا نہیں ہوں
اگرچہ مجھے علم ہے کہ
سفر زندگی کی علامت ہے لیکن
مجھے خوف آتا ہے گھر چھوڑنے سے
مسافت سے وحشت سی ہوتی ہے مجھ کو

○

ریگ زارِ ہستی

فرح کامران
(نیویارک)

ندیم روٹھا ہے
زیست کے دریچے میں
اشک غم میں پیوستہ
زخم زخم یادوں کو
سینے سے لگائے میں
اب بھی بیٹھی رہتی ہوں
اس کی راہ تکتی ہوں
جس کے سائے میں ہردم
پیچھے پیچھے چلتی تھی
جس کے لمس کا جادو
وادیٔ محبت میں
ایسے گل کھلاتا تھا
جن کی خوشبوؤں سے میں
دیر تک مہکتی تھی
ہاں یہ جانتی ہوں میں
منتظر ہوں میں جس کی
اس کی راہ تکنے میں
چاہے شام ڈھل جائے
اور رات ہو جائے
رات کے اندھیرے میں
عمر میری ڈھل جائے
گلشن محبت میں
پھول اب نہیں کھلنا
آنسوؤں کی بارش میں
جتنی بھیگ جاوں میں
ریگ زار ہستی کو
تشنہ لب ہی رہنا ہے
جاں بلب ہی رہنا ہے
اس دیار وحشت میں
جس کا ہاتھ چھوٹا ہے
اس نے ساتھ میرے اب
پھر کبھی نہیں چلنا
جو ندیم روٹھا ہے
لوٹ کر نہ آئے گا!!!

کچھ ہائیکو

انجم جاوید
(کراچی)

پتے لہرائے
اوس کے قطروں نے چوما
پھول بھی شرمائے

گھر میں آئی بہار
کھیتوں میں جو کی خوشبو
چڑیوں کی چہکار

خوشبو مہکی ہے
دیکھا تیرے چہرے کو
تتلی مچلی ہے

بارش سردی کی
اندازہ کرنے میں یار
تم نے جلدی کی

ملنے آئی ہے
گوری میرے گاؤں کی
چوری لائی ہے

''جدیدیت کے علمبردار''

ڈاکٹر صالحہ صدیقی

(الہٰ آباد)

''**جدیدیت** کے علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی ''اجے مالوی کی تازہ تصنیف ہے، جو جئے بھارتی پرکاشن، مُٹّھی گنج، مایا پریس روڈ، الہ آباد سے شائع ہوئی ہے۔جیسا کہ نام سے ہی واضح ہو جاتا ہے یہ کتاب فارقی صاحب کی شخصیت اوران کے فن پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے جومختلف اہل نظر کے ذریعہ لکھے گئے ہیں۔اس کتاب کواجے مالوی نے بڑی محنت وکاوش سے مرتب کیا ہے ،اسکے پہلے حصہ میں فاروقی صاحب کے انٹرویوں دوسرے حصہ میں فاروقی صاحب کی قلم سے نکلے تحقیقی وتنقیدی مضامین اور پھر تیسرے حصے میں فاروقی صاحب کی شخصیت اورفن پر لکھے گئے ہندستان و بیرون مما لک کے اہم علم وفن کے مضامین کو بڑی خوبصورتی سے مرتب کیا گیا ہے،اس کتاب میں شامل ہرانٹر ویوں اورمضامین انتہائی اہم ہے،مناظر عاشق ہرگانوی جوخود بھی اس دنیا کوکرونا میں الوداع کہہ گئے ان کا انٹرویوں بھی اس کتاب میں شامل ہے جس کی اہمیت یقیناً تاریخی ہے،اس انٹرویوں کی ابتدا میں وہ کہتے ہیں:

''شمس الرحمٰن فاروقی ایک ایسے قلم کار تھے جن پر ذہن کا غلبہ تھا۔یہ ان کی کوئی کمزوری نہیں تھی بلکہ ان کی شخصیت اور وجود کی نوعیت ہے۔وہ بہت بڑے ادیب، عظیم نقاد، نامور شاعر اور ایک اچھے انسان تھے۔(ایسے آدمی کم ہوتے ہیں جنہیں انسان ہونا میسر ہو) انہوں نے تنقید لکھی تو دھوم مچادی۔تبصرہ پر آئے تو نئ راہیں نکالیں اوراس فن کوخوب برتا،ترجمے کیے توان پر تخلیق کا دھوکہ ہوااورشاعری کی طرف متوجہ ہوئے تو جدیداحساس کی تین واضح صورتوں کو پیش کیا۔یہ تینوں صورتیں تجرباتی اور تجزیاتی بنیاد ہیں۔انسان اور کائنات، انسان اور معاشرہ اور ذات اور حقیقت زماں کے تعلق سے وہ ایک اکائی تک پہنچتے ہیں اوران کی نظر جدید سے جدید تر کی طرف سفر کرتی ہے۔غضب کے صحافی تھے۔ایڈمنسٹریٹو سروس کے اونچے عہدے پر فائز رہے اور بے حد مصروف انسان تھے۔لیکن میرے کرم فرما بھی رہے۔ مجھ سے خاص انسیت اوراپنائیت رکھتے تھے۔میں نے انٹرویو کی پیش کش رکھی تو فوراً راضی ہو گئے۔مگر اس شرط پر کہ باتیں جم کر ہوں اور سامنے ٹیپ ریکارڈر کھ کر ہوں۔''

اسی طرح انتظار حسین (پاکستان) نے فاروقی صاحب سے متعلق اپنی یادیں شیئر کیں جواس کتاب میں شامل ہے وہ لکھتے ہیں:

''بھائی شمس الرحمٰن فاروقی، اب آپ پوچھیں گے کہ بارے دو دن کہاں رہا غائب؟ ناول پڑھا؟ نہیں پڑھا؟ پڑھ لیا تو اس کی رسید کیوں نہیں دی؟ سواب دے رہا ہوں۔یہ بھی سن لیجئے کہ کیسے پڑھا اور میرے پڑھنے نے کیا گل کھلائے۔انھیں دنوں کراچی جانا نکل آیا اوراپنے یار عزیز سعید محمود کے یہاں میں نے پڑاؤ کیا۔وہاں ناول دربغل پہنچا کہ وہ عزیز جب دفتر چلا جائے گا تو میں فارغ وقت میں یہ ناول پڑھوں گا۔اس نے مجھے خضوع وخشوع سے ناول پڑھتے دیکھا تو اسے کرید ہوئی۔میں نے بتایا کہ یہ کس رنگ کا ناول ہے۔اس نے کہا کہ پھر تو میں بھی پڑھوں گا۔آصف فرخی سے ایک کاپی لے کر میں اسے دے آیا۔اب اس کا جو ردعمل آیا ہے اس پر میں حیران بھی ہوں اور خوش بھی ہوں۔میں ہی نہیں، عسکری صاحب نے بھی اسے بہت اکسایا تھا کہ ناول لکھو۔مگر اس نے کم عمری میں مغرب کے کچھ جنات کو پڑھ لیا تھا اور ایسا مرعوب ہوا کہ لکھتے لکھتے قلم رکھ دیا۔اب اس نے مجھے لکھا ہے کہ اس ناول پر تو میں نے ایک مضمون لکھ ڈالا ہے۔وہ مضمون میرے پاس آجائے،خود پڑھوں گا، آپ کو پڑھواؤں گا، پھر آصف کے حوالے کردوں گا۔بھائی میں نے آپ کا لوہا مان لیا۔اگر اس سے پہلے کوئی عزیز مجھے بتاتا کہ فلاں صاحب نے بہت علمی مطالعہ اور تحقیق کے بعد ایک ناول لکھا ہے۔لکھا ہوگا۔اگر وہ قرآن کا جامہ پہن کر بھی آتا اور مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتا تو میں قائل نہ ہوتا۔سو میں نے ایک شک کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا۔مگر رفتہ رفتہ جادو چڑھنا شروع ہوا اور ایسا چڑھا کہ میرے سارے شک رفو چکر ہو گئے۔کالم تو میں نے فوراً ہی سپرد قلم کردیا۔مگر ایسے کام کے ساتھ کالموں کے ذریعہ انصاف نہیں ہوتا۔اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے آپ کے زمانے کے نقاد اسے کیسے جانچتے پرکھتے ہیں۔۔۔اور ہاں، اس ناول کو پڑھنے کا ایک اثر یہ ہوا کہ میں داغ سے مرعوب ہوگیا۔اب جی چاہتا ہے کہ اس شاعر کو سنجیدگی سے پڑھا جائے۔''

جدیدیت کے علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی عالمگیر شہرت یافتہ ہندوستانی شاعر،ادیب، محقق،نقاد،مترجم،لغت نویس اور دیگر تخلیقی ذہنیت کے مالک ہمہ جہت ہمہ صفت تخلیق کار تھے۔جن کی تحریروں میں برصغیر ہندو پاک کی تہذیبی روایات کی بازیافت دیکھی جاسکتی ہے۔انھوں نے خود شعر وادب کے تفہیمی منازل کا سفر طے کیا پھر اپنے قارئین کو اس عمل میں شامل کیا۔وقت کے ساتھ ان کے اظہار کی نوعتیں بدلتی رہے اور خیال کی پرواز اور بلند ہوتی رہی۔شمس الرحمٰن فاروقی کی ادبی فتوحات کا سلسلہ بہت طویل رہا ہے اور اس طویل سلسلہ میں کہیں ایک شاعر بھی موجود رہا ہے ۔جس پر کم کم ہی گفتگو کی جاتی ہے۔تنقید اور فکشن کے علی الرغم فاروقی صاحب کی شاعری کے تعلق سے منفی تاثرات کثرت سے دیکھے سنے جاسکتے ہیں۔کلیات (مجلس آفاق) میں فارقی صاحب کے چار مجموعہ ہائے کلام گنج سوختہ،سبز اندر سبز ،چار سمت کا دریا اور آسمان محراب کے ساتھ ان کے غیر مطبوعہ کلمات بھی شامل ہے۔ان کی کلیات میں کلام کی ترتیب اصناف کے اعتبار سے ہے جن میں غزلیں ،نظمیں،تراجم،بچوں کی نظمیں،قطعات اور رباعیات سبھی کچھ شامل ہیں۔

اس وقت پوری دنیا کرونا وائرس کے قہر میں مبتلا ہے،ایسے میں سوشل میڈیا،نیوز،چینلس اور اخبارات کی سرخیاں اسی وائرس سے متعلق خبروں سے بھری پڑی ہیں۔کرونا نے جس طرح پوری دنیا کو اپنی چپیٹ میں لے لیا اور زندگی کی

تصویر بدل ڈالی اس سے ادیب وشعرا کا حساس دل بھی لکھنے سے خود کو روک نہ سکا۔ کرونا نے اردو ادب پر گہرے نقوش مرتب کیے، بقول شخصے ''ادب تنقید حیات'' ہے اس تعریف کو مشرق ومغرب میں ادب کی مقبول ومعقول تعریف کہا جائے تو ہم شعر وادب میں تاریخی سانحات کا عکس بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کرونا کی صورت حال نے جس طرح پوری دنیا کو خوف و ہراس کی سیاہ بندگلی کی طرف دھکیل دیا ہے شاعروں نے اپنے کلام سے اس میں روشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ایسا عالمی سانحہ ہے جسے ادب وصحافت نے اپنے مزاج سے دیکھا اور اپنے منظر ناموں کا حصہ بنایا۔ خصوصا سوشل میڈیا نے اس میں اہم رول ادا کیا۔ سوشل میڈیا پر کرونا نے وبائے عام کو ادب کے تخلیقی رویے کے طور پر دیکھنے کا رجحان پیدا کیا۔ غرضیکہ اس وبائی منظر نامے میں ہندستان اور دیگر ممالک کے اعلیٰ وارفع ادیبوں وشاعروں نے بہترین نگارشات کاغذ پر بکھیرا۔ الیٹرانک میڈیا کے ساتھ پرنٹ میڈیا، سوشل میڈیا ہر جگہ اس کو موضوع سخن بنایا گیا۔ ان حالات نے زندگی کے ہر گوشے کو متاثر کیا۔ بے شمار کام رک گئے۔ لیکن اس وقت سے لڑتے ہوئے باہمت لوگ آگے بھی بڑھے۔ اور ادب کی خدمت کرتے رہے، اس وقت میں بھی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں زیر نظر کتاب ''جدیدیت کے علمبردار شمس الرحمٰن فاروقی'' جسے اجے مالوی نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ہے یہ بھی شامل ہیں۔

اس وباء میں بے شمار عظیم الشان شخصیات کو ہم نے کھو دیا۔ ان میں اہم ناموں میں شامل ہیں عزیز الحق عمری، عبدالمنان سلفی، مولانا سلمان مظاہری، مولانا احمد سعید پالن پوری، مولانا متین الحق اسامہ قاسمی، مولانا سید ولی اللہ قاسمی، قاضی اعظم علی صوفی، مولانا سید کاظم پاشا قادری موسوی، مولانا محمد حسین ابوالحقانی، مولانا محمد نصیر الدین، قاضی محمد سمیع الدین، ڈاکٹر احمد اللہ بختیاری، مولانا کلب صادق اور سید افضل قادری۔ رؤف خلش شاعر (حیدرآباد)، عبید صدیقی ادیب، براڈ کاسٹر (دہلی) فاطمہ تاج افسانہ نگار (حیدرآباد)، پروفیسر صاحب علی درس و تدریس (ممبئی)، اجمل سلطان پوری شاعر (سلطان پور)، ولی بستوی شاعر، عالم دین (سہارنپور)، وکیل احمد طاہر قادرآبادی شاعر، معلم (اترپردیش)، ڈاکٹر لقمان سلفی مفسر، عالم دین (بہار/ سعودی عرب)، عبدالاحد ساز شاعر (ممبئی)، شاہد بگھونوی شاعر (سمستی پور)، محمد ضمیر الدین نظامی خوش نویس، خطاط (حیدرآباد)، اسرار جامعی مزاحیہ شاعر (دہلی)، انل ٹھکر ادیب، ڈراما نگار (کرناٹک)، اعجاز قریشی صحافی (حیدرآباد)، تسنیم انصاری برہان پوری شاعر (برہان پور) فاطمہ عالم علی، نثر نگار (حیدرآباد)، رشید انصاری صحافی (حیدرآباد) احمد عثمانی ادیب، صحافی مالیگاؤں) ہارون بی۔اے ادیب، صحافی (مالیگاؤں) مجتبیٰ حسین مزاح نگار (حیدرآباد) گلزار دہلوی شاعر (دہلی)، اختر جمال شاعر (بھیونڈی)، کبیر اجمل شاعر (بنارس) ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی، اسلامی اسکالر، محقق اعظم گڑھ/سعودی عرب، راحت اندوری شاعر (اندور) پروفیسر سید فضل امام رضوی (ادیب، ناقد لکھنؤ) نشتر امروہوی (شاعر امروہہ) مظفر حنفی شاعر، ادیب (دہلی) شکیل انوار صدیقی (ادب اطفال مراداآباد) مختار شمیم، ادیب، محقق، ناقد، مدھیہ پردیش، ڈاکٹر حنیف ترین، شاعر، ادیب (سری نگر)، رہبر جونپوری (شاعر لکھنؤ) شمس الرحمٰن فاروقی شاعر، ادیب، ناقد الہ آباد، مناظر عاشق ہرگانوی، مشرف عالم ذوقی تبسم فاطمہ، شوکت حیات، ترنم ریاض، رضا حیدر، شمیم حنفی، غلام مرتضیٰ راہی وغیرہ وغیرہ بے شمار اہم شخصیات ہم سے جدا ہوگئیں۔

اجے مالوی کی یہ کتاب فاروقی صاحب کو خراج تحسین دینے کی ایک اہم کوشش ہے۔ اجے مالوی کی اس سے قبل کئی اہم کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جس کے حوالے سے وہ اس کتاب میں لکھتے ہیں:

''میں نے اُردو کی وسیع تر عوامی تاریخ کو ویدک ادب کے پس منظر میں تلاش کیا ہے اور وہاں سے اُردو اور امن (بمعنی ماورائے دماغ، شانتی، ایمان اور اسلام کے معنوں میں) ویدک رچاؤں (آیتوں) کے حوالوں کی الوہی اور قدسی روشنی میں پیش کیا ہے اور آج بھی اُردو اور امن انھیں مبارک معنوں میں پوری دُنیا کے اُردو ادب میں مستعمل ہے۔

میری کتاب ''ویدک ادب اور اُردو'' ریختہ کی سائٹ پر موجود ہے۔ براہ کرم اُس کا دلجمعی اور دلسوزی سے مطالعہ کریں۔ فاروقی کا استعمال شدہ جملہ ''جدید ہندوستان میں (ہندوستانی = ہندو) تشخص کا'' مساوات انتہائی گمراہ کن فرقہ پرستانہ رجحان کا ترجمان ہے۔ ذرا آپ غور فرمائیں ''ہندوستانی'' کا تصوّر مہاتما گاندھی، پنڈت سندر لال اور وشمبھر ناتھ پانڈے کا انتہائی غیر متعصّبانہ انسانی تصوّر رہے۔ اُس کا بھارتیہ جنتا پارٹی یا جن سنگھ کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ غالباً فاروقی کی نظر سے پنڈت سندر لال کا تاریخ ساز جریدہ ''ہندوستانی'' نہیں گزرا ہے۔ جو نہایت ذہنی دیانت داری اور قلبی کشادہ دلی کے ساتھ بیک وقت اُردو رسم الخط اور ہندی رسم الخط میں شائع ہوتا تھا۔ اُردو اور ہندی میں یکساں عبارت ہی پیش کی جاتی تھیں۔ اُردو والے اُردو میں پڑھتے تھے اور ہندی والے ہندی میں یکساں عبارت سے لطف اندوز ہوتے تھے اور آہستہ آہستہ دونوں زبانوں سے آشنا ہو جاتے تھے۔ فاروقی صاحب یہ شرانگیز اور فرقہ پرست مساوات نہایت شعوری طور پر قائم کر رہے ہیں اور اُس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر نہایت ہی فرقہ وارانہ انداز میں ہندی اور اُردو کے اتحاد کو شدید ضرب پہنچا رہے ہیں کہ ہندی والے اُردو کو ہندی کی شیلی کہتے ہیں لہذا اُردو والوں کو اعلانیہ طور پر ہندی کو اُردو کی شیلی کہنا چاہئے۔ فاروقی جیسے ناقد کا یہ اپنا رمل مجاہدانہ اور مفسدانہ زاویہ نگاہ اور پروپیگنڈائی عمل ''اُردو کیمپس'' کی پروردہ نئی نسل پر کتنے مذموم اثرات مرتب کرے گا۔ میری کتاب ''ویدک ادب اور اُردو'' سے تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اُردو خالص ہندوستانی شناخت کا ستارۂ امتیاز ہے۔ البتہ فاروقی تاریخ کی فرقہ پرور تعبیر کی از سرِ نو تدوین کو غیر ذمہ دارانہ مرحلہ تحقیق کو سر کرنے کے خبط میں مبتلا ہیں۔''

اس کتاب میں جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہند وپاک وبیرون ممالک کے کئی اہم قلم کاروں کے مضامین شامل ہیں جن پر انفرادی گفتگو کرنا یقیناً ممکن نہیں لیکن تفہیم فاروقی صاحب پر لکھے گئے کچھ اہم مضامین جس میں شیخ عقیل احمد (ڈائرکٹر،

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) کا مضمون انتہائی اہم ہے وہ لکھتے ہیں:

''شمس الرحمٰن فاروقی ان شخصیات میں سے ہیں جن کی تنقیدی تحریروں سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا ہے۔ تنقید کے بہت سے اہم مباحث کی تفہیم کا ذریعہ ان کی تنقیدی تحریریں رہی ہیں۔ اگر میں یہ کتابیں نہ پڑھتا تو شاید تنقید کی مبادیات سے صحیح طور پر واقف نہ ہو پاتا۔ اس حقیقت کے اعتراف میں مجھے بخل سے کام نہیں لینا چاہیے کہ فاروقی اور ان کے معاصرین کی تحریریں میرے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہی ہیں۔ اردو تنقید سے میری خاص دلچسپی رہی ہے اور میں نے اس تعلق سے کئی مضامین بھی لکھے ہیں۔ میں نے مختلف دبستانوں سے وابستہ ناقدین کو بالاستیعاب پڑھنے کے بعد یہ محسوس کیا ہے کہ معاصر تنقیدی منظرنامہ میں فاروقی جیسی شخصیت کی موجودگی اردو ادب کے لیے باعث فخر و ناز ہے کیونکہ فاروقی نے اردو کو جن نظریات اور افکار سے روشناس کرایا شاید یہ دوسروں کے لیے اتنا آسان نہیں ہوتا۔ انھوں نے جو نئے تنقیدی مباحث اور مسائل اپنی تصنیفات میں پیش کیے ہیں وہ بالکل نئے زاویے کی جستجو ہیں اور ظاہر ہے کہ نئی جہتوں کی جستجو ایک متجسس ذہن ہی کر سکتا ہے۔ فاروقی کے ذہنی تجسس نے ہی وہ سارے مباحث تلاش کیے جو ان سے پہلے تنقید میں عام نہیں تھے اور اس کی وجہ شاید یہ رہی کہ فاروقی صرف اردو نہیں بلکہ انگریزی اور دیگر عالمی ادبیات سے اچھی طرح واقف تھے۔۔۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا ادبی کارنامہ اتنا وسیع ہے کہ سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے۔ وہ اردو تنقید کے ایک بحر بیکراں تھے۔ اتنے وسیع تر کینوس میں ان کا کام پھیلا ہوا ہے کہ نظر پڑتی ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک غیر ادبی شعبے سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے کیسے اتنا بڑا کام انجام دیا۔ ایسی مثالیں ہماری ادبی تاریخ میں کم ملتی ہیں۔ فاروقی اردو ادب کی ایک عدیم المثال شخصیت ہیں جن کے کارناموں کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا اور ان کی تحریریں ہمیشہ ہمارے ذہنوں میں زندہ رہیں گی۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے انتقال سے اردو تنقید کے ایک اہم باب کا خاتمہ ہوا، یقیناً اردو کے لیے یہ ناقابل تلافی خسارہ ہے۔''

اسی طرح اس کتاب میں حقانی القاسمی (ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ) نے فاروقی صاحب پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا وہ لکھتے ہیں:

''فاروقی صاحب کو تنقیدی شعریات، زبان اور اسلوبیات پر دسترس حاصل تھی، اسی لیے انھوں نے یہ بات لکھی ہوگی۔ بین السطور سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انھیں میرا طرزِ تحریر پسند تھا۔ یہ ان کی بزرگانہ شفقت تھی کہ انھوں نے میری ٹوٹی پھوٹی تنقیدی تحریروں کے تعلق سے اظہارِ خیال کیا تھا ورنہ ان کے پاس ہزاروں کتابیں آتی تھیں جو ان کی قیمتی رائے کی منتظر رہتی تھیں مگر وہ شاید اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے کم ہی کتابوں پر رائے دے پاتے تھے۔ یہ میرے لیے باعث فخر و ناز ہے کہ فاروقی صاحب نے میری تحریروں کو قابل اعتنا سمجھا اور چند سطریں تحریر کر دیں۔ خواجہ جاوید اختر مرحوم بھی مجھے بتایا کرتے تھے کہ فاروقی صاحب تمھارا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی میرے لیے فخر کی بات تھی۔ ان سے میری ملاقاتیں کم رہیں مگر ان کی تحریروں سے ملاقات کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا۔ وہ محبت میں مجھے اپنا خبرنامہ شب خون بھی بھیجا کرتے تھے اور میں اسے بہت ہی انہماک کے ساتھ پڑھا کرتا تھا کیونکہ خبرنامے میں بھی بہت کچھ وہ ہوتا تھا جو بہت سے مقتدر رسائل و جرائد میں نہیں ہوتا تھا۔

فاروقی صاحب کی تمام تصنیفات (لفظ و معنی، فاروقی کے تبصرے، شعر، غیر شعر اور نثر، افسانے کی حمایت میں، تنقیدی افکار، اثبات و نفی، تفہیم غالب، شعر شور انگیز، انداز گفتگو کیا ہے؟، اردو غزل کے اہم موڑ، داستان امیر حمزہ، اردو کا ابتدائی زمانہ، ساحری شاہی صاحبقرانی، غالب کے چند پہلو، اکبر الہ آبادی: نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار، خورشید کا سامان سفر، جدیدیت: کل اور آج، صورت و معنی سخن، معرفت شعر نو، ہمارے لیے منٹو صاحب، عجب سحر بیاں تھا، عروض آہنگ اور بیان، لغات روزمرہ، گنج سوختہ، سبز اندر سبز، چار سمت کا دریا، آسمان محراب، مجلس آفاق میں پروانہ ساں، شعریات، نئے نام، درس بلاغت، تحفۃ السرور) وغیرہ وغیرہ تو میں نے مکمل نہیں پڑھی ہیں لیکن جو کچھ بھی پڑھا ہے اس سے مجھے ایک نئی روشنی ملی ہے۔ میری آگہی میں اضافہ ہوا ہے اور اسی لیے میں ان کا بہت احترام کرتا ہوں۔ ان کے خیالات سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر انھیں مسترد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ نہایت منطقی استدلال اور معروضیت کے ساتھ اپنے تنقیدی افکار و نظریات پیش کرتے تھے۔''

بہر حال اس کتاب میں بے شمار ایسے گوشے بیان کیے گئے ہیں جو فاروقی صاحب کے فکر و فن کی تفہیم میں ایک نیا اضافہ ہے۔ وباء کے مشکل ترین دور میں مضامین جمع کرنا لکھوانا یقیناً ایک مشکل عمل رہا، جس سے اجے مالوی گزرے اور انھوں نے ایک اہم تاریخی کام انجام دیا، اس کتاب میں فاروقی صاحب کی حیات و شخصیت ان کے فکر و فن پر مشتمل مضامین میں فاروقی صاحب کو الگ الگ زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہیں، امید ہے اس کتاب کا ادبی حلقوں میں خیر مقدم کیا جائے گا اور اجے مالوی کی اس نئی کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ستم ظریف

●●●

گزر تو خیر گئی ہے تیری حیات قدیرؔ
ستم ظریف مگر کوفیوں میں گزری ہے

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

۱۳۔اپریل ۲۰۱۲ء

●

''پاپی''

فیصل عظیم
(کینیڈا)

یوں تو یہ دنیا تخلیق کار جوڑوں ہی کی مشترکہ کاوش سے آباد ہے مگر بات لفظی افزائشِ نسل کی ہو تو ایسے جوڑوں کی مثال ایسی عام بھی نہیں۔ اور پھر مشترکہ ناول تو ایسی غیر عام کاوشوں میں مزید اقلیت کی حیثیت رکھتا ہے، جیسے ڈاکٹر خالد سہیل اور مرزا یاسین بیگ صاحبان کی یہ ''پاپی'' تخلیق۔ بلکہ اس ناول ''پاپی'' کی تو ہیئت بھی عام نہیں۔ شاید اسی لیے حفظِ ماتقدّم کے طور پہ انھوں نے سرورق پر، اس کے نام کے نیچے (ولدیت سے اوپر) ''خط کہانیاں۔۔۔آج کی سچّائیاں'' لکھ دیا ہے تاکہ شک کرنے والے سماج میں اس پر ''انگلیاں اٹھنے کے''، ''لوگ کیا کہیں گے'' اور ''یہ دونوں میں سے کس کا پاپ ہے'' وغیرہ کے امکانات کم سے کم ہوں۔

ڈاکٹر خالد سہیل کی روایت شکنی سے ان کے سبھی چاہنے والے واقف ہیں مگر مَیں ان چاہنے والوں میں مرزا یاسین بیگ صاحب کا نام یوں شامل نہیں کر رہا کہ اس کتاب یعنی ''پاپی'' کی حد تک، یہ چاہت یک طرفہ نہیں دو طرفہ ہے، واقفیت، محبت اور تخلیقی عمل، تینوں لحاظ سے۔ ''پاپی'' ایسا ناول ہے جو خطوط بلکہ محبّت ناموں کی شکل میں دو ناول نگاروں نے مل کر لکھا ہے۔ یہ غیر روایتی ہیئت سہی مگر بالکل ناشنیدہ نہیں۔ ایسے تجربے بہادر لوگ کرتے ہیں اور یہ ایک کامیاب تجربہ ہے۔ جب میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو ابتدا میں اس کے ناول ہونے سے انکار کی خواہش ہوئی مگر کہانی آگے بڑھی تو خیال آیا کہ اگر مارکیز کا ''کرونیکل آف آ ڈیتھ فورٹولڈ'' ناول ہوسکتا ہے تو یہ خط کہانی کیوں نہیں۔ اس کے بعد یہ ناول پڑھنے میں زیادہ لطف آیا جس میں ایک مرد عرفان قمر اور ایک عورت رضوانہ صدیقی کے درمیان خطوط کے تبادلے میں پوری کہانی بُنی گئی ہے۔ مرد کے خطوط ڈاکٹر خالد سہیل نے اور عورت کے خطوط مرزا یاسین بیگ نے لکھے ہیں۔

پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب مرزا یاسین بیگ صاحب کی فکری اولاد ہے۔ چونکہ اس میں عورت کا کردار یاسین بیگ صاحب نے ادا کیا ہے، ہم کہ سکتے ہیں کہ یہ ماں کی خواہش تھی۔ یعنی ناول کی کہانی کے برعکس، بنیادی خواہش مند یہاں رضوانہ صدّیقی (مرزا صاحب) تھی جس کی آرزو کی تکمیل عرفان قمر (ڈاکٹر صاحب) کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ باقاعدہ تخلیقی صنف کے طور پہ خط نویسی اور اس کو کتابی شکل دینا ڈاکٹر خالد سہیل کی خاص پہچان ہے، سو اس فکری بچّے کی جسمانی ساخت کے لیے جینز اسے شاید ڈاکٹر صاحب کی طرف سے ہی ملی ہو۔ خلاصہ یہ کہ ہم کہ سکتے ہیں کہ یہ زبردستی کی شادی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی اور بلاشبہ یہ انھیں دو حضرات کا حصّہ ہے۔

اس سیدھی سی کہانی میں دراصل کئی کہانیاں ہیں۔ عورت کی کہانی جو کئی عورتوں کے حوالے سے بیان ہوئی ہے۔ اس کی نفسیات کے کئی پہلوؤں کو خوردبین سے دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔ مشرقی عورت، مغربی عورت اور مغرب میں بسنے یا نہ بس سکنے والی مشرقی عورت کے متحارب رویّے ہیں۔ رومان کی مختلف شکلیں اور ان کے مختلف معانی سے بحث ہے۔ عورت اور مرد کے لیے رومان کے معانی میں فرق اور ان کے تصوّرات کا بُعد ہے۔ بندشیں، رکاوٹیں، سماجی جبر، فطری جبر اور نسائی فطرت کے مختلف پہلو ہیں۔ مرد کی ہر جائیت یا اس کے بارے میں عام خیال کا رد اور تحلیلِ نفسی ہے۔ شہرِ آشوب، آگ اور خون کی ہولی کے دور کا خاکہ ہے۔ انسان کی اندرونی اور بیرونی کشمکش اور ازلی تلاش کی سمتیں اور بے سمتی ہے۔ ہجر، ہجرت اور نقل مکانی کی مختلف شکلیں اور ان مہاجروں کے مسائل، مشکلات، اچھائیاں اور برائیاں، وہ سب جو ہمارے اطراف روز ہو رہا ہے، اسے خوب خوب سمیٹا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک کامیاب تصنیف ہے جو بہت سی زندگیوں، مزاجوں، ذہنیتوں، خاندانوں اور ان کی جدّ وجہد کے ساتھ کامیابیوں اور ناکامیوں کا نقشہ بہت کامیابی سے کھینچتی ہے۔

اس خط کہانی کا مرکزی خیال ''آج کی سچائیاں'' اگر سرورق پہ نہ بھی لکھا ہو تو بھی صاف ظاہر ہے کہ اس کا سب سے بڑا محرّک یہی ہے۔ یعنی ''اپنے سچ'' کو صاف لفظوں میں لکھ ڈالنے اور اس کے ذریعے حالات، نظریات اور سیاسی و معاشرتی الجھنوں اور المیوں کو بیان کرنے کی خواہش۔ خطوط میں حالات اور فلسفے کا ذکر کرتے ہوئے بہت کچھ خاصی تفصیل سے لکھا گیا ہے، وہ بھی جس کا فکشن میں بین السطور رہنا بہتر شاید ہوتا ہے، مصلحت کے لیے نہیں، لطافت کے لیے۔ اس کہانی کا کینوس تین جہتی ہے۔ ایک، سیاسی گھٹن اور مشاہدات کو احاطۂ تحریر میں لانا اور کسی حد تک اپنے سیاسی نظریے کا ابلاغ۔ دو، یہ باور کرانا کہ خدا نہیں ہے۔ اور تین، ہیومنزم کا فلسفہ۔ یہاں میں نے ہیومنزم کو دانستہ انسان دوستی نہیں لکھا کہ ''ازم'' اکیلا نہیں آتا اور انسان دوستی کسی بھی نظریاتی بوجھ کو اٹھانے میں ہانپ سکتی ہے خواہ وہ ہیومنزم ہی کیوں نہ ہو۔ اب یہ تین محرّکات جو بظاہر اس ناول کے نظر آتے ہیں، ان پہ مختلف اطراف سے تعریف اور تنقید، اتفاق اور اختلاف کی گنجائش تو ہے مگر اس سے قطع نظر، میری ناچیز رائے میں فکشن کو کسی خاص نظریے کے پرچار یا اس کی مذمّت کے لیے وقف کرنے سے اس کا جمالیاتی پہلو متاثر ہوتا ہے۔ مصنف کسی کی سوچ کا پابند نہ ہوتا ہے، نہ ہونا چاہیے۔ اور کسی بھی خیال کو کہانی میں سمونا یا مرکزی خیال کی بنیاد اس پر رکھنا لکھاری (یا لکھاریوں) کا استحقاق ہے۔ سو یہاں مقصد موضوع پہ اعتراض نہیں ہے، نہ ہی قاری کا یہ منصب ہے۔ اور پھر کہانی کا پلاٹ یعنی مرکزی کردار رضوانہ کے حالات کی بنیاد بھی پرتشدّد سیاست کا ماحول ہے، تو کہانی بھی انھیں واقعات کے گرد گھومے گی۔ البتہ اسلوب کی سطح پر جس انداز سے ان واقعات کو بیان کیا گیا ہے، وہ کہیں کہیں سیاسی گورکھ دھندے کی شکار عورت کے بیان سے

زیادہ کسی سیاسی تجزیہ کار کا بیان محسوس ہوتا ہے۔سو، جو کچھ کہانی میں ہے،اس سب کے ہوتے بھی، اور اظہار میں سیاسی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر پہ سمجھوتہ کیے بغیر بھی، اگر سیاسی معاملات پہ تجزیے اور تبصرے کے انداز اور فلسفے یا نظریے کی تبلیغ کی حد تک تفصیل سے گریز کیا جاتا تو ناول کی جمالیاتی گرفت شاید زیادہ مضبوط ہوتی۔

یاسین بیگ صاحب کہ ادا کار بھی ہیں،اس ناول میں بھی انھوں نے یہ کام بخوبی کیا ہے۔رضوانہ بن کر جو خط انھوں نے لکھے ہیں،ان میں جو ادائیں، گریز، نخرا، اور پھر وارفتگی، ملکیت، محبوبہ کا تحکّم اور جزئیات سے رضوانہ کا سلوک ہے، وہ بتاتا ہے کہ انھوں نے عورت کی نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھ کر یہ خط لکھے ہیں۔یقیناً ناول میں ایسے کئی مقامات آتے ہیں جہاں مرد وہ سب شاید نہ لکھتا جو عورت ہی کا حصّہ ہے۔انھوں نے کئی باتیں ایک عورت کے نامے کی طرح تفصیل سے بھی لکھی ہیں مگر کہیں کہیں زیادہ تفصیلات سے گریز بھی کیا ہے۔ایسی تفصیلات عورتوں کے ناموں میں شاید عام ہوتی ہیں، چاہے مرد کو کتنی ہی غیر ضروری کیوں نہ لگیں۔پھر بھی میں یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کا کردار میں ڈوب کر لکھنا اس ناول کی کامیابی کا بڑا سبب ہے۔یاسین صاحب سنجیدہ ڈرامے کے مکالمے لکھیں (اگر اب تک نہ لکھے ہوں) تو یقیناً ان میں بھی وہی فطری برجستگی ہوگی جو کردار کو چاہیے۔ورنہ آج کل جو ڈرامے ''بہت زیادہ'' مقبول ہو رہے ہیں،ان میں یہی چیز سب سے کم نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر خالد سہیل کے خط بہت غور سے پڑھنے اور دعوتِ فکر دینے والے ہیں اور بڑی عمر میں پختہ سوچ والے مرد کی دلی وارداتوں کو بڑی وارفتگی سے بیان کرتے ہیں۔وہ مرد جو زندہ دل بھی ہے اور وابستگی کا اپنا تصوّر رکھتا ہے اور عمرِ رفتہ کے کچھ نازک مہکتے لمحات کے سحر میں جوانی کی کچی عمر والی محبت کے مزے لینے سے بھی نہیں کتراتا بلکہ زندگی کے مزے کو ہر قید سے آزاد رہ کر محسوس کر سکتا ہے۔پھر بھی ان خطوط کو پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ڈاکٹر خالد سہیل نے ہی لکھے ہیں۔ممکن ہے انھوں نے دانستہ خود کو اس میں شامل رکھا ہو اور پھر جو قاری ان سے ذاتی طور پہ واقف نہ ہو، اسے تو یہ محسوس بھی نہ ہو سکے گا۔مگر مجھ جیسے نیازمندوں سے ان خطوں میں ڈاکٹر صاحب کے اسلوب اور زبان نے کوئی پردہ نہیں رکھا۔مجھے توقع تھی بلکہ میری خواہش بھی تھی کہ عرفان قمر کے خطوط کسی عرفان قمر ہی کے خطوط ہوں لیکن شاید مصنف کی شعوری کوشش یا لاشعوری کاوش اس کے برعکس رہی۔چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے یہ خطوط خود سے باہر آ کر، کردار میں ڈھل کر لکھنے کے بجائے کردار کو خود میں ڈھال کر لکھے ہیں یعنی عرفان قمر سے بحیثیت ڈاکٹر خالد سہیل لکھوائے ہیں۔

دو ایک چھوٹی چھوٹی باتیں اور۔رضوانہ صدیقی نے ایک جگہ لکھا کہ بھائی نے ''بتایا ہے کہ جلد ہی کوئی اسمارٹ فون آنے والا ہے، جس کے بعد اس کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ سے نجات مل جائے گی۔فون کے اندر ہی کیمرہ بھی ہوگا''۔ میرے خیال میں یہ جملے اس ناول کا ساتھ نہیں دے رہے۔اس خط کے شاید 4 سے 6 مہینے میں رضوانہ کی امیگریشن ہو جاتی ہے اور اس نے کینیڈا آ کر ایک سال بھی نہیں گزارا ہوتا جب ناول ختم ہو جاتا ہے اور اسی دوران اسمارٹ فون بھی آ چکا ہوتا ہے۔مگر پورے ناول میں اسمارٹ فون، فیس بک اور واٹس ایپ کے عام ہونے کے بعد کی فضا محسوس کی جا سکتی ہے۔ایسی بہت سے باتیں ہیں جو فیس بک کے دورِ طفلی اور اسمارٹ فون سے پہلے کی معلوم نہیں ہوتیں۔بہرحال یہ تو ہم آج کہہ رہے ہیں، کل کا قاری یہ فرق نہیں جان سکے گا سو، جانے دیجیے۔رضوانہ ہی نے ایک خط میں چائنیز کھانے، پیزا اور پاستہ کے مشرف بہ پاکستانی ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔سوچیے تو یہ باتیں باہر رہنے والے پاکستانی کیا کرتے ہیں، پاکستان میں رہنے والوں کو تو عموماً اس بات کا ادراک بھی نہیں ہوتا اور زیادہ پرانی بات نہیں جب وہاں اس بارے میں بتاؤ بھی تو یہ ان دوستوں کے لیے فارسی ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح عرفان قمر نے جو خط نمبر تین اور پانچ میں رضوانہ صدیقی سے یہ بات منوانے پہ اصرار کیا ہے کہ وہ، وہی رضوانہ ہے جس کی عرفان کو تلاش ہے۔میرے خیال میں یہ مناسب یوں نہیں کہ خط نمبر دو کے آخر میں رضوانہ خود ہی پردہ اٹھا چکی ہے اور خط نمبر چار میں تو بالکل کھل کر، سامنے آ گئی ہے اور پرانے دوست سے مشترکہ ماضی کے حوالے سے سیدھی سیدھی باتیں بھی کر رہی ہے۔اس لیے خط نمبر تین اور پھر پانچ میں رضوانہ صدیقی کی تصدیق چاہنے یا نیم رضامندی کے قیاس کی گنجائش ہے نہیں۔

آخری بات یہ کہ ناول کا اختتام بہت خوب اور فطری ہے جس پہ دونوں مصنفین مبارک باد کے مستحق ہیں۔آخر تک یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ کیا ہونے والا ہے اور یہ اس کہانی کی بڑی خوبی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد کتاب کے ختم ہونے کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔اور آخری خط کی آخری سطریں تو سب پر بھاری ہیں، کہ پڑھنے والا سوچتا ہی رہ جائے کہ آخر دونوں محبوبوں نے اپنے تعلق اور آخری ملاقات کو بالآخر کس طرح نبھایا ہوگا۔سوچا تھا کہ کتاب پر میرے تاثرات ایک مختصر کمنٹ میں سما جائیں گے مگر پتہ نہیں کس رو میں لکھتا چلا گیا۔حالانکہ اتنی لمبی تحریریں پڑھنے کا وقت اب لوگوں کے پاس ہوتا نہیں ہے۔ڈاکٹر خالد سہیل اور مرزا یاسین بیگ صاحبان کو دوبارہ اس کامیاب تجربے پہ مبارک باد اور اس خامہ فرسائی میں جہاں حد سے گزر گیا ہوں، وہاں معذرت۔

compulsory

A Man calls u White House & Says;

I want to be the next President of USA.

Operator: Are you an idiot?

Man: Is it compulsory?

کھائیو مت فریب

(غالب کے قولِ محال کے حوالے سے)

سلیم شہزاد
(مالیگاؤں)

اردو شاعری کی اکثر صنعتوں مثلاً تشبیہ، استعارے، کنایے، علامت وغیرہ میں معنی کی ترسیل کے دو تکنیکی عوامل ہوتے ہیں۔ جن میں سے معنی کی تفہیم کے لیے صرف ایک پر انحصار کیا جاتا ہے۔ (اگرچہ مذکورہ صنعتوں کی تشکیل میں دونوں عوامل کا حصہ لینا ضروری ہے۔) تشبیہ میں یہ عوامل مشبّہ، بہ مشبّہ استعارے میں مستعار لہٗ، مستعار منہ، کنایے ہیں لغوی مجازی معنی، علامت میں تجرید/تجسیم اور ایہام میں قریبی/بعیدی معنی ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ صناعیات میں ایک چیز اور ہے جسے محتمل الضدین/قولِ محال کہا جاتا ہے۔ یہ ایسی صنعت ہے جس کے دو عوامل باہم مختلط ہوتے ہیں اور معنوی تفہیم کے لیے دونوں کو "ایک" کی طرح قبول کرنا پڑتا ہے۔ روایتی شعریات کے مطابق محتمل الضدین کو صنعتِ توجیہ بھی کہتے ہیں یعنی نظم یا نثر مشتمل بر مدح و ذم وغیرہ۔ (اس کا تعلق معنی سے زیادہ شعر کے موضوع سے معلوم ہوتا ہے۔)

''کسی قسم کے کلام میں اور وجہِ مختلف کا احتمال ہوسکتا ہے اور وہ دونوں جہتیں باہم تضاد کا علاقہ رکھتی ہوں اور کسی کو ترجیح نہ ہو۔ برائی اور بھلائی ان کی یعنی مناسبت اور نامناسبت مقام ہونا کسی قرینے سے معلوم ہوسکے اور بعض جگہ یہ قرینہ بھی گم ہوجائے اور سامعین کو دو معنی بر سبیل اختلاف کے دریافت ہوں۔''

(بحوالہ "بحرالفصاحت" مولوی نجم الغنی)

ان حوالے کی مثالوں میں بعض شاعروں کے ساتھ غالب کے بھی دو تین شعر دیئے گئے ہیں جن پر آگے بات کی جائے گی۔ جمالیات کے ایک روسی ماہر نے بعض دیومالائی کرداروں کی مثالوں سے جن میں انسان اور حیوان کے وجود بیک وقت شامل نظر آتے ہیں، قولِ محال/صورت محال/ظہورِ محال کو ثابت کیا ہے۔ مثلاً قدیم مصری دیوتا آنوبیس انسان اور گیدڑ کا اور ابوالہول انسان اور شیر کا مجموعی مظہر ہے۔ اسی طرح ہندو دیو مالا میں ہنومان (انسان اور بندر) گنیش (انسان اور ہاتھی) وغیرہ۔ ایسی عجوبہ ہستیوں میں انسان انسان ہوتا ہے نہ شیر شیر۔ یہ "انسانی شیر" یا "شیر انسان" کے استعارے سے آگے کا تعمل ہے۔ استعارے میں انسان یا حیوان کسی کو بھی قبول کرتے ہوئے ہم ان کے مختلف وجودوں کو پہچانتے ہیں۔ لیکن ابوالہول کو، ہم دو مختلف مظاہر کے مشترک خواص اور معنی کے ساتھ قبول کرتے ہیں کہ یہ شیر ہے نہ انسان، یہ ابوالہول ہے اور اس کا وجود ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی انسان اور حیوان دونوں کو ایک مجموعی بامعنی حیثیت سے قبول کرنا، انھیں دیکھنے والوں کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ:

''بہت سے مصدقہ شواہد کی بنا پر پیدا ایشی لسانی/وقوعی/مظہری صورتِ حال جس کے مشاہدے (یا مطالعے) سے منطقی استخراج کو نقصان پہنچائے بغیر متعدد اختلافی/متضاد مفروضات تک پہنچا جاسکے، قولِ محال/صورتِ محال ہے''۔

(ڈکشنری آف لیٹری تھیوری)

واضح رہے کہ صورتِ حال کا یہ (معنوی) اختلاف/تضاد نہ صرف منطقی استخراج سے نمو پاتا ہے بلکہ مسلمہ نظریاتی تجزیوں سے بھی جو تجربات و مشاہدات کے نتائج ہوتے ہیں تضاد و تخالف کا رشتہ رکھتا ہے۔

بدیعیات کے علماء قولِ محال کو تقریری/تحریری کلام کی ایک صنعت خیال کرتے رہے لیکن بیسویں صدی کے ناقدین اور فلاسفر اسے زبان/معنی کی تفہیم کا ایک اعلیٰ طریق تسلیم کرنے اور تخلیقی زبان کی افہام و تفہیم میں جس کی وجہ سے متعدد طرفین و کشاد ہونے کے سبب خاص اہمیت کا حامل مظہر قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق قولِ محال ایسا لسانی تعمل/بیان ہے جو اپنے منطقی معنوں سے اس حد تک آپ ہی اختلاف کرنے والا (بظاہر لغو/ہو کر اس کا مفہوم کسی اور ہی (صحیح) معنوی سیاق کی طرف ذہن کو منتقل کرے یہ بظاہر دو متضاد بلکہ نقیض خیالات تصورات معنی کا حامل بیان ہوتا ہے۔ ان میں ایک معنی دُور کے ہوسکتے ہیں۔ ایسے مستعبد بیان کو سننے اور پڑھنے والا انھی دُور کے معنی کی تفہیم کو بہ عجلت قبول کرسکتا ہے۔ جیسا کہ صنعت ایہام کا معنوی سیاق بھی اسی قسم کا ہوتا ہے لیکن ایہام میں توقع ایک ہی معنی کو قبول کرنے کی ہوتی ہے جبکہ قولِ محال اپنی دورنگی، یکرنگی کی وجہ سے دونوں معنوں کو قبولیت کے لائق بناتا ہے۔ اگرچہ یہ قبولیت بھی کن مکن کی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ ایسی بات/کلام جس کا واقع ہونا اپنے آپ میں ممکن نہ ہو، انگریزی میں اسے پیراڈاکس کہتے ہیں۔ جس کے معنی کلام ماورا کے ہیں۔ یعنی وہ خیال کسی معروف تصور کے خلاف ہونے کے باوجود جسے ذو معنی ہونے کے طور پر قبول کیا جاسکے۔ سولہویں صدی کے آس پاس اس اصطلاح کے مروج معنی عام ہوئے ہیں۔ جن میں لغویت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ ایسے ماورا کلام کو عصری تنقیدی فلسفہ زبان کے ہر تفاعل کی خصوصیت قرار دیتا ہے، خاص طور پر شاعری کے زبان، ناقدین کے مطابق قولِ محال کی زبان ہوتی ہے۔ شعری صنائع میں تضاد، محتمل الضدین اور ایہام کی صنعتیں اور ساختی استرداد کے مطابق اختراق/التوا/پوریا وغیرہ کے تصورات قولِ محال ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔

علوم و فنون کے تخاطبات سے قطع نظر وجود کے ہونے نہ ہونے یا لفظ میں معنی کے ہونے نہ ہونے کی ذیل میں مرزا اسداللہ خان غالب نے بھی بہت سی آرا کا اظہار کیا ہے۔ وجود/عدم، ہستی/نیستی، ظاہر/باطن وغیرہ مروجہ تضاد کے تصورات غالب کے کلام میں بالتکرار تخلیق سے گزرے ہیں اپنے خطوط میں بھی غالب نے شاگردوں اور دوستوں سے ان موضوعات پر خوب باتیں کی ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار

ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
ہاں ، کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ''ہے'' نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے ، غالب
آخر تو کیا ہے اے ''نہیں ہے''

ان شعروں میں وجود/ہستی/ظاہر کے ''ہونے نہ ہونے'' کی معنویت تصوف اور اسراریت کی دین ہے۔ یہاں دوسرے مصرعوں میں خصوصاً وحدت الوجود والشہود کی روایتی، فکری، اصطلاحی تمثیلیں نظر آتی ہیں۔ جن کے مقابلے میں آئندہ مثالوں میں مستعمل شعری/صوفیانہ فلسفیانہ لفظیات زیادہ تر غور طلب ہیں۔

اور اب خطوط/اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔

''قسم جسم وجسمانیات میں سے نہیں، ایک اعتبار محض ہے سیمرخ کا سا اس کا وجود ہے یعنی کہنے کو ہے، دیکھنے کو نہیں بس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی قسم ہوگئے تو گویا اس صورت میں پیدا ہونا، ہمارے نہ ہونے کی دلیل ہے''۔

(خط بنام میر مہدی مجروح: ۸ دسمبر ۱۸۶۳ء)

غالب کا یہ بیان ان کے ایک شعر

ہستی ہماری ، اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

کہ تشریح کے تعلق سے ہے، یہاں سیمرخ کا حوالہ بھی ایک معدوم وجود کی نمائندگی کرنے والا ہے گویا ہر چند کہیں کہ ''ہے'' نہیں ہے کا سا معاملہ ہے۔

اسی طرح غالب کے لیے ادراک معنی کا تصور یہ ہے کہ ایک لفظ کے معنی تو معلوم ہیں مگر ان میں معنی کے ہونے نہ ہونے کا تضاد بیک لحہ پایا جاتا ہے۔ یہ صورت محال ہے کہ ایک وقوعہ بیک لحہ واقع/معدوم ہو رہا ہے۔ اس تعلق سے ایک اقتباس پیش ہے:

''امورِ نفسانی میں اضدا کا جمع ہونا محالاتِ علایہ میں سے ہے۔ کیونکہ ہو سکے کہ ایک وقت خاص میں ایک امر خاص موجب اشراح کا بھی ہو اور باعثِ انقباض کا بھی؟ یہ بات میں نے آپ کے اس خط میں پائی کہ اس کو پڑھ کر خوش بھی ہوا اور غمگین بھی ہوا''۔

(خط بنام نور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق: 24 اکتوبر 1861ء)

صورتِ حال کی یہ دوسری مثال کہ خوشی اور غم کے متضاد وقوعے ایک ساتھ نمو کریں۔ اور اب قولِ محال کا غالب کا اپنی ذات پر اپنی فکر کے تعلق سے اظہار:

''آج میرے پاس سینتالیس نقد بکس میں اور چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔'' الحمد اللہ علی احسانہ

(بنام منشی تفتہ: 14 جون 1853ء)

بکس میں کچھ نقد ہونے پر تو بجا ہے کہ اللہ کی حمد کی جائے اور اس کے احسان کا تذکرہ ہو لیکن اسی سانس میں چار بوتل شراب وغیرہ کے ہونے کو جوڑ کر اسے بھی اللہ کا احسان تصور کرنا صورتِ محال اور غالب کے لفظوں میں قولِ محال ہے۔ اسے ''حلال'' اور ''حرام'' گر بیک فکر ظہور پذیر ہونے کا اعلامیہ سمجھنا چاہیے۔

فرماتے ہیں:

ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب ہائے غضب!

(بنام مجروح: 13 نومبر 1859ء)

یہاں ''تشنہ لب'' ہونا پیاسا ہونے کا مترادف نہیں بلکہ ''شراب کی طلب'' کے مترادف ہے جسے ''ساقی کوثر'' سے ہمرشتہ کر کے وہی اوپر کے مطابق ''حرام'' کو ''حلال'' سمجھنے اور بتانے کا قولِ محال ہے۔ (جسے ''ساقی کوثر'' سے گستاخی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔)

کلام ماورا سہ ابعادی ساخت میں نمو کرتا ہے جس کا ذکر گزر چکا یعنی (1) یہ ایک لسانی تعمل ہوگا جسے عام طور پر قولِ محال کی اصطلاح میں ظاہر کرتے ہیں۔ (زبانی قولِ محال) (2) یہ ایک ایسا لسانی تعمل ہوگا جس سے کسی وقوعے کی صورتِ حال کے نمو پانے کی معنویت اجاگر ہوگی جسے وقوعِ محال کہنا مناسب ہے۔ (وقوعی قولِ محال) اور (3) ماورا کلام کی تیسری ساخت کسی ایسے مظہر کو سامنے لائے گی جو شئے/وجود/مظہر کے بیک لحہ ہونے/نہ ہونے کی نمائندگی کرے گا اور اسے ظہورِ محال کہنا چاہیے۔

اپنے مقالے ''غالب: اپنے شعروں کی تشریح'' کے تحت شعر

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

کے متعدد مفاہیم (اور یہ تمام من مانے مفاہیم ہیں) بیان کر کے ڈاکٹر تیر مسعود کہتے ہیں:

''پہلا مصرع متضاد مفہوم ادا کرتا ہے: ایک یہ کہ موت ابھی دُور معلوم ہو رہی ہے اور ایک یہ کہ موت قریب آ گئی ہے''۔

ماورا کلام کی اصطلاح کا نام لیے بغیر نیر مسعود نے اس شعر کے مفہوم سے ''دوری'' اور ''قربت'' کے تضاد کو تو اخذ کر لیا ہے مگر ایسا کلام اگر شعر کا خاصہ ہے تو شعر یعنی اس کے دونوں مصرعوں کی مجموعی لسانی معنویت کے ساتھ قولِ محال کی ساخت اختیار کرتا ہے کیونکہ قولِ محال کے اجتماع ضدین کی معنویت شعر کے ہر لفظ کی معنویت سے ہمرشتہ ہوتی ہے/ ہونی چاہیے۔ محولہ شعر کے دونوں مصرعوں میں کوئی لسانی ساختیہ ایسا نہیں جو قولِ محال کی خصوصیت کا حامل ہو۔ اگر غالب کے محولہ شعر کا دوسرا مصرع پہلے قول محل سے ہمرشتہ نہیں تو قولِ محال بھی اس شعر کی خاصیت نہیں ہے۔ شعر کے مضمون اور معنی کے ایک دوسرے پر انطباق کی ضاحت اسی مضمون میں موصوف نے یوں کی ہے کہ:

''شعر کو پڑھ کر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا موضوع وجود وعدم اور ایک کی دوسرے میں پیوستگی ہے۔ اس میں ہونے کو نہ ہونے کی دلیل بتایا گیا ہے''۔

شعر سے یہاں مراد دو مصرعوں پر مشتمل لسانی متن یعنی پورا شعر ہے نہ کہ پہلا یا دوسرا مصرع جیسا کہ آپ نے ''کوئی دن'' والے شعر پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

نیر مسعود نے ''تعبیرِ غالب'' کے مقالات میں قولِ محال کی اصطلاح اتنی وضاحت سے نہیں برتی جتنی وضاحت سے شمس الرحمٰن فاروقی ''تفہیمِ غالب'' میں اس کا تذکرہ کرتے اور بعض شعروں میں اس کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

میں فاروقی کے مطابق،

''غالب کا محبوب فن یعنی قولِ محال اپنی پوری کیفیت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ایک قولِ محال یوں ہے کہ ایک طرف تو جنوں جولانی میں یہ تیزی ہے کہ آہو سے بھی آگے نکل گئے ہیں اور دوسری طرف بے سروسامانی کا یہ عالم ہے کہ ''سروپا'' بھی نہیں رکھتے۔ (یعنی پیر نہیں ہیں مگر آہو سے تیز دوڑ رہے ہیں)''۔

فاروقی اس شعر میں دوسرا قولِ محال یہ بتاتے ہیں کہ

''جب سروپا نہیں تو وجود نہیں اور جب وجود ہی نہیں تو آہو خیالی ہے جس کی مژگاں سے پیٹھ کھجانے کا کام لیتے ہیں''۔

لیکن عرض ہے کہ جہاں وجود اور آہو کی متضاد وحدت تشکیل نہیں پاتی اس لیے اسے قولِ محال کہنے میں تامل ہوتا ہے۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

کی تفہیم میں فرماتے ہیں: ''ہوا'' بمعنی ''باد'' کا بھی اشارہ خوب ہے! اگر ہوا تیز ہو تو شمع بجھ جائے گی اور اسے جلنے سے چھٹکارا مل جائے گا لیکن اگر ہوا نہ ہو تو شمع جل بھی نہیں سکتی، کیونکہ جلنے کے لیے آکسیجن ضروری ہے۔ لہٰذا ''ہوا خواہ'' میں غالب کا مخصوص قولِ محال بھی موجود ہے۔

شمع کے جلنے کے لیے ہوا نہ ہو یا ہوا میں آکسیجن موجود نہ ہو تو شمع نہیں جلے گی۔ یہاں جلنے کے لیے آکسیجن ضروری ہے کا تجربہ تو نہیں کیا جا رہا ہے کہ ہوا کی جگہ خلا پیدا کر دیا جائے۔ اگر ایسا سائنسی تجربہ مقصود نہ ہو تو ہوا نہ ہونے کے باوجود شمع جلتی ہے اس لیے لسانی مرکب ہوا خواہ/ جس کے معنی بھلا چاہنے والے کے ہیں) قولِ محال نہیں بناتا اس کے لیے شعر میں ضروری تھا کہ ہوا خواہ میں دو متضاد معنی (خیر خواہ اور بدخواہ) یک لحہ پائے جائے جو نہیں پائے جاتے۔

وہ نگاہیں کیوں ہُوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

ارشاد فاروقی:

''غالب نے اگر اپنے تجربے کو قولِ محال کے رنگ میں نہ پیش کیا ہوتا تو میر کے سامنے ٹھہرنا محال تھا''۔

لیکن موصوف نے مندرجہ ذیل شعر میں قولِ محال بنانے والے لسانی عوامل کی نشاندہی نہیں کی جو دراصل (نگاہوں کی) ''طوالت'' اور قسمت کی ''کوتاہی'' کا اجتماعی ضدین ہے۔

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

یہ غالب کا مخصوص قولِ محال کا انداز ہے۔

کہہ کر فاروقی وضاحت کرتے ہیں کہ آہ علامت ہے انتشار کی اور بخیہ علامت ہے حزم و حفظ کی آہوں کو روکنا دراصل چاکِ گریباں کے لیے بخیہ ہو گیا ہے۔ یعنی آہ کا انتشار بخیہ کا انقباض بن گیا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

کی شرح کرتے ہوئے فاروقی نے لکھا ہے کہ

یہ شعر بھی غالب کے مخصوص انداز کا قولِ محال پیش کرتا ہے۔

یعنی ایک شخص کو ''واحدیت'' کا قائل ہے مگر ''مذہب'' کو نہیں مانتا۔ گویا مذہب نہ رکھنا اصل مذہب ہے۔ اس مخصوص انداز کے قولِ محال کی وضاحت فاروقی نے کہیں نہیں کی ہے۔ ویسے تو قولِ محال مختلف انداز کا ہوتا بھی نہیں کہ میر کا قولِ محال اپنا انداز اور غالب کا اپنا انداز رکھتا ہو۔ مذہبی نہ ہونا بھی اصلاً مذہبی ہونا ہے تو یہ قولِ محال نہیں، محض معمولی تضاد ہے۔ کہتے ہیں کہ:

مگر غبارِ ہُوئے پر ہَوا اُڑا لے جائے

میں قولِ محال اور کائناتی المیے کا اظہار ہے۔ مگر غبار کو ہوا کے اڑانے میں کوئی قولِ محال نہیں پایا جاتا۔ شعر کے دوسرے امصرع

وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

میں بھی کوئی نکتہ یا فقرہ قولِ محال کی تشکیل نہیں کرتا۔

غالب کے پہلے شعر (نقش فریادی ہے) کی شرح کرتے ہوئے فاروقی کا قول ہے کہ

''نقش بے زباں ہوتا ہے اور یہ بے زبانی ہی اس کے فریادی ہونے کی دلیل ہے۔ اس طرح کا قولِ محال غالب کو بہت عزیز تھا''۔

نقش کی بے زبانی کو غالب نے فریاد نہیں کہا ہے ان کا شعر تو صاف کہہ رہا ہے کہہ رہا ہے کہ تصویر کا پیر ہی کاغذی ہے اس لیے تصویر یا نقش فریاد کر رہا ہے۔ قولِ محال یعنی وہ بیان/ صورتِ حال/ منظر جس کے ہونے نہ ہونے کی معنویت بیک لحہ ظاہر ہو رہی ہو یعنی جو موجود/ غائب، موقوع/ غیر موقوع اور محسوس/ غیر محسوس وغیرہ کے مروجہ تضاد (اجتماعی ضدین) کو ایک دوسرے پر انحصار/ انطباق کے ساتھ ترسیل کرے۔

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

کی شرح میں کہتے ہیں کہ یہ غالب کا مخصوص رنگ قولِ محال کا شعر ہے۔ سعی علاج سے وہ مرض پیدا ہوتا ہے جو خود لاعلاج ہے۔

شعر میں سعی علاج بھی ہے اور مرض کا لاعلاج ہو جانا بھی لیکن یہ شعر کسی رنگ کا قولِ محال نہیں رکھتا کیونکہ اس کے کسی لفظ سے ظاہر نہیں کہ مرض کے لاعلاج ہونے کو علاج کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ یا درد کے حد سے گزر جانے کو دوا مان لیا گیا ہے۔

قول محال کی اصطلاح کا تعارف اور اس کی لسانی شعریاتی اہمیت و افادیت پر گفتگو اکیسویں صدی کی مابعد جدید لسانیاتی شعریات سے تعلق رکھتی ہے۔ زبان اور اس کے تکنیکی مباحث پر ناقدین اور ماہرین زیادہ توجہ نہیں فرماتے اس لیے انھوں نے قولِ محال کو اپنے قیل ومقال کا حصہ کم ہی بنایا ہے۔ برسوں پہلے راقم نے نیر مسعود کے ایک افسانے ''عطر کافور'' کے تجزیے میں قول محال کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ (مطبوعہ 1، ماہنامہ جواز، شمارہ 26) بعد ازاں ''ساز فسانگی'' از راقم) فی الوقت شعر وشاعری میں اس لسانی تنقیدی تصور پر بعض معروضات پیش ہیں۔

کلام ماورا کا تعمل جیسا کہ کہا گیا، کسی قول، وقوعے یا مظہر کی لسانی ساخت میں سامنے آتا ہے اور لسانی تعمل ہونے کے سبب ہی اسے عمومی اصطلاح زبانی قول محال کا نام دیا گیا ہے۔ غالب کے خطوط کی دی گئی مثالوں سے واضح ہے کہ کچھ منطق، کچھ تصوف اور کچھ فلسفے تصورات کی آمیزش سے اور بہت کچھ بدیعیات میں اجتماع ضدین/ احتمال الضدین کے حوالے سے غالب نے ماورا کلام کی ایک تکنیکی ہیئت تشکیل دے رکھی تھی جس کا فنی اظہار ان کی شاعری میں بار بار سامنے آتا ہے۔ کلام ماورا کے تعمل قولِ محال کی چند مثالیں پیش ہیں۔

حکم بے تابی نہیں اور آرمیدن منع ہے
باوجودِ عشقِ وحشت ہا، رمیدن منع ہے

''آرمیدن/ رمیدن'' تجنیس زائد سے قطع نظر ''حکم بے تابی'' میں امر اور ''آرمیدن'' میں ہستی کی نقیض معنویت کا ادغام واضح ہے۔ بیتابی کا اظہار نہ کرنے کا حکم (جو نہیں کا حامل ہے) آرام نہ کرنے کی ممانعت سے (اور یہ منفی ساختیہ ہے) معنوی انطباق رکھنے کی وجہ سے قولِ محال کی تشکیل بن گیا ہے۔ دوسرا مصرع شاعر کی وحشت کرنے کی عادت کا اظہار ہے اور عادت کے باوجود وحشت ناک رفت وگزشت اس کے لیے ممنوع ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس شعر میں ''بندگی/ آزادگی'' کی متضاد معنویت کی پیوستگی نے قولِ محال کا روپ دیا ہے۔ بندے ہیں تو رب کعبہ کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار کرنے کے لیے کعبے پہنچ گئے مگر اسی وقت کعبے کا در بند ہونے کا خدشہ ہونے کے سبب الٹے پھر آنے کی تیاری بھی ہے۔

قید میں بھی ہے اسیری آزاد
چشم زنجیر کو وا باندھتے ہیں

ترکیب ''اسیری آزاد'' میں تقلیب اور فکر اضافت ہے۔ (دراصل ''آزادِ اسیری'' یعنی اسیری/ قید کا آزاد کیا ہوا یا قید میں رہنا جس کے لیے آزادی کے مترادف ہو) ایسا عاشق قید ہے مگر اس کی زنجیر کی چشم (حلقے) نگرانی کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ ''زنجیر کو وا باندھنا'' میں بھی قول محال چمک رہا ہے۔

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار
پاس بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

دل کا خون آنکھوں سے بہتے رہنے کی وجہ سے آنکھیں بے رونق ہو رہی ہیں لیکن آنکھوں کی یہی بے رونقی ہمارے لیے آنکھوں کی رونق ہے۔ ہم اسی لیے تو دل سے خون بہاتے ہیں کہ آنکھوں کی بے رونقی بڑھے۔

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

شمس الرحمن فاروقی نے اس شعر کی شرح میں لکھا ہے۔

''دماغ عجز کے معنی ہوئے: مجھے اپنی عاجزی پر بہت گھمنڈ ہے۔ یہاں بھی غالب نے حسب معمول استعارہ در استعارہ برتا ہے۔ (غالب نے دماغ اور عجز کو ملا کر تیسرا استعارہ بنا دیا ہے)

فاروقی نے اس سے شعر کی لمبی چوڑی تشریح کی ہے۔ عجز کے غلو سے قولِ محال پیدا ہوتا ہے نہ کہ استعارہ در ستعارہ۔ تغافل دوست ہونے پر شاعر کا اکڑنا اس کا ''دماغ'' ہے۔ یعنی غرور مگر شاعر سے اوروں کے تغافل پر یہ غرور بجا ہے۔ تغافل اور پہلو تہی میں بھی معنوی یکسانیت ہی اور تہی اور خالی بظاہر ہم معنی ضرور ہیں لیکن غالب نے تہی کی بجائے ''پہلو تہی کرنا'' استعمال کر کے خالی سے ایہام کو اجاگر کیا ہے۔

بہ حسرت گاہ ناز کشتۂ جاں بخشی خوباں
خضر کو چشمۂ آب بقا سے تر جبیں پایا

توالی اضافات کے حامل پہلے مصرع کی جزوی ترکیب ''کشتۂ جاں بخشی'' میں قولِ محال ہے۔ یعنی جاں بخشی کا مارا ہوا۔ اس مصرعے کا ترجمہ / وضاحت یوں ہے: معشوق کے (اپنے لطف وکرم سے عاشقوں کی) جاں بخشی کر دینے کے قائل تھا ناز وادا والی شدید حسرت کے آگے/ سامنے خضر آب بقا کے چشمے سے پانی پی کر عمر طویل حاصل کرنے کو گناہ سمجھتا ہے۔ معشوقوں کی جاں بخشی کے آگے آب بقا کی جاں بخشی ہیچ ہے۔

خراب آباد غربت میں عبث افسوس ویرانی
گلِ از شاخ دور افتادہ ہے نزدیک پژمردن

غالب نے اس شعر میں خراب/ آباد، آباد/ ویرانی اور دور/ نزدیک قولِ محال کے تین ساختیے بیک وقت استعمال کیے ہیں۔ دیارِ غیر میں رہ کر اس کی ویرانی کا افسوس بیکار ہے کیونکہ شاخ سے ٹوٹ کر دور جا پڑا پھول تو (ویرانی/ خرابی) میں مرجھانے کے قریب ہے۔

نگہ کی ہم نے پیدا رشتۂ ربطِ علائق سے
ہوے ہیں پردہ ہائے چشمِ عبرت جلوہ حائل ہا

ترکیب ''رشتہ/ربطِ علائق'' میں پہلے دو لفظ (مضاف) اور تیسرا لفظ (مضاف الیہ) یکساں معنی کے حامل ہیں مگر ''علائق'' یعنی لوگوں/چیزوں/منظروں وغیرہ سے بے تعلقات (ربط) پیدا کرنے والا دھاگا (رشتہ) کے معنوں میں یہ ترکیب ایک طرح کا معنوی اختلاف پیدا کرتی نظر آتی ہے۔ گویا اپنے آپ میں اثبات کے حاصل ہونے کے ساتھ منفی معنی کے بھی حامل ہیں جن کے انضمام سے قولِ محال تشکیل پاتا ہے۔ دوسرے مصرع میں الفاظ ''پردہ/جلوہ'' کا تضاد بھی متوجہ کن ہے۔ جن جلووں کو نگاہ دیکھ رہی ہے۔ چشمِ عبرت کے پردے ان کے آگے حائل ہیں۔

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
بہ رنگ جادہ سرِ کوے یار رکھتے ہیں

''فتادگی میں استواری'' کے ربط سے قولِ محال کی ترسیل ہو رہی ہے۔ ''فتادگی'' راستے/کوے یار کے مکانی استحکام کا اور ''استواری'' ایک خاص سمت (کوے یار کی سمت) مسلسل چلتے رہنے کا استعارہ ہے۔ راستہ بظاہر رکا ہوا ہے لیکن ایک سمت جا بھی رہا ہے۔

زمانہ سخت کم آزار بجان اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

''سخت'' بمعنی ''بہت'' (فارسی اور سابقے ''کم'' میں اجتماعِ ضدین پایا جاتا ہے۔ ''سخت کم آزار بھی ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔ دوسرے مصرع کا لفظ ''زیادہ'' جس کا متضاد ہے۔

قبائے جلوہ فزا ہے لباسِ عریانی
بطرزِ گل رگِ جاں مجھ کو تار داماں ہے

''لباسِ عریانی میں قولِ محال ہے (شہ بے خودی نے عطا کیا ہے مجھے لباسِ برہنگی)

نازِ خود بینی کے باعث مجرمِ صد بے گناہ
جوہرِ شمشیر کو ہے پیچ تاب آئینے پر

''مجرمِ صد بے گناہ'' کو اگر مخاطب فرض کیا جائے تو شعر کی نثر ہوگی کہ اے مجرمِ صد بے گناہ (یعنی معشوق) تیری خود بینی کے باعث جوہرِ شمشیر کو آئینے پر پیچ و تاب ہے (جوہرِ شمشیر آئینے پر پیچ و تاب کھا رہا ہے) معشوق کی خود بینی، شمشیر کے جوہر اور آئینے کے لسانی معنوی تعملات آپس میں کوئی بامعنی متن نہیں بننے دیتے۔ مجرمِ صد بے گناہ کے معنی سوا یہ بے گناہی کا جرم کرنے والا یعنی عاشق کے لیے جائیں تو بھی معشوق کی خود بینی، شمشیر کا جوہر اور آئینے کا معنوی ربط نہیں بنتا البتہ شعر کا تخاطب ہے، اپنے آپ میں قولِ محال ضرور بتانا ہے۔

اے اسد بیجا ہے نازِ سجدۂ عرض نیاز
عالمِ تسلیم میں یہ دعویٰ آرائی عبث

ترکیب 'نازِ سجدۂ عرضِ نیاز' میں ''ناز/نیاز'' کا تضاد تو ہے ہی، ناز اور سجدے کے ربط سے قولِ محال بنتا ہے بس سجدے یعنی عالمِ تسلیم میں دعویٰ آرائی قابلِ قبول نہیں۔

کم نہیں نازش ہم نامی چشمِ خوباں
تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

بیمار عاشق کو شفا کسی طرح ہوتی رہی ہے اپنے (معشوق کے) بیمار کہلانے ہی پر اب اس نے صبر کر لیا ہے کہ معشوق کی چشم سے تو اس کا رشتہ ہو گیا۔ اب اس کا اچھا یہ ہونا میرا نہیں ہے۔۔۔ اس کے لیے اچھا ہے (قولِ محال) بیمار سے تو اس کا رشتہ ہو گیا۔ اب اس کا اچھا ہونا برا نہیں ہے۔ یا اب اس کا برا (بیمار) رہنا ہی اس کے لیے اچھا ہے (قولِ محال)

ملنا ترا نہیں اگر آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
آسان نہیں (دشوار) سہل
دشوار۔ دشوار نہیں (آسان)

معشوق سے نہ ملنے کی دشواری عاشق کے لیے سہل ہے مگر یہی دشوار کام اس کے لیے دشوار بھی نہیں (یعنی آسان ہے) یہ لفظی بازی گری ہے جس میں قولِ محال پیدا کیا اور دونوں مصرعوں میں شاعر نے ایک ہی بات کہی ہے۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

شاعر کی بے اعتدالیوں نے اسے زمانے بھر میں سبک/بے حیثیت کر دیا ہے لیکن وہ اپنی بے اعتدالیوں سے مطمئن نہیں جتنی زیادہ بے اعتدالیاں وہ کرتا پھرتا ہے، اتنی ہی وہ اسے کم معلوم ہوتی ہیں۔ زیادہ/کم کے معمولی لفظوں سے قولِ محال بنا دیا ہے۔ وقوعِ محال وہ لسانی تعمل (قولِ محال) ہے جس میں کسی وقوعے کے واقع ہوئے اور واقع نہ ہونے کا عملاً یک لحہ صادر ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ اسے وقوعِ قولِ محال کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانی شمع
ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانی شمع

آتشِ گل اور آبِ زندگانی دونوں غیر موقوع مظاہر ہیں مگر شمع کی زندگی دونوں کے واقع ہونے سے وجود پاتی ہے۔ پہلے مصرع کا ''رخِ نگار'' اسے ظہور کے سبب آتشی سے اور شمع کا سوز/چمک دمک اور روشنی آب سے مشابہ ہے۔ انسلاک سے شعر میں وقوعِ محال کا، سدا کلام نمو پاتا ہے۔

نالہ ہا حاصلِ اندیشہ کہ جوں کشتِ سپند
دلِ ناسوختہ آتش کدۂ صد تب تھا

دل کے ناسوختہ ہونے کا واقعہ واقع ہوسکتا ہے لیکن دل ناسوختہ کا آتش کدہ صدتب ہونا، ممکن الوقوع نہیں۔ شعر میں یہ دونوں مثبت منفی وقوعے ایک ساتھ واقع ہوکر وقوعِ محال کی تشکیل کررہے ہیں۔ سپند کا ذخیرہ ہے آپ میں اسی طرح نالوں کو چھپائے ہوتا ہے جس طرح دل آتش کدے کو۔

دیکھتے تھے ہم بچشم خود وہ طوفان بلا
آسمان سفلہ جس میں یک کف سیلاب تھا

بلند تر آسماں کو سفلہ (نیچ) کہتے کہنے میں قول محال اور نیچ میں نیچلے اور کمینے سے ایہام ہے۔ اردو فارسی شاعری میں آسمان کو ظالم، بے رحم، بلاخیز وغیرہ کہنے کی روایت عام ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جو طوفانِ بلا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا نیچ آسمان اس کے سامنے کفِ سیلاب سے زیادہ نہیں تھا۔

آشیاں بند بہار عیش ہوں ہنگام قتل
یاں پر پرواز رنگِ رفتہ بال تیر ہے

''آشیاں بند'' یعنی آشیانے میں قید ہونے کا تصور وقوعِ محال کی نمود کرتا ہے۔ ''بندِ رفتہ'' میں بھی تضاد ہے۔

الفت گل سے غلط ہے دعوی وارستگی
سرو ہے باوصف آزادی گرفتار چمن

سرو آزاد کہلاتا ہے۔ مگر چمن میں ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کی آزادی اس کی اسیری کے مترادف ہے۔ اسی طرح چمن میں رہ کر کوئی گل کی محبت سے آزادی کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ ہر کوئی گل کی محبت میں گرفتار ہے۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

آسمان کی وسعتوں کو چیونٹی کے انڈے سے کمتر بتانا وقوعِ محال کا اشاریہ ہے۔ شاعر اپنے جہاں کی تنگی کا اظہار کررہا ہے جو اتنا تنگ ہے کہ چیونٹی کا انڈا اس سے وسیع تر اور شاعر کے جہاں کا آسمان ہے۔ جہاں کی تنگی کے سامنے انڈے برابر آسمان کی کمتری کو وسیع تر سمجھنا ماورائے حقیقی معنویت کا اظہار بھی ہے۔

دریوزۂ ساماں ہا اے بے سروسامانی
ایجاد گریباں ہا در پردۂ عریانی

''لباس/برہنگی/عریانی'' کی طرح یہاں پردہ عریانی وقوعِ محال ہے۔ شاعر کے خیال میں عریانی کے پردے میں ہم جو طرح طرح کے۔۔۔ ایجاد کرتے ہیں۔ یہ دریوزہ گری کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی بے سروسامانی اور برہنگی کو چھپائیں۔

مجلس شعلہ عذاراں میں جو آجاتا ہوں
شمع ساں میں تہ دامان صبا جاتا ہوں

بصری پیکر کا حامل محاکاتی شعر ہے کہ شمع کو بجھنے سے بچانے کے لیے شاعر اس پر دامن کا سایہ کیے ہوئے ہے لیکن یہ دامن صبا کا ہے اور شمع کو بجھنے سے بچانے کے لیے ہوا کے دامن کی آڑ کی جارہی ہے جو وقوعِ محال ہے۔

یہ حلقۂ خم گیسو ہے راستی آموز
دہان مار سے گویا صبا نکلتی ہے

''خم/راستی'' کے اجماع میں وقوعِ محال کا عمل ہے۔ دوسرے تشبیہی مصرع میں ''مار'' اوپر کے ''حلقۂ خم'' سے صوری مناسبت رکھتا ہے اور بس صبا کا دہان مار سے نکلا راستی آموز نہیں ہے۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

''خزاں کے پا؟ں کا آلود ہونا'' وقوعِ محال ہے۔ پھر ''خزاں/بہار'' کا متضاد ربط واقع نہ ہوسکنے والا وقوعہ ہے۔ دنیا کے عیش کو ''دوامِ کلفتِ خاطر'' کہنا بھی ''عیش/کلفت'' کے تضاد کا ربط ہے جو محال ہے۔

صبح دم وہ جلوہ ریز بے نقابی ہو اگر
رنگ رخسار گل خرشید مہتابی کرے

''خرشید/مہتابی'' کا انطباق وقوع محال ہے۔ خرشید کی رعایت سے بھی مہتابی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ویسے ''مہتابی کرنا'' کے معنی دھوپ سے بچنے کے لیے چہرے پر پنکھے وغیرہ کی آڑ کرنا ہے۔ سورج اور چاند کے فلکی اجرام ہونے کی وجہ سے ماورا کلام ظہورِ محال کی بھی مثال ہے۔

شرم طوفان خزاں رنگ طرب گاہ بہار
ماہتابی بہ کف چشم تماشائی ہے

''خزاں/بہار'' کا اجماع محال ہے۔ ترکیب طوفانِ خزاں رنگ طرب گاہ بہار، کے معنی ہیں: بہار کی مسرتوں کی خزاں جیسی شدت۔

کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا
سامان دعا وحشت وتاثیر دعا ہیچ

''عجز کا مغرور ہونا وقوعِ محال کی مثال ہے۔

ہے عرضِ جوہر خط و خال ہزار عکس
لیکن ہنوز دامن آئینہ پاک ہے

پہلے مصرع کی ترکیب کا ترجمہ ہوگا۔ ہزار بے شمار عکسوں کے خط و خال کی اصلیت کا سبب/اظہار (کرنے والا) اس میں جز ''عرض جوہر'' کا پہلا لفظ دوسرے کی ضد ''عرض'' کی رعایت سے آیا ہے اور دونوں کے ایک ساختیے میں ہونے کی وجہ سے عرض جوہر وقوعِ محال ہے۔

اسد از بس کہ فوج درد وغم سرگرم جولاں ہے
غبار راہ ویرانی ہے ملک دل کی آبادی

ویرانی کی راہ (ویران راہ) کا غبار دل کی آبادی کا سبب ہے۔ ویرانی کو آبادی تصور کرنا وقوعِ محال ہے۔ دل اس لیے ویران ہے کہ درد وغم کی فوج جولانی دکھارہی ہے۔

کرے گر فکر تعمیر خرابی ہائے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثل استخواں بیرون قالب ہا

دل کی خرابی کی تعمیر سے دل کی مزید خرابی مراد ہے۔خرابی کو تعمیر سمجھنا وقوعِ محال ہے۔خرابی کی فکر اگر آسمان نے اپنے ذمے لی ہے تو اس کا کام بہت مضبوط اور پائیدار ہوگا جس طرح بڑی قالب/ اعضا سے باہر نہیں نکلتی اسی طرح خرابی کی اینٹیں تعمیر کے سانچوں میں جم جائے۔

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

جس طرح موجِ آب کی روانی اس کے لیے زنجیر ہوتی ہے اسی طرح فرد کے لیے ہستی کی کشاکش سے آزادی ممکن نہیں ہے۔موج آب ہر وقت اپنے رخ کی طرف رواں رہتی ہے۔اسی کو شاعر نے روانی کی زنجیر کہا ہے۔

شب کہ وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خار کسوت فانوس تھا

یہاں معشوق کو (اپنی) تنہائی سے شرمانے کی محفل کو رونق دینے والا کہا گیا ہے جو اپنی تنہائی سے بھی شرماتا ہو۔معشوق کی شرم کا راز شمع کے فانوس سے نمایاں ہے۔''مجلس/خلوت'' میں تضاد اور وقوعِ محال کا رشتہ ہے۔(شمع کا تار فانوس کے لباس میں کانٹا بن گیا ہے۔جس کی چبھن فانوس سے ظاہر ہے۔)

اسد نے کثرت دل ہائے خلق سے جانا
کہ زلف یار ہے مجموعۂ پریشانی

ترکیب ''مجموعۂ پریشانی'' سے اجماع اور انتشار کے معنی بیک وقت واضح ہو رہے ہیں۔معشوق کی زلف میں شاعر دیکھ رہا ہے کہ خلق کے دلوں کا ہجوم ہے (دل زلف میں اٹکے/الجھے ہوئے ہیں)۔جتنے دل اتنی پریشانی اور یہ سب ایک معشوق کی زلف میں جمع ہیں۔

نشے کے پردے میں ہے محو تماشائے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موج شراب

''پردے میں تماشا'' وقوعِ محال ہے۔شرابی اپنے نشے کے غرور کا تماشا دیکھ رہا ہے اور شراب کی موج کو بھی اپنے بڑھتے رہنے کا غرور ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

فریادی کے نقش کی ایک تصویر کشی کو المیہ کی شوخی قرار دینا وقوعِ محال ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت کی ویرانی ویرانی نہیں، آبادی ہے۔میرا گھر تو دشت جیسا ہے یا اس سے زیادہ ویران ہے۔ویران کو آبادی کہنے میں وقوعِ محال ہے۔اور غالب کے یہاں یہ تصور پہلے بھی گزر چکا ہے خراب آباد غربت میں/غبارِ راہ ویرانی سے/وغیرہ۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

رکاوٹ کی وجہ سے روانی پیدا ہونا وقوعِ محال ہے شاعر کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی رکی ہوئی طبع جب زور پر آتی ہے تو پھر رکتی نہیں۔

غالب نے اپنے خط میں سیمرغ کے حوالے سے کہا ہے کہ اس کا وجود کہنے کو ہے دیکھنے کو نہیں۔یہ موہوم پرندہ سی یعنی تیس پرندوں کے اعضاء کا حامل ہے۔جس طرح ابوالہول کا وجود اور جانداروں کا مجموعہ ہے اسی طرح سیمرغ مختلف پرندوں کے اعضا سے بنا ہے یعنی یہ ایک محسوس مظہر ہے چاہے واقعتاً اسے دیکھا بھی نہ جا سکتا ہو۔اس طرح کے مظاہر غالب کے اشعار میں بھی پائے جاتے ہیں جن کا بیان کلام ماورا میں ظہورِ محال یا مظہری قولِ محال کہلایا جا سکتا ہے۔اس کی چند مثالیں:

بہ سنگ شیشہ توڑوں ساقیا، پیمانۂ پیاں
اگر ابر سیہ مست از سوے کہسار ہو پیدا

''سنگ شیشہ'' کے استعارے میں دو جسم مظاہر سنگ اور شیشہ یکجا ہیں۔ظہورِ محال کی اس مثال کو چھوا یا دیکھا بھی جا سکتا ہے۔(بشرط کہ یہ شاعر کے تخیل کے مطابق کہیں پائے بھی جاتے ہوں) شیشہ/پیمانہ اور سنگ/کہسار میں رعایت کی صنف بھی برتی گئی ہے۔

ذوق بے تابیِ دیدار سے تیرے ہے ہنوز
جوشِ جوہر سے دل آئینہ گلدستۂ خار

''دیدار جوہر آئینہ'' کی مناسبت لفظی کے علاوہ ''گلدستۂ خار'' اس شعر میں ظہورِ محال کی مثال ہے۔گل و خار کے تضاد سے ایسی چیز بنا دی گئی ہے جسے گلدستے کی طرح اٹھایا جا سکتا ہے۔یہ دراصل خار دستہ ہے۔

مرگ شیریں ہو گئی تھی کوہکن کی فکر میں
تھا حریر سنگ سے قطع کفن کی فکر میں

''حریر سنگ'' اس شعر میں ظہورِ محال کا ساختیہ ہے نرم اور سخت اشیا کے ناموں کے میل سے یہ ترکیب بنی ہے ایک چیز اور بھی کفن ان دونوں سے بنایا جانا تھا۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار بادیاں

مہر کو چراغ سے استعارہ کیا ہے۔اگرچہ باد ایک لمسی محسوس مظہر ہے لیکن چراغ کے وجود میں شامل ہو کر ایک بصری شے کو غیر بصری بنا رہی ہے۔حسی عوامل ہونے کی وجہ سے ''چراغ/باد ظہورِ محال کی مثال بن گئی ہیں۔

فکر سخن بہانۂ پرواز خامشی
دود چراغ سرمۂ آواز ہے مجھے

''دود/آواز'' کے انضمام سے ظہورِ محال کی یہ تشکیل ہوئی ہے۔''خامشی دود کی صنف ہے سرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔دود اور سرمہ کی مشابہت اور مناسبت سبھی یہاں متوجہ کن معنیے ہیں۔

از خود گزشتگی میں خموشی پہ حرف ہے
موج غبار سرمہ ہوئی ہے صدا مجھے

خموشی/موج غبار (یعنی دھواں) سرمہ اور صدا اوپر کے شعر کی طرح اس شعر میں بھی ظہورِ محال کے عوامل ہیں۔

عاشق نقاب جلوۂ جانانہ چاہیے
فانوس شمع کو پر پروانہ چاہیے

عاشق جس طرح جلوۂ جانانہ کے لیے نقاب بن جاتا ہے۔ پر پرواز بھی اسی طرح شمع کے لیے فانوس کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ ''پر'' کے فانوس بن جانے میں ظہورِ محال کی مثال دیکھی جاسکتی ہے۔

بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار
نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

اوپر کے شعر کی طرح اس شعر میں بھی بال و پر کو در و دیوار کا استعارہ کیا اور ظہورِ محال کی معنویت پیدا کی ہے۔

سحر گہ باغ میں وہ حیرت گلزار ہو پیدا
اڑے رنگ گل اور آئینہ دیوار ہو پیدا

''سنگ شیشہ'' کی طرح یہاں ''آئینہ دیوار'' ظہورِ محال کا ساختیہ ہے۔ ترکیب میں دونوں لفظ ایک دوسرے سے تضاد رکھتے اور ایک ہی پیکر میں پائے جاتے ہیں۔

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ
ورنہ ہے چرخ وزمیں یک ورق گرداندہ

ورق کے دو صفحے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے (باہم پیوستہ) ہوتے ہیں۔ یہاں ''چرخ وزمیں'' کے مروجہ تضاد کے ظہورِ محال نے اس طرح کا ورق بنا دیا ہے۔ ''صفحہ/سبق'' میں مناسبت ہے۔

کلام ماورا یعنی قولِ محال کی بے شمار مثالیں غالب کے کلام میں موجود ہیں۔ اسی صنف کو غالب نے محض لفظی صفت کے طور پر نہیں برتا ہے بلکہ اصلاً اس کے معنوی صنعت ہونے کے سبب غالب نے معنی آفرینی کے جوہر بھی خوب دکھائے ہیں۔ تضاد، طنز، استبعاد، ایہام، ایہام وغیرہ فنی اظہار کے سارے طریق یہاں قولِ محال کے روپ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ تو ناقدین نے اشارہ کیا ہے کہ غالب کا مخصوص رنگ قولِ محال کے معنوی ساختیوں سے جھلکتا ہے لیکن زبان کے استعمال کی ایک مخصوص سج ہونے کی وجہ سے قولِ محال غالب کے شعری اظہار و اسلوب کا ایک مخصوص رنگ ضرور سامنے لاتا ہے (اگرچہ یہ رنگ صرف غالب کا مخصوص رنگ نہیں ہے۔

احساسِ جرم

میرے لڑکپن کے زمانے میں ایک دن موسم سرما کی سہ پہر کے وقت میرے بابا مجھے شمالی کمرے میں لے گئے نہ جانے کیوں وہ بہت اداس تھے۔ میں بھی اداس ہو گیا۔ وہ مغربی کھڑکی کے برابر کھڑے ہو کر مجھ سے کہنے لگے کہ تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔ میں نے پوچھا:

''بتایئے بابا! کیا وعدہ؟''

انہوں نے کہا ''یہ کہ تم بڑے ہو کر میری کتابیں ضرور چھپواؤ گے''

میں نے کہا ''بابا میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب بڑا ہو جاؤں گا تو آپ کی کتابیں ضرور چھپواؤں گا''

مگر میں بابا سے کیا ہوا وعدہ پورا نہ کر سکا، میں بڑا نہ ہو سکا، اور میرے بابا کی تمام تصنیفات ضائع ہو گئیں۔ بس چند متفرق مسودے رہ گئے۔

یہی وہ احساس جرم ہے جس کے سبب میں اپنے کلام کی اشاعت سے گریزاں ہی نہیں متنفر رہا ہوں۔

دن میں بہت کم ایسا وقت گذرتا ہے جب مجھے اپنی شاعری پسند آتی ہو۔ میری تخلیقی زندگی کا زیادہ حصہ اپنے انکار میں گذرا ہے۔

جون ایلیا

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں

کہنے کو یوں تو بس وہ فقط ایک فرد تھا
اس کو مگر وطن کی حفاظت کا درد تھا
دشمن سے اُس نے قوم کو محفوظ کر دیا
''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا''

منتہائے کمال

عطائے ربِّ جلیل تھا ایک گوہرِ بے مثال تھا وہ
جو کام کر کے دکھایا اُس نے عروجِ فکر و خیال تھا وہ
نہ مانگا اُس کا صلہ کسی سے نہ داد اہلِ وطن سے چاہی
عجب سا بے لوث شخص تھا اور منتہائے کمال تھا وہ

حافظ محمد احمد

(راولپنڈی)

مجلسِ چہارسو

سفر وسیلۂ ظفر کا محاورہ کئی بار مشاہدے میں آیا۔ عملی زندگی میں سامنا ہوا تو اپنی خوشی پر قابو پانا بس سے باہر تھا۔ خاندانی مراسم اور قرابت کے باوجود ہم پاکستان کے ایک ایسے علمی خزانے سے بے خبر تھے جس کی خوشبو سے ایک زمانہ معطر ہو چکا ہے۔ بقول واحد پریمی:

کسی کو بے سبب شہرت نہیں ملتی ہے اے واحد
انہیں کے نام ہیں دنیا میں جس کے کام اچھے ہیں

جی ہاں! ہمارا اشارہ ڈاکٹر ماہ نظیر ریاض کی جانب ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی بلند و بالا شخصیت اور بے پناہ علم کو لفظوں میں بیان کرنا ہمارے لیے ممکن نہ ہے۔ زیرِ نظر گفتگو کی ہر ہر سطر اور ہر ہر لفظ سے ڈاکٹر صاحبہ کے تبحرِ علمی کی گواہی دے رہا ہے جس پر آپ کی مہر سند کا کام دے سکتی ہے!!!

عطیہ سکندر علی

☆ گفتگو کی ابتدا خاندانی پس منظر سے کرنا اسی لیے ضروری ہے کہ آپ اور آپ کے بزرگوں کی علم دوستی سے آگاہی حاصل کی جا سکے؟

☆☆ یہ بات میرے لیے باعث فخر ہے کہ میرا تعلق ایک ایسے مذہبی گھرانے سے ہے جو درس و تدریس میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔ میرے پردادا مولانا محمد حسین ہزاروی ایک عرصہ تک تدریس فرماتے رہے۔ ان کے حلقۂ درس میں ہزارہ، کشمیر، کابل، سمرقند اور بخارا کے طلباء شریک ہوا کرتے تھے۔ اس وقت کے انگریز ڈپٹی کمشنر ہزارہ لارڈ ایبٹ نے (جن کے نام سے ایبٹ آباد موسوم ہوا) انہیں دیگر پرکشش ترغیبات کے علاوہ عہدہ قضا (جج) کی پیشکش کی جسے انہوں نے قبول کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ کہیں اس میں ضمیر فروشی کا عنصر شامل نہ ہو جائے کیونکہ اس حیثیت میں برٹش گورنمنٹ ان سے اپنی حمایت کی توقع رکھتی تھی۔ (حوالہ مشاہیر علماء سرحد، مرتبہ ڈاکٹر قاری فیوض الرحمٰن، ۱۹۸۸ء)

اسی طرح میرے دادا مولانا عبدالرحمٰن اور میرے والد محمد یعقوب بھی بڑے عالم تھے جنہیں عربی، فارسی اور مذہبی علوم پر دسترس حاصل تھی۔

☆ آپ کی علمی اُٹھان کے دنوں میں نوجوان لڑکے، لڑکیاں انجینئر، ڈاکٹر یا وکیل بننے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ نفسیات جیسے پیچیدہ علم کا انتخاب مشکل فیصلہ نہیں تھا؟

☆☆ میرا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے جہاں خواتین کے لیے گھر سے باہر نکلنا ناممکن ہوتا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد تعلیم جاری رکھنا چاہتی تھی لیکن میرے شہر مانسہرہ میں اس وقت لڑکیوں کا کوئی کالج نہیں تھا اور قریبی شہر ایبٹ آباد کے گرلز کالج میں صرف آرٹس کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ چنانچہ میں نے میٹرک کے بعد چار سال ہاسٹل میں رہ کر بی۔اے تک تعلیم حاصل کی بعد ازاں پشاور یونیورسٹی کے کالج آف ایجوکیشن سے بی۔ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ اسی ٹریننگ کے دوران مجھے تعلیمی نفسیات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اسی سال یعنی ۱۹۶۴ء میں پشاور یونیورسٹی میں شعبہ نفسیات قائم ہوا تھا۔ میں نے اپنے نفسیات کے پروفیسر عبدالحی علوی صاحب کی مشاورت سے نفسیات میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۶۶ء میں نمایاں پوزیشن میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا جس کی بنا پر مجھے یونیورسٹی کی طرف سے گولڈ میڈل اور صدرِ پاکستان کی طرف سے بھی ایوارڈ دیا گیا۔

☆ ۱۹۶۶ء میں ایم۔اے نفسیات فرسٹ پوزیشن فرسٹ کلاس مع گولڈ میڈل حاصل کرنے کے بعد آپ کے احساسات و جذبات اور اہلِ خانہ کا ردِّعمل جاننا ضروری ہو جاتا ہے؟

☆☆ ایم۔اے نفسیات کے نتیجہ کے اعلان سے تقریباً دو ہفتہ قبل میری شادی ہو گئی تھی۔ ریڈیو پر جب نتائج کے اعلان کے حوالہ سے میری امتیازی حیثیت میں کامیابی کا اعلان ہوا تو میرے شوہر نے سب سے پہلے نہایت خوشی اور گرمجوشی کے ساتھ یہ مژدہ مجھے سنایا۔ فرطِ جذبات سے ان کی اور دیگر اہلِ خانہ کی خوشی دیدنی تھی اور میرے لیے بھی یہ لمحات بہت خوش کن تھے کیونکہ میں نے محنت، لگن اور شوق سے یہ مقام حاصل کیا تھا۔ تمام خاندان اور دیگر احباب کی طرف سے کئی دن تک مبارک باد کے پیغامات وصول ہوتے رہے اور میرے لیے بلاشبہ یہ یادگار تاریخی دن تھے۔

☆ کچھ تفصیل انعامات، اعزازات کی ہمارے قارئین سے شیئر کیجیے؟

☆☆ ایم۔اے نفسیات میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لینے کے علاوہ دیگر شعبہ جات عمرانیات (Humanities Group) میں بھی مجموعی طور پر اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس لیے یونیورسٹی گولڈ میڈل کے علاوہ مجھے صدرِ پاکستان کی طرف سے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

بعد ازاں میں نے تدریس کے شعبہ میں قدم رکھا اور پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات میں سروس کا آغاز کیا۔ الحمدللہ اس حیثیت میں بھی مجھے بہترین کارکردگی پر صدارتی انعام سے نوازا گیا۔ اس مقابلۂ حسن کارکردگی میں پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کے تمام شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے اساتذہ کے لیے یہ صرف ایک ہی ایوارڈ ''اعزازِ کمال'' مخصوص ہے جو ۲۰۰۲ء میں صدر پاکستان کی طرف سے مجھے عطا کیا گیا۔

اس کے بعد پشاور یونیورسٹی نے میری کارکردگی کی بنیاد پر مجھے

(Meritorious Professor) میریٹوریئس پروفیسر منتخب کیا اور Highest Pay Scale یعنی گریڈ 21 میں ترقی دے دی گئی۔ اس وقت پروفیسر کا سکیل 20 تھا۔

☆ تعلیم سے فراغت کے بعد پہلی عملی مصروفیات کیا رہیں؟

☆☆ ایم۔اے کے امتحان کے دو ماہ بعد ۱۴۔اگست ۱۹۶۶ء کو میری شادی میرے خالہ زاد ڈاکٹر ریاض احمد سے ہوگئی۔ دو سال تک میں نے خاتون خانہ کے فرائض انجام دیے اس کے بعد اس وقت کے وائس چانسلر جناب چودھری محمد علی صاحب اور شعبۂ نفسیات کے چیئرمین شہاب الدین مغنی صاحب (S.M. Mughni) کے اصرار پر یکم اکتوبر ۱۹۶۸ء شعبۂ نفسیات پشاور یونیورسٹی میں بطور لیکچرر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ میرے تعلیمی ریکارڈ کی بنا پر انہوں نے مجھے تدریس کے لیے منتخب کیا۔ ۱۹۹۶ء میں بطور پروفیسر ترقی پائی۔ ۲۰۰۳ء میں Meritorious Professor کے عہدہ پر تعیناتی کے بعد ریٹائر ہوئی۔ ۱۹۶۸ء سے ۲۰۰۳ء کے درمیان سات سال تک بطور چیئرپرسن شعبہ نفسیات خدمات انجام دیں۔ اسی عرصہ میں ۱۹۷۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی سے نفسیات میں پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی خاتون کا اعزاز حاصل کیا۔

جنوری ۱۹۹۷ء میں سری لنکا میں ایک ورکشاپ منعقد ہوئی جس کا موضوع تھا ساؤتھ ایشین ویمن اِن ہائر ایجوکیشن (south Asian Women in Higher Education) ہائر ایجوکیشن کمیشن نے پاکستان سے چار خواتین کا انتخاب کیا۔ میں نے کلیدی کردار ادا کیا اور کنٹری پیپر پیش کیا۔

☆ اب تک آپ کن کن اداروں میں کس حیثیت سے فرائض انجام دے چکی ہیں اور سب سے خوشگوار تجربہ کس ادارے کی یادوں سے جڑا ہے؟

☆☆ میں نے تدریسی کیریئر کا آغاز ۱۹۶۸ء میں پشاور یونیورسٹی سے کیا اور ۳۵ سال تک اس یونیورسٹی سے منسلک رہی۔ اسی دوران ۱۹۹۹ء میں ڈیپوٹیشن پر میری تعیناتی قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے قومی ادارہ نفسیات ''نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائیکالوجی'' (NIP) میں تین سال کے لیے بطور پروفیسر عمل میں آئی۔ یہاں دیگر تدریسی مصروفیات کے علاوہ تین طلباء کو پی۔ایچ۔ڈی اور چار طلبا کو اپنی نگرانی میں ایم فل مکمل کروایا۔ اسی دوران تعلیمی اور تحقیقی کارکردگی کی بنیاد پر تعلیمی میدان میں سب سے اعلیٰ اعزاز یعنی ''اعزازِ کمال'' حاصل کیا جو ملک بھر کی تمام یونیورسٹیوں کے پروفیسرز کے لیے واحد صدارتی انعام تھا۔ اسی دوران آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی درخواست پر دو عدد ٹیکسٹ بکس لکھیں جو بالترتیب ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئیں۔ جو اب پاکستان کے مختلف کالجز میں پڑھائی جارہی ہیں۔

پشاور میں فرنٹیئر ویمن یونیورسٹی ۲۰۰۵ء میں قائم ہوئی جو کے پی کے (KPK) کی پہلی ویمن یونیورسٹی ہے۔ مارچ ۲۰۰۶ء میں بطور ڈین آف سوشل سائنسز اس یونیورسٹی میں مجھے تعینات کیا گیا اور فروری ۲۰۱۳ء تک میں اسی عہدہ پر فائز رہی۔ بعد میں یونیورسٹی کا نام تبدیل کر کے ''شہید بے نظیر بھٹو ویمن یونیورسٹی'' رکھ دیا گیا۔ ۲۰۰۷ء میں اس یونیورسٹی کے پہلے ریسرچ جرنل ''FWU جرنل آف سوشل سائنسز'' کا بطور ایڈیٹر اجرا کیا اور اس کا اعلیٰ معیار قائم کرنے کے لیے بے حد محنت کی یہاں تک کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) نے اسے اپنے Recognised جرنلز کی فہرست میں شامل کر لیا اور آج کل ''Y'' کیٹیگری میں شامل ہے۔ ۲۰۱۰ء میں اٹلی میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں مقالہ پیش کیا جس کا موضوع تھا ''والدین اور بچوں کے باہمی تعلقات اور ان کے بچوں کی شخصیت پر اثرات'' میں نے ۲۰۰۶ء کے دوران پوسٹ گریجویٹ سٹوڈنٹس کے لیے کتاب Test Construction: Development and Standardization of psycologist Tests in Pakistan لکھی جسے HEC نے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا۔

اس کتاب کو قومی سطح پر اساتذہ اور طلبا میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۷ء میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد نے Iqbal International Institue for Research and Dialogue (IRD) کے تعاون سے شائع کیا۔

دورانِ ملازمت (۲۰۱۳۔۱۹۶۸ء) ۸۵ عدد مقالہ (Research Papers) لکھے جو قومی اور بین الاقوامی تحقیقی جرائد (Research Gournals) میں شائع ہوئے۔ ان میں امریکہ، سپین، انڈیا اور پاکستان کے جرائد شامل ہیں۔ علاوہ ازیں پاکستان میں تعلیمی نظام اور خصوصی تعلیم (Special Education) کے موضوع پر امریکہ میں شامل ہونے والی کتابوں میں Chapters لکھے۔ دیگر اعزازات کے علاوہ ۲۰۰۹ء میں International Society for interpersonal Acceptance-Rejection , North Carolina, USA نے دو سال کے لیے (۲۰۱۲۔۲۰۱۰) ساؤتھ ایشیا کے لیے اپنا ریجنل Representative منتخب کیا۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن آف پاکستان نے ۲۰۰۶ء میں Eminent Educationist and Researcher منتخب کیا۔ ۱۹۹۰ء سے ۲۰۱۸ء تک میری نگرانی میں ۱۶ پی ایچ ڈی اور ۱۱۸ ایم فل کے طلباء نے ڈگریاں حاصل کیں۔

گو کہ تینوں یونیورسٹیوں میں میرا تجربہ نہایت خوشگوار اور اطمینان بخش رہا لیکن خصوصی طور پر قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد (NIP) سے انتہائی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں کیونکہ میں نے وہاں سروس کے دوران پاکستان کا اعلیٰ ترین تعلیمی اعزاز (اعزازِ کمال) حاصل کیا۔ علاوہ ازیں اسی عرصہ کے دوران کالجوں اور یونیوسٹیوں کے لیے نصابی کتب لکھیں۔ مزید براں بین الاقوامی جرائد میں تحقیقی مقالے شائع ہوئے اور اگست ۲۰۰۰ء میں امریکہ واشنگٹن ڈی سی میں بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی اور اپنا تحقیقی مقالہ '' Personality Profile of Men and Women Exectives: Myth and Reality پیش کیا۔

☆ ایک تاثر عوام کے ذہنوں میں غلط طور پر گھر کر گیا ہے کہ نفسیات کے طالب علم کسی نہ کسی طور نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں؟

☆☆ اس سوال کا جواب آپ نے خود ہی دے دیا ہے کہ یہ مفروضہ غلط ہے۔ نفسیات کے علم سے Self understanding حاصل ہوتی ہے اس لیے ماہرین نفسیات کا نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار ہونے کے امکانات نسبتاً بہت کم ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے حالات واقعات اور ماحول کے اثرات کا بخوبی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ان میں نہ صرف اپنے آپ کو سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے بلکہ دوسرے لوگوں کے رویے بھی بخوبی سمجھ کر ان سے بہتر تعلقات استوار کر سکتے ہیں اور سماجی مسائل سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

☆ پاکستان میں ماہرِ نفسیات کی ذاتی پریکٹس کا کتنا سکوپ ہے اور آپ نے کبھی ذاتی کلینک کی بابت کیوں نہیں سوچا؟

☆☆ پاکستان میں ماہرینِ نفسیات کے لیے ذاتی پریکٹس کا وسیع سکوپ ہے بالخصوص فیملی کونسلنگ، ایجوکیشنل اینڈ ووکیشنل کونسلنگ اور چائلڈ سائیکالوجی کے شعبوں میں ماہرینِ نفسیات کی راہ نمائی سے بہترین نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ میں نے ذاتی پریکٹس شروع کرنے کا کبھی ارادہ نہیں کیا۔ اس کی وجوہات میں سرِفہرست جائنٹ فیملی سسٹم۔ یونیورسٹی لیول میں تدریس اور اپنے لیے اعلیٰ تعلیم (Ph.D) کا حصول اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت نمایاں وجوہات تھیں۔ الحمدللہ سسرال والوں کے ساتھ باہمی تعلقات ہمیشہ انتہائی خوشگوار رہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تعلقات استوار کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ مزید برآں ایم اے پاس کرنے کے دو سال بعد طلباء کو پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر پڑھانا کافی محنت طلب کام تھا لیکن محنت اور تندہی سے میں نے بفضلِ خدا ہمیشہ طلباء اور رفقاء کار سے داد وصول کی۔

۱۹۷۳ء میں پشاور یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی پروگرام کا آغاز ہوا اور میں نے ذوقِ تعلیم کی تسکین کے لیے پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۷۷ء میں کامیابی سے ہمکنار ہو گئی۔ اکثر ورکنگ ویمن اپنے بچوں اور فیملی کو پوری توجہ نہیں دے سکتیں لیکن میں نے اپنے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی۔ ماشاءاللہ ہمارا بڑا بیٹا فیصل ریاض امریکہ میں ایک نامور ڈاکٹر ہے جس کا شعبہ سپیشلائزیشن (Neurophysiological (Specialization Monitoring in High risk Surgeries ہے۔

HEC نے اس شعبہ کو پاکستان میں متعارف کرانے کے لیے اسے خصوصی طور پر امریکہ سے مدعو کیا تاکہ پاکستان کے بڑے ہسپتالوں میں ڈاکٹروں خصوصاً نیوروسرجنز کو خطرناک آپریشنز کے دوران اس نئی ٹیکنیک کے بارے میں عملی طور پر روشناس کیا جا سکے جس کے نتیجے کے طور پر انتہائی خطرناک آپریشنز میں پیچیدگیوں (Complications) مثلاً مفلوج ہو جانا یا موت واقع ہو جانے کا خطرہ کئی گنا کم ہو کر آپریشن کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حکومتی اور متعلقہ ہسپتال کی انتظامیہ کی دعوت پر مختلف ہسپتالوں میں ورکشاپس اور آپریشن تھیٹرز میں عملی تربیت (Demonstration) دی مثلاً سی ایم ایچ راولپنڈی، شفا انٹرنیشنل ہسپتال اسلام آباد، میڈیکل کمپلیکس ایبٹ آباد (جہاں ایک مریضہ کو دماغ کی ایک بڑی رسولی کے آپریشن کے دوران بینائی چلے جانے کے واضح خطرہ تھا) رحمان میڈیکل انسٹی ٹیوٹ (RMI) پشاور اور گھر کی آرتھوپیڈک ہسپتال لاہور۔

ڈاکٹر فیصل ریاض ٹیکساس میں اسی موضوع پر کورسز کی تدریس کر رہے ہیں اور تین کتابیں اسّی (۸۰) سے زیادہ ریسرچ پیپرز شائع کر چکے ہیں۔ وہ امریکن سوسائٹی آف انٹرآپریٹو نیورفزیولاجیکل سوسائٹی (IONM) کے گذشتہ سال کے منتخب صدر رہ چکے ہیں۔

دوسرا بیٹا حسن ریاض ایرونائٹیکل انجینئر ہے۔ وہ پی۔اے۔ایف (PAF) سے گذشتہ سال بطور ایئر کموڈور ریٹائر ہوا اور اپنی کارکردگی پر دوران ملازمت اعزازات حاصل کیے جن میں ایئر چیف کی طرف سے تعریفی سند (Commendaton Certificate) اور صدرِ پاکستان کی جانب سے تمغہ امتیاز (ملٹری) اور شنگھائی کارپوریشن آرگنائزیشن کی طرف سے کوآپریشن میڈل شامل ہیں۔

چھوٹا بیٹا فواد ریاض انفارمیشن ٹیکنالوجی SAP یعنی Systems Application Products کا سپیشلسٹ ہے اور امریکہ میں مشہور کمپنی IBM کا سینئر کنسلٹنٹ رہ چکا ہے اس کے علاوہ کینیڈا، آئرلینڈ، فلپائن اور چین میں مختلف پراجیکٹس پر کام کر چکا ہے اور آج کل گوجرانوالہ میں GEPCO میں ایک پراجیکٹ پر کام کر رہا ہے۔

☆ سائیکالوجسٹ اور سائیکاٹرسٹ میں کیا فرق ہے اور ان کے مریضوں میں تفریق کس طرح کی جاتی ہے؟

☆☆ سائیکالوجسٹ اور سائیکاٹرسٹ دونوں ہی ذہنی امراض میں مبتلا مریضوں کا علاج کرتے ہیں لیکن ان کی تعلیم اور طریقہ علاج بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ سائیکاٹرسٹ میڈیکل ڈاکٹر ہوتے ہیں اور ان کی سپیشل ٹریننگ اور تعلیم نفسیاتی امراض کے بارے میں ہوتی ہے چنانچہ وہ علاج بذریعہ ادویات کرتے ہیں جبکہ ماہرین نفسیات نفسیاتی علاج کرتے ہیں اور مختلف Therapeutic Technique استعمال کر کے مریضوں کی سوچ، ادراک اور زندگی کے بارے میں مخصوص اندازِ فکر میں نمایاں تبدیلی لاتے ہیں۔ جو مریض اس طریقۂ علاج سے شفایاب ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے نارمل زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں بار بار اپنے Theropist کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

☆ نفسیاتی شفا خانوں سے صحت یاب ہونے والے مریضوں کا تناسب اور صحت مند زندگی کا دورانیہ کتنا ہوا کرتا ہے؟

☆☆ نفسیاتی مریضوں کے بارے میں کوئی ایسا باقاعدہ سروے تا حال نہیں ہوا جس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ نفسیاتی شفاخانوں سے صحت یاب ہونے والے مریضوں کا تناسب کیا ہے اور ان کی صحت مند زندگی کا دورانیہ کتنا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں بدقسمتی سے عوام میں یہ شعور موجود نہیں کہ ذہنی مریض بھی دوسرے

مریضوں کی طرح قابلِ علاج ہیں۔ بعض لوگ تو ذہنی امراض کو آسیب کا سایہ اور جادو کا اثر سمجھتے ہیں اس لیے علاج کے لیے ماہرین نفسیات کے بجائے جعلی پیروں فقیروں کے پاس جاتے ہیں چنانچہ رفتہ رفتہ مریضوں کی حالت مزید تشویشناک ہو جاتی ہے کچھ لوگ جو نفسیات دانوں سے علاج کرواتے ہیں وہ بھی پوری طرح صحت یابی کا انتظار نہیں کرتے اور علاج منقطع کر دیتے ہیں۔ سماجی رویے اور اعتقادات پھر سے اثر انداز ہونے لگتے ہیں اور مریض پھر پرانی حالت پر آ جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کی صحت کا دورانیہ معلوم کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔

☆ نفسیاتی امراض کا معاشرے سے کس قدر تعلق ہے اور لوگوں کو اس کے بارے کس طرح اَپ ٹو ڈیٹ کیا جاسکتا ہے؟

☆☆ معاشرہ میں لوگوں میں نفسیاتی مسائل کے بارے میں آگہی پیدا کرنے کی انتہائی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کو یہ باور کرا جائے کہ نفسیاتی بیماریاں بھی دیگر بیماریوں کی طرح قابلِ علاج ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تربیت یافتہ ماہرین نفسیات کی خدمات سے استفادہ حاصل کیا جائے۔ بعض دیگر معاشروں کی طرح ہمارے ہاں بھی نفسیاتی امراض کو توہمات سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اکثر لوگ انہیں کالا جادو، جن، بھوت، بدروح اور آسیب کا سایہ سمجھتے ہیں اور وہ اپنے علاج کے لیے جعلی پیروں، فقیروں اور غیر مستند ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کے نتیجے میں مرض میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے اور معاشرہ میں ذہنی مریضوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

اس حوالہ سے عوام الناس کو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ آگہی پہنچائی جاسکتی ہے۔ اس معاملہ میں سب سے اہم کردار مساجد کے خطیب حضرات ادا کر سکتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات سے محکمہ صحت اور سوشل ویلفیئر اس حوالہ سے مختصر طور پر معلوماتی کتابچہ یا ایک یا دو صفحہ کا پمفلٹ لکھوا کر جمعہ کے خطبات میں دو تین منٹ کی گفتگو میں عوام کے ذہن نشین کروا سکتے ہیں۔

☆ تیسری دنیا بالخصوص پاکستان میں نفسیاتی مریضوں کی اُلجھن کا پتہ لگانے اور اُس کا سدِ باب کرنے کے بجائے طرح طرح کی نشہ آور ادویات دے کر مریض ایک طرح سے نشے کا عادی بنا دیا جاتا ہے؟

☆☆ جی ہاں بعض ڈاکٹرز مریض کو وقتی طور پر پُرسکون بنانے کے لیے سکون آور ادویات تجویز کرتے ہیں لیکن مریض اپنی کم علمی کی وجہ سے ان ادویات کا غیر ضروری اور مسلسل استعمال کر کے اپنے آپ کو عادی بنا لیتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کیمسٹس ایسی ادویات کا اجراء بغیر ڈاکٹر کے نسخہ کے نہ کریں۔

☆ ہیلپ سینٹر کے نام پر بھی نفسیاتی مریضوں کے علاج کے بجائے اُن کے بگاڑ پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے تاکہ آمدنی کا مستقل سلسلہ قائم رہے؟

☆☆ جی ہاں بعض لوگ محض کاروبار چمکانے کے لیے مختلف ناموں سے ایسے ہیلپ سنٹرز قائم کیے ہوئے ہیں جہاں نفسیاتی مریضوں کے علاج کے بجائے پیسے کمانے کے مختلف طریقوں پر توجہ دی جاتی ہے۔

☆ معاشرے کے وہ کون سے سیکٹر ہیں جہاں نفسیات کا عمل دخل زیادہ ہوا کرتا ہے؟

☆☆ معاشرہ کے وہ افراد جو ذہنی دباؤ کا شکار ہوتے ہیں ان کے نفسیاتی مسائل بالعموم زیادہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ہنگامی حالات (Crises)، وبائی امراض، طویل اوقاتِ کار اور ناکافی مراعات چند ایسی وجوہات ہیں جو ذہنی دباؤ کا سبب بنتے ہیں۔ فرنٹ لائن ورکرز کو اکثر اوقات ایسے ہی ذہنی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان لوگوں میں ڈپریشن، چڑچڑا پن زیادہ ہوتا ہے۔

☆ کچھ رہنمائی سماجی رشتوں اور رشتوں میں نفسیات کے عمل دخل اور بہتر عمل کی بابت بھی فرمایئے۔

☆☆ سماجی زندگی میں ہمارا خاندان بنیادی کردار ادا کرتا ہے پورے خاندان کی کامیاب اور پرسکون زندگی کے لیے ازدواجی تعلقات کے ساتھ ساتھ والدین اور بچوں کے باہمی تعلقات انتہائی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جب ایک شوہر اور بیوی نئے رشتہ میں داخل ہوتے ہیں تو عام طور پر نہ صرف وہ بلکہ سسرال والے بھی بہت خوش ہوتے ہیں۔ تاہم بیشتر معاملات میں پُرامن اور خوشگوار ماحول آہستہ آہستہ رنجشوں کا شکار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اگر ہم اس صورتِ حال کا تجزیہ کریں تو ایسا لگتا ہے کہ نئے ماحول کی تیاری کا فقدان اس تنازعہ کی اصل وجہ ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ دولہا دلہن کے والدین شادی کی دیگر تیاریوں کے ساتھ ساتھ اپنے بیٹے/ بیٹی کو نئے ماحول میں ایڈجسٹمنٹ کی تربیت دیں جس کا پہلا اصول رواداری اور برداشت کے علاوہ اپنی انا کو پسِ پشت ڈال کر ایک دوسرے کی خوشی کی خاطر لچک دار رویہ اپنانا ضروری ہے اس طرح بہت سے مسائل کامیابی سے حل ہو سکتے ہیں۔

ایسے ماحول میں پرورش پانے والے بچے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ ان کی تربیت بہترین طریقہ سے ہوتی ہے اور وہ کامیاب زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

بہرحال جہاں کوئی رنجش گھر کے ماحول کو خراب کر دے تو ضروری ہے کہ کسی ماہرِ نفسیات کی خدمات حاصل کی جائیں تاکہ ماحول کو نہ صرف مزید کشیدگی سے بچایا جائے بلکہ خوشگوار تبدیلی لائی جاسکے۔ ایسے حالات میں ہمیں قرآن اور سنت سے ضرور راہ نمائی حاصل کرنی چاہیے جو ہمارے معاشرتی تعلقات بہتر بنانے کا اہم ذریعہ ہے۔

☆ جسمانی طور پر ایک صحت مند انسان کو ذہنی طور پر صحت مند رہنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنا ضروری ہیں؟

☆☆ جسمانی طور پر ایک صحت مند انسان کو زندگی میں دو اصول اپنانے ضروری ہیں۔ پہلا اصول یہ ہے کہ اسے اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کا بخوبی ادراک ہو اور اس پر وہ فخر محسوس کرے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ایک اچھا مصور ہو تو اُسے اپنی اس صلاحیت پر ناز کرنا چاہیے نہ کہ کسی اچھے شاعر، ادیب یا نامور کرکٹر کے ساتھ موازانہ کر کے اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ اپنی کمزوریوں کے بارے میں آگہی رکھتا ہو اور کسی قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہوئے بغیر ان کو دور کرنے کی

حتی الوسیع کوشش کرے۔ چنانچہ اپنی خوبیوں اور خامیوں کا صحیح ادراک ایک صحت مند انسان کے لیے ذہنی طور پر بھی صحت مند رہنے کے لیے ضروری ہے۔

☆ ایک صحت مند معاشرے میں نفسیاتی مریضوں کا تناسب کتنا ہوا کرتا ہے اور اُس کو مناسب سطح پر رکھنے کے لیے معاشرے کی کیا ذمہ داریاں ہوا کرتی ہیں؟

☆☆ نفسیاتی امراض ایک عالمی مسئلہ ہے۔ WHO کے مطابق دنیا بھر میں تقریباً تیس کروڑ لوگ جو دنیا کی کل آبادی کا 4.4 فیصد ہیں ڈیپریشن میں مبتلا ہیں۔ ان میں ۴۹ فیصد لوگ کم آمدنی والے ممالک سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ امیر ممالک میں یہ شرح ۸۳ فیصد ہے (۲۰۱۸ء) ذہنی امراض کی وجوہات سماجی، سیاسی، اقتصادی عوامل ہیں جن میں سرفہرست وسائل سے محرومی، شرح خواندگی کا کم تناسب، بے روزگاری، تشدد، تعصب، شراب نوشی اور منشیات کا بے دریغ استعمال اور خواتین پر تشدد شامل ہے۔ اس کے نتیجہ میں پوری سوسائٹی کی ذہنی صحت متاثر ہوتی ہے۔ ذہنی صحت کی یہ شرح کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مندرجہ بالا وجوہات کو ممکن حد تک کم کیا جائے۔

☆ زندگی کے کئی اہم شعبوں میں چند شعبوں کے علاوہ نفسیاتی ٹیسٹ کو ضروری نہیں گردانا جاتا۔ آپ کے خیال میں دیگر ٹیسٹ کے علاوہ نفسیاتی ٹیسٹ بھی لازمی نہیں ہونا چاہیے؟

☆☆ موجودہ دور میں فیڈرل اور پراونشل پبلک سروس کمیشن اور مسلح افواج دو بڑے ادارے ہیں جہاں امیدواروں کے انتخاب کے لیے نفسیاتی ٹیسٹ لازمی طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ درحقیقت ہر شعبہ کی کارکردگی کا معیار بلند رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر اسامی کے لیے مخصوص ذہنی صلاحیتوں اور رجحانات کے امیدواروں کا انتخاب کیا جائے تاکہ موزوں ترین افراد کا انتخاب کیا جا سکے۔ مثلاً ایسے ادارے جس طرح انڈسٹری، فنانس، کامرس، مینجمنٹ، تعلیم، صحت اور دیگر تمام ادارے جہاں بہترین کارکردگی کے لیے مخصوص صلاحیتیں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں وہاں امیدواروں کا انتخاب بغیر نفسیاتی ٹیسٹ استعمال کیے تسلی بخش نہیں ٹھہرایا جا سکتا اور کارکردگی کے نتائج کا بہترین معیار حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

☆ تعلیمی نصاب میں بھی نفسیات کا مضمون ہماری ترجیحات میں پیچھے ہونے کے اسباب کیا ہیں اور آپ اس حوالے سے کیا تجاویز دینا پسند کریں گی؟

☆☆ آج کے جدید دور میں نفسیات کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے۔ نفسیات روح کے مطالعہ سے شروع ہوئی۔ ذہن، شعور اور لاشعور سے ہوتی ہوئی کردار تک پہنچی اور اب کردار یت کونئی جہتوں کے حوالہ سے سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جدید تحقیقات کے نتیجہ میں نئے رجحانات سامنے آ رہے ہیں۔ دیگر علوم کی نسبت نفسیات ایک جدید سائنس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تعلیمی اداروں میں ابھی تک شاملِ نصاب نہیں ہے۔

اکثر اوقات میڈیا میں ماہرینِ نفسیات کو نفسیاتی امراض اور جرائم کے حوالہ سے پیش کیا جاتا ہے جو نفسیات کے صرف ایک شعبہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ درحقیقت نفسیات زندگی کے ہر پہلو کے ساتھ منسلک ہے۔ مثلاً مطالعہ کی عادات کو کیسے بہتر بنایا جائے۔ والدین کے باہمی تعلقات بچوں کی شخصیت کی نشوونما پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ذراعت اور صنعتوں کی پیداواری صلاحیت کو کیسے بڑھایا جا سکتا ہے ہمارے مدافعتی نظام پر طویل تناؤ کا کیا اثر پڑتا ہے۔

ماہرین نفسیات ان موضوعات کے علاوہ کئی دیگر متنوع امور پر تحقیقاتی کام کر رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے ہم میڈیا کے ذریعہ نفسیات کی افادیت سے عوام الناس کو آگاہ کریں۔ اس علم کی بدولت مرد اور خواتین گھریلو امور اور ملازمت کے دوران پیش آنے والے مسائل کو بہتر انداز میں نمٹا سکتے ہیں۔

☆ نفسیاتی یا دماغی مرض کے دورِ عمل میں انسانی جسم کن عوارض کا شکار ہو سکتا ہے اور اُن سے بچاؤ کی کیا صورت ہے؟

☆☆ نفسیاتی امراض دراصل ذہنی عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں حد سے زیادہ پریشانی اور بے چینی اکثر ذہنی بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔ بعض اوقات بے ضرر حالات کی غلط تشریح اور ممکنہ خطرات پر زیادہ توجہ مرکوز کرنا بھی ذہنی اضطراب کا باعث بن جاتا ہے۔ اضطرابی عوارض مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔ ان میں سرِفہرست افسردگی (Depression) مستقبل اور بے بنیاد خوف (Phobias) شدید اور اچانک اضطرابی کیفیت اور خوف و ہراس کا دورہ پڑ جانا (Panic Disorder) اور شقاقِ دماغی (Shizophrenia) جیسے عوارض شامل ہیں۔ ڈیپریشن میں مبتلا لوگ روزمرہ کی زندگی میں دلچسپی لینے اور محظوظ ہونے Toenjoy کی صلاحیت کھو دیتے ہیں۔ اور عام طور پر بغیر کسی وجہ کے خوفزدہ رہتے ہیں اور ہر وقت تھکن کے احساسات کے ساتھ چڑچڑا پن۔ سست روی اور تشویش کی حالت میں رہنا ان کا خاصہ بن جاتا ہے۔ ان کی نیند اور بھوک بھی کم ہو جاتی ہے اور انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ محض بیکار ہیں جس کی وجہ سے ان میں بے اعتمادی کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔

فوبیا یا بے بنیاد خوف ایسے لوگ مخصوص حالات یا اشیاء سے متعلق خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بند جگہوں کا خوف جیسے لفٹ، بند کمرہ۔ اس کے علاوہ دوسری کیفیت اگورافوبیا (Agora Phobia) یعنی عوامی مقامات پر جانا۔ بس میں سفر کرنا۔ ہجوم میں شامل ہونا وغیرہ وغیرہ کی ہے۔

خلل دماغ (Shizophrenia) ایک شدید ذہنی بیماری ہے جس میں بے بنیاد خوف، سوچ اور وہم روزمرہ کی زندگی کو بری طرح متاثر کر دیتے ہیں اور ایسے افراد گفتگو اور سوچ کا عمل انتہائی غیر منظم ہوتا ہے۔ بعض مریض وہم، غلط عقائد اور سوچ کی وجہ سے خیال کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کی جان کے دشمن ہیں لہٰذا وہ اپنے دفاع میں حملہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس بیماری سے مکمل طور پر صحت یاب ہونا ممکن نہیں لیکن علاج سے کافی حد تک کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بہت سی ذہنی بیماریاں بالخصوص فوبیا، آموزش (Learning) یا دوسروں کی تقلید کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ رویے والدین اپنے بچوں کو منتقل کرتے ہیں مثلاً زلزلہ، آسمانی بجلی کی گرج چمک سے ڈر کر اگر والد یا والدہ کسی کمرہ یا نزدیکی جگہ میں چھپ جاتے ہیں تو ان کے

بچوں میں بھی یہ ذہنی خوف پیدا ہونے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔

☆ آج سے قریب تین دہائی پہلے جناب احمد ندیم قاسمی نے ایک نامور ماہر نفسیات کے حوالے سے پاکستان میں نفسیاتی مریضوں کی تعداد تو ّے فیصد تک ہونے کا خدشہ ظاہر کیا تھا؟

☆☆ میری دانست میں احمد ندیم قاسمی صاب نے کسی معتبر حوالہ کے بغیر اعداد و شمار کا ذکر کیا ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ نفسیاتی امراض کا ایک بنیادی سبب ذہنی تناؤ (Stress) ہے اور آج کل کے دور میں اکثر لوگوں کو اس کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس کے نتیجہ میں ان کی ذہنی صحت یقیناً متاثر ہوتی ہے۔ ہر فرد کا ردِعمل ایسی صورت میں مختلف ہوتا ہے بعض لوگ جب حالات کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو ڈیپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن اکثر لوگ جن کی ذہنی صحت نارمل ہوتی ہے ایسے حالات کا کامیابی سے مقابلہ کرتے ہیں۔

☆ معاشرے کے صحت مند لوگوں کے ساتھ ذہنی اور نفسیاتی لوگوں کے میل ملاپ اور رہن سہن سے کس قسم کے نقصانات کا سامنا ہو سکتا ہے؟

☆☆ معاشرہ کے صحت مند لوگوں کے ساتھ ذہنی اور نفسیاتی مریضوں کے میل ملاپ اور رہن سہن سے کسی قسم کے نقصان کیفیت (Anxiety) غیر حقیقی یعنی بے جا خوف (Phobias) ہوتے ہیں لیکن بدنامی (Social Stigma) کی وجہ سے ذہنی مریضوں کو الگ رکھا جاتا ہے اور گھر کے نارمل افراد کوشش کرتے ہیں گھر کے ایسے فرد کو جو ذہنی مریض ہو معاشرہ کے صحت مند لوگوں کے میل ملاپ کا موقع نہ دیا جائے۔ شیزوفرینیا کی ایک قسم وہم (Paranoid) میں مریضوں کو Delusion of Persecution ہوتا ہے اور ایسے مریض اپنی مدافعت کے لیے دوسروں پر حملہ کر سکتے ہیں۔

☆ رشتوں کے باب میں بھی لڑکی کی ظاہری خوبصورتی اور لڑکے کا صاحبِ حیثیت ہونا پیش نظر ہوتا ہے۔ آپ کے خیال میں دو خاندانوں کے ملاپ میں نفسیاتی نقطہ نظر سے کن چیزوں کو اہمیت دینا ضروری ہے؟

☆☆ رشتہ طے کرتے وقت میرے خیال میں سب سے زیادہ اہمیت لڑکی کی اخلاقی اور مذہبی روش کو دینی چاہیے اور دونوں خاندانوں کی سماجی اور مالی حیثیت میں زیادہ تفاوت نہیں ہونی چاہیے تاکہ کسی فریق کو احساسِ کمتری نہ ہو۔ علاوہ ازیں لڑکی کے والدین کے باہمی تعلقات اور سسرال والوں کے بارے میں ان کا رویہ جاننا انتہائی اہم ہے۔ بچے عموماً والدین کی تقلید کرتے ہیں اور ان کو لاشعوری طور پر اپنا رول ماڈل بنا لیتے ہیں۔ شادی کے بعد جب میاں بیوی میں جھگڑے کی نوبت آتی ہے تو لڑکا لڑکی اسے حل کرنے کے لیے وہی رویہ اختیار کرتے ہیں جو بچپن میں ماں باپ کے مابین دیکھتے آئے ہیں۔ ان کے لیے نہ صرف لڑائی جھگڑا بلکہ مار پیٹ اور اس کے بعد میاں بیوی کے آپس میں نارمل رویہ اختیار کر لینا معمول کی بات ہوتی ہے۔ البتہ اگر بچوں کی شادی سے پہلے یا شادی کے بعد نفسیاتی کونسلنگ کی جائے تو وہ ایک دوسرے کے بارے میں نارمل رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔ اسی طرح لڑکی کی ماں کا اپنے سسرال والوں سے تعلقات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اگر رشتہ خاندان سے باہر طے ہو رہا ہو تو ایسی معلومات دوسرے رشتہ داروں، ہمسایوں اور گھر کے ملازمین سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ مزید برآں دونوں خاندانوں میں موروثی بیماریوں کے بارے میں ضروری معلومات مثلاً ماں یا باپ یا دونوں اگر تھیلاسیمیا (Thalassemia) کا شکار ہوں تو ان کے بچے یقیناً اس مرض میں مبتلا ہوں گے۔ جسمانی بیماریوں کے علاوہ لڑکے اور لڑکی کی ذہنی صحت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اہم ہے۔ میں نے کئی خواتین کو یہ کہتے یا مشورہ دیتے ہوئے سنا ہے کہ ''آپ اپنے ذہنی مریض بیٹے/ بیٹی کی شادی کرا دیں وہ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے'' میں بذاتِ خود ایسے گھرانوں کو جانتی ہوں جنہوں نے اپنے بیٹے کی بیماری کو سسرال والوں سے خفیہ رکھ کر معصوم لڑکی سے شادی کرا دی۔ شادی سے پہلے سکون آور ادویات (Tranquilizers) کھلا کر لڑکے کو لڑکی کے والدین سے ملوایا جاتا رہا لیکن لڑکے کے بلاوجہ جارحانہ رویہ سے شادی کا انجام طلاق پر منتج ہوا۔ اگر ممکن ہو تو لڑکے کا طبی معائنہ کر کے معلوم کیا جائے کہ وہ ازدواجی تعلقات قائم کرنے یا اولاد پیدا کرنے کے قابل ہے یا نہیں۔

☆ ایک لفظ ''ہائی جین'' معاشرے میں کثرت سے مستعمل ہے جس کے بارے میں نومولود بچوں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہو جاتا ہے۔ بچوں کے پیدا ہونے سے پہلے اور بعد میں کس طرح کے احتیاطی اقدام اٹھانا ضروری ہیں؟

☆☆ ہائی جین سے مراد حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق اپنے اردگرد کے ماحول کو صاف ستھرا رکھ کر اپنے آپ اور دیگر افراد کو صحت مند رکھنا اور بیماریوں سے بچانا ہے۔ بچے کی پیدائش سے پہلے حاملہ خاتون کو باقاعدگی سے اپنا طبی معائنہ کروانا چاہیے۔ بلڈ پریشر، ذیابطیس، بلڈ گروپ یا کسی اور بیماری میں مبتلا ہونے کی صورت میں بروقت علاج شروع کر دینا چاہیے۔ دورانِ حمل الٹراساؤنڈ کے ذریعہ بچے کی نشوونما (Prenatal) کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ جو خواتین ۳۵ سال کے بعد حاملہ ہو جائیں ان میں بعض جینیاتی (Genetic) بیماریوں مثلاً ڈاؤن سنڈروم (Downs Syndrome) کے حامل بچوں کی شرح زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے ایسے امکانات بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ اگر پہلا بچہ ڈاؤن سینڈروم کا شکار ہو تو دوسرے حمل کے دوران حاملہ کو اپنے جینز (Genes) ٹیسٹ کرا لینے چاہئیں اس بیماری میں بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما متاثر ہوتی ہے لیکن توجہ اور محنت سے کچھ بہتری ہو سکتی ہے۔

پیدائش کے بعد بچوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہاتھ دھو لینے چاہئیں کیونکہ نومولود بچوں کو انفیکشن کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ اگر کسی فرد کو زکام یا کوئی اور متعدی بیماری ہو تو اس کا بچے کو ہاتھ لگانا یا بوسہ دینا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ اس طرح بچہ زکام یا نمونیا کا شکار ہو سکتا ہے۔ ماؤں کو چاہیے کہ بچوں کے ڈائپرز وقتاً فوقتاً تبدیل کرتی رہیں اور بچے کو نیم گرم پانی میں کپڑا بھگو کر صاف کرتی رہیں تاکہ جراثیمی بیماری کا امکان نہ رہے۔ اکثر بچوں کو ڈائپرز کی وجہ سے جلد پر سرخ نشان پڑ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں مناسب مرہم کا استعمال کیا جائے۔ اسی طرح ناف یعنی Umbilical Cord خشک ہو کر گرنے سے پہلے

نہلانے کے بجائے Sponge Bath کرنا چاہیے اور ہفتہ میں تین بار سے زیادہ نہ نہلائیں ماسوائے خاص ضرورت کے۔

☆ نفسیاتی مریض بالخصوص بچوں سے برتاؤ کی بابت خصوصی احتیاط، علاج اور احتیاط کی بابت بھی آپ کی رہنمائی اہمیت کی حامل ہے؟

☆☆ نفسیاتی مریضوں خصوصاً بچوں سے پیار اور محبت کا رویہ رکھیں۔ بے جا تنقید سے گریز کریں ان سے ایسا رویہ اپنائیں جس سے ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ ان کی تربیت کے لیے مناسب راہ نمائی فراہم کریں۔ چونکہ نارمل بچوں کی طرح وہ مختلف افعال از خود سرانجام نہیں دے سکتے۔ اس لیے انہیں جدوجہد کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ ماہرینِ نفسیات کے مشورہ سے نفسیاتی امراض کا شکار بچوں کے علاج معالجہ کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

☆ میڈیکل سٹوروں پر کھلے عام سکون آور ادویات کی دستیابی معاشرے کو کس طرح کے نقصانات پہنچا سکتی ہے اور ان سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟

☆☆ یہ امر باعث تشویش ہے کہ ہمارے ملک میں میڈیکل سٹورز پر سند یافتہ ڈاکٹر کے نسخہ کے بغیر ہی کھلے عام سکون اور ادویات آسانی سے مل جاتی ہیں جس کے نتیجہ میں معاشرہ کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے اور کئی لوگ ان سکون آور دواؤں کے مسلسل استعمال سے نشہ کے عادی ہو جاتے ہیں۔

ذاتی مشاہدہ کی بنا پر ایک کیس کا حوالہ دے رہی ہوں جو آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ چند سال قبل ایک جاننے والے گھرانے کا سولہ سالہ ملازم گھر سے رقم اور زیورات چوری کرنے کی خاطر کیمسٹ سے نشہ آور گولیاں خرید لایا اور گھر کی مالکن اور اس کے جواں سال بیٹے کو چائے میں ملا کر رات کے کھانے کے بعد پلا دیں۔ جب وہ دونوں گہری نیند میں چلے گئے تو دونوں کو موت کی نیند سلا دیا اور دیوار پھلانگ کر فرار ہو گیا۔ اس صورت سے نبرد آزما ہونے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ حکومت اس حوالہ سے قوانین کا سختی سے نفاذ کرے اور خلاف ورزی کی صورت میں میڈیکل سٹور کا نہ صرف لائسنس منسوخ کرے بلکہ قید اور بھاری جرمانہ کی سزائیں بھی دی جائیں۔

☆ ایک نہایت سنجیدہ مسئلہ پیر، فقیر، عامل اور خود ساختہ عالم کا معاشرے کو بہکانے اور روحانی علاج کے نام پر جیبیں بھرنے کا بھی ہے۔ اس حوالے سے حکومت کو کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟

☆☆ حکومت کو چاہیے سادہ لوح عوام کو عیاری سے دھوکہ دے کر لوٹنے والے جعلی پیر فقیر، عامل وغیرہ کا سختی سے نوٹس لے اور اُن کے ٹھکانے نہ صرف مستقل طور پر ختم کرے بلکہ انہیں قرار واقعی سزا دے۔ اس کے علاوہ ایسے تمام اشتہارات اور وال چاکنگ کا مکمل خاتمہ کیا جائے اور تمام اخبارات پر ایسے اشتہارات شائع کرنے پر پابندی عائد کی جائے۔

☆ ایک تاثر یہ ہے کہ انسان کے جسمانی عوارض پر سائنس نے جس قدر توجہ کی اُس کی نسبت ذہنی صحت کو اہمیت نہیں دی جس کے سبب اتنی ترقی کے باوجود انسانی نفسیات کی بابت جتنا کچھ دریافت ہوا اُس سے کہیں زیادہ دریافت ہونا باقی ہے؟

☆☆ یہ حقیقت ہے کہ نفسیاتی عوارض کے بارے میں مزید ریسرچ کی ضرورت ہے۔ ماہرینِ نفسیات اس حوالہ سے انتہائی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ اس مقصد کے لیے سپیشل گرانٹس اور سہولیات فراہم کرے تا کہ وہ اپنی تحقیق کو آگے بڑھائیں۔ ذہنی امراض کے ہسپتالوں اور کلینکس (Clinics) کی موجودہ حالت ایسی ہے کہ وہاں جا کر کام کرنا نہ صرف کٹھن کام ہے بلکہ ماہرین کے لیے بھی ڈپریشن کا باعث بنتا ہے۔

لاہور میں ''فاؤنٹین ہاؤس'' (Fountain House) ایک ایسا ادارہ ہے جہاں شدید ذہنی عوارض کا شکار مریضوں کو علاج کے لیے داخل کیا جاتا ہے اور انہیں رہائش، خوراک اور دیگر مناسب سہولتیں مہیا کرنے کے علاوہ بعض پیشہ ورانہ ہنر بھی سکھائے جاتے ہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ صحت مند ہو جانے کے بعد بھی ان کے اہلِ خانہ انہیں واپس لے جانے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس کی بڑی وجہ معاشرہ کا افسوس ناک رویہ ہے۔ لوگ ایسے شفایافتہ افراد کو بھی خاندان کے لیے کلنک کا ٹیکہ (Taboo) سمجھتے ہیں۔ اسی رویہ کے باعث اکثر مریض جو بیماری کے ابتدائی مرحلہ میں آسانی سے شفایاب ہو سکتے ہیں انہیں بھی علاج کی سہولیات سے محروم رکھا جاتا ہے تا کہ دوسرے لوگوں کو ان کے گھر میں ذہنی مریض کی موجودگی کا علم نہ ہو سکے۔

☆ ہمارے معالجین مراد نفسیات یا ذہنی معالجین ہے۔ ترقی یافتہ دنیا مریض کی کیس ہسٹری بنانے اور اُس کے مطابق مختلف تھراپیز کے بجائے ٹرینکو لائز سے مریض کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس عجلت میں مریض ٹھیک ہونے کے بجائے مسکن دواؤں کا عادی ہو جاتا ہے؟

☆☆ یہ مشاہدہ کافی حد تک درست ہے البتہ اس کے ذمہ دار نہ صرف نفسیاتی معالج ہیں بلکہ ان کی خدمات حاصل کرنے والے مریض بھی ہیں کیونکہ مختلف نفسیاتی طریقہ ہائے علاج جیسے سپیچ تھراپی، رائٹنگ تھراپی، ٹاکنگ تھراپی کو وہ مؤثر طریقۂ علاج نہیں گردانتے۔ ماہرینِ نفسیات صرف نفسیاتی طریقہ سے علاج کرتے ہیں اور ادویات مثلاً سکون آور ادویات وغیرہ کا استعمال صرف سائیکاٹرسٹ (Psychiatrists) کرتے ہیں کیونکہ انہیں علاج بذریعہ ادویات کی تعلیم دی جاتی ہے۔

☆ نفسیاتی امراض کا ایک سبب سائنس کی تیز رفتار ترقی کو بتلایا جاتا ہے یعنی سب کچھ جھٹ پٹ اور فٹافٹ حاصل کرنے کی دوڑ میں انسان سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہے؟

☆☆ بعض اوقات لوگ دوسروں کی ترقی اور پُرتعیش سہولیات دیکھ کر حسد کا شکار ہو جاتے ہیں اور ناجائز طریقے اختیار کر کے وہ معیار حاصل کرنا چاہتے ہیں جو موجود وسائل میں رہ کر حاصل نہیں کر پاتے۔ اس حوالہ سے ٹی وی ڈراموں اور فلموں کا کردار بھی ایک وجہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ ایسے پروگرام پیش کیے جائیں جو لوگوں کو حقیقت پسندی اور دیانتداری اور اس کے ثمرات سے آگاہ کریں۔

ایک صدی کا قصّہ

وجے بھٹ

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

یہ کہانی ایک ایسے بچے کی ہے جو سپنے بہت دیکھا کرتا تھا۔وہ جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھا کرتا تھا۔کہتے ہیں جب وشواس اٹل ہو، ارادے مضبوط ہوں، من میں سچی لگن ہو۔دل میں آگے بڑھنے کی اُمنگ ہو۔ اپنے اندر خود اعتمادی ہو۔حوصلے بلند ہوں اور اپنی منزل پانے کا کامل یقین ہو تو دنیا کی کوئی طاقت ایسے انسان کو اُس کی منزل تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔یہ سب کچھ گجرات کے ایک ریلوے گاڈ کے بیٹے نے ثابت کر کے دکھایا۔

گجرات کے ایک ریلوے گاڈ کے دو بیٹے تھے۔بڑے بیٹے کا نام پرکاش اور چھوٹے بیٹے کا نام وجے تھا۔وجے کے سپنے بہت بڑے تھے۔یہ پریوار گجرات کے ایک چھوٹے سے قصبے پالٹانا میں رہتا تھا۔یہ پریوار بہت غریب تھا۔بڑی مشکل سے ان کی گزر بسر ہوتی تھی۔چھوٹے بیٹے وجے، کا جنم 12 مئی 1907 کو ہوا۔وجے بڑا ذہین اور محنتی تھا۔بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی سے بہت پیار کرتا تھا۔دونوں تھیٹر اور فلموں کے دیوانے تھے۔اُن کی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ وہ چنی گھاس سے میٹھا حلوہ بناتے تھے اور پھر اُسے بازار میں بیچ کر آتے تھے۔اس سے جتنی کمائی ہوتی تھی وہ اُس پیسے سے تھیٹر میں فلم دیکھ کر آتے تھے۔جب وجے بیس سال کا تھا تو وہ اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بمبئی کے لئے نکل پڑا۔اُس کی اپنے بڑے بھائی شنکر سے خوب بنتی تھی اس لئے وہ اپنے ساتھ اپنے بڑے بھائی شنکر کو بھی لے کے چلا۔

بمبئی پہنچتے ہی وجے بٹ نے آگے کی پڑھائی کے لئے سینٹ زیورس کالج میں داخلہ لیا جب کہ بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کی پڑھائی کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ایک اسٹور میں کام کرتا رہا۔وجے بٹ بہت ہی ذہین طالب علم تھا۔اُسنے اس کالج میں انٹرمیڈیٹ سائنس تک کی پڑھائی کی۔ایک بڑھیا سی نوکری پانے کے لئے اُس نے انٹرنیشنل کارسپانڈنس اسکول آف لنڈن سے الیکٹرک لائٹنگ کی سند حاصل کی۔اُسنے کالج کی پڑھائی کو خیر باد کہہ کے بمبئی کی ''BEST'' میں نوکری حاصل کی۔ بہت جلد وہ ترقی کر کے آفیسر کے عہدے تک پہنچا۔اُس کی ملاقات گاہے گاہے کئی نامی فلم پرڈیوسروں سے ہوتی رہتی تھی۔ان سے مل کر اُسکے اندر چھپے ہوئے فلمی کیڑے کلبلانے لگے۔وہ اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کرنے لگتا تھا۔

کاتب تقدیر نے اُسکے نصیب میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ایک دن اُسنے اپنی نوکری سے استعفادے دیا۔جب یہ خبر اُسکے والدین تک پہنچی تو وہ من مسوس کے رہ گئے۔اتنی اچھی نوکری کو چھوڑ کر وہ فلموں میں قسمت آزمائی کرنے چل پڑا تھا، یہ بات اُس کے والدین کو کچوکے مار رہی تھی۔اُن دنوں اس انڈسٹری کو عزت کی نگاہ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔کچھ بگڑے ہوئے گجراتی رئیس زادے یا بد قماش لوگ ہی اس انڈسٹری میں چھائے ہوئے تھے، ایسے میں ان دو شریف برادراں کا اس کوئلے کی کان میں کود جانا خودکشی کے مترادف تھا۔گھر والوں نے دونوں بھائیوں کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ اس بدنام صنعت سے ناتا جوڑ کر اپنی عاقبت خراب نہ کریں مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔اُن پر تو فلمیں بنانے کی دھن سوار تھی اسلئے وہ بات سنی ان سنی کرنے لگے۔

وجے بٹ نے فلم انڈسٹری میں ہر طرح کے پاپڑ بیلے مگر کامیابی نہ ملی۔حالات کے بے رحم تھپیڑوں نے اُسے اتنا سخت جان بنا دیا کہ وہ ایک کے بعد ایک ٹھوکر کھاتا رہا تاہم اُسنے ہار نہیں مانی۔اس جدوجہد کے دوران ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ وہ فلم کی ہر صنف کو سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔اُسنے گجراتی میں ایک دو ناٹک لکھے۔ایک ناٹک جو ایک سال تک چلا اور جسکو لکھنے کا معاوضہ اُسے اُس زمانے میں چار سو روپے ملے وہ گجراتی ناٹک تھا۔''لاکھو پھولنی''۔اس ناٹک کی کامیابی سے حوصلہ پا کر وہ ایک کے بعد ایک کہانی لکھتا چلا گیا۔اُسے لگا کہ ایسی کہانیوں پر کامیاب فلمیں بنائی جا سکتی ہیں۔اسی دوران اُسکی ملاقات بابائے فلم انڈسٹری آردیشیر ایرانی سے ہوئی۔آردشیر ایرانی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' کا خالق تھا۔وہ اُس وقت ''رائل اسٹوڈیو'' کا منیجنگ ڈائرکٹر تھا جس کا مالک سیٹھ ابوحسن تھا۔اُسنے وجے بٹ کی کئی کہانیاں سنیں۔کافی سوچ بچار کے بعد اُس نے ایک کہانی پسند کی مگر شرط یہ رکھی کہ اُنہیں یہ کہانی اسٹوڈیو کے مالک سیٹھ اُبوحسن کو سنانی پڑے گی۔اگر اُسنے کہا یہ کہانی اچھی ہے تو پھر یہ سمجھو کہ تم لوگوں کے پو بارہ ہو گئے۔سیٹھ اُبوحسن نے جب کہانی سنی تو اُسے بھی کہانی ٹھیک ٹھاک لگی سو اُسنے اس کہانی کو شرف قبولیت بخشی۔وہ یہ خبر لے کر آردشیر ایرانی کے پاس پہنچ گئے۔ایرانی وجے بٹ کی ادبی قابلیت کو پہچان چکا تھا مگر اُس کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ فلمی منظر نامے کی تیکنک سے بے بہرہ تھا۔ایرانی نے پہلا کام یہ کیا کہ اُسنے اپنے سبھی کام دام چھوڑ کر وجے بھٹ کو اپنے ساتھ بٹھالیا اور اُسے ایک اُستاد کی طرح منظر نامہ لکھنا سکھانے لگا۔وہ ہر روز کچھ وقت وجے بھٹ کے ساتھ گزارتا تھا اور اُسے اسکرین پلے کی باریکیاں سمجھاتا تھا۔جونہی شام ہوتی تھی تو دونوں بھائی کھانا کھا کے مجیسٹک سینما کی اور ہو لیتے۔یہ سینما 1918 میں آردشیر ایرانی نے اپنے ایکزیکیٹو عبداللہ یوسف علی کی شراکت سے تعمیر کیا تھا۔ یہیں بیٹھ کر دونوں بھائی آدیشیر ایرانی سے فلمی منظر نامہ لکھنا سیکھتے تھے۔اسی جگہ پر بیٹھ کر وجے بھٹ نے اپنے فلمی سفر کی شروعات کی۔اُس نے اپنی پہلی فلم ''ودھی کا ودھان'' کا منظر نامہ اسی جگہ بیٹھ کر لکھا۔اس فلم کے ہدایت کار کے۔پی۔بھاوا تھے۔

آدیشیر ایرانی نے اُس کے بعد دو فلمیں اور بنائیں جن کی کہانیاں اور منظر نامے بھٹ برادرس نے لکھے تھے۔ یہ فلمیں تھیں ''پانی میں آگ'' اور 1929 میں بننے والی فلم ''غلام''۔یہ دونوں فلمیں ناگیندر امجد ار کی ہدایت میں بنی تھیں۔ان فلموں کو تھوڑی بہت کامیابی ملی۔اس سے حوصلہ پا کر اُنہوں نے اپنا پروڈکشن اسٹوڈیو کھولنے کا فیصلہ کیا۔رائل فلم کمپنی اپنی پہلی فلم ''الف لیلا

''ریلیز کرنے سے پہلے بہت ساری خاموش فلمیں بنانا چاہتا تھا۔فلموں کی مانگ دیکھ کر وجے بھٹ اور اُس کے بڑے بھائی شنکر بھٹ کے من میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ وہ بھی اپنا ایک اسٹوڈیو کھولیں۔اسٹوڈیو کھولنے کے لئے پیسے کی ضرورت تھی۔اُنہوں نے اپنے ایک رشتہ دار کے ساتھ ساجھے داری کر کے رائل فلم کمپنی کھولی۔اس کمپنی کے بینر تلے اُنہوں نے ایک فلم بنائی جس کا نام ''بلیک گھوسٹ'' تھا۔یہ اُنکی فلمسازی کی ابتدا تھی۔اس کے بعد وجے بھٹ نے اپنی مادری زبان گجراتی میں ایک فلم لکھی جسے اُنہوں نے پرڈیوس کیا۔اس فلم کا نام ''سنسار لیلا'' تھا ۔یہ ایک سوشل فیملی ڈرامہ تھا۔یہ فلم 1933 میں ریلیز ہوئی اور زبردست ہٹ رہی۔اس فلم سے اُن کے پو بارہ ہوگئے۔اتنی کامیابی پا کر اُن کے حوصلے کافی بلند ہوئے اور وہ اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے لگے۔

1934 میں اُنہوں نے اندھیری میں زمین خریدی اور اُس جگہ ایک اسٹوڈیو تعمیر کیا جس کا نام اُنہوں نے ''پرکاش اسٹوڈیو'' رکھا۔۔اس اسٹوڈیو میں بننے والی پہلی فلم کا نام ''بمبئی کی موہنی'' تھا۔اسے وجے بھٹ نے لکھا اور پرڈیوس کیا۔اس کے بعد اُنہوں نے دو اور فلمیں بنائیں جن کا نام ''جے من نو رجیون ''اور جو کہ 1935 میں ریلیز ہوئی اور دوسری فلم ''سنہیہ لتا'' جسے اُنہوں نے ہندی اور گجراتی میں بنایا۔یہ فلم 1936 میں ریلیز ہوئی۔

یہاں پر ایک مزے کی بات ہے۔''سنسار لیلا'' میں اُنہوں نے ایک ایکٹر کو ایک چھوٹا سا رول دیا جس کا نام زاکر خان تھا۔ایک لمبا تڑنگا نوجوان جس کی آواز بڑی گونج دار تھی۔یہ نوجوان الور کی ریاست میں ایک پولیس افسر تھا جو اپنی نوکری چھوڑ کے ہیرو بننے بمبئی آ گیا تھا۔وجے بھٹ اُسکی شخصیت سے کافی متاثر ہوا تھا اسلئے اُنہوں نے اُسے گجراتی فلم میں ایک چھوٹا سا رول دے کر ایک طرح اُس کا اسکرین ٹسٹ لیا تھا۔وہ اسکرین ٹسٹ میں پاس ہوا تھا۔وجے بھٹ نے اُس کا نام بدل کر جینت رکھ دیا اور اُس کے بعد اُسے کئی فلموں میں بطور ہیرو پیش کیا جن کا نام تھا ''بمبئی میل''1935 ''چیلنج''1936 ''ہز ہائنس''1937 اور اُسکے بعد ''سٹیٹ ایکسپرس ''اور ''بجلی''۔جینت کی شروعاتی تنخواہ محض تیس روپے تھی جو بڑھتے بڑھتے سات سو روپے ہوگئی۔جینت نے ہر طرح کے رول کئے۔جب تک وہ حیات تھا وہ اپنے محسن کو نہیں بھولا۔اُس کی موت کے بعد جب اُس کا بیٹا امجد خان فلموں میں آیا تو اسی دوران اُس کا حادثہ ہوا جس میں وہ بال بال بچا۔وجے بھٹ خود اُسے دیکھنے ہسپتال گیا۔امجد خان اُس کے خلوص سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے جذباتی ہو کر اپنے گھر والوں کو بلا کر کہا ۔اس ہستی کو کبھی بھولنا مت۔یہی ہم سب کو اس انڈسٹری میں لے کے آیا ہے۔

وجے بھٹ فلم ڈائرکشن کے تمام تیکنکی امور سے واقف ہو چکا تھا۔اُسکی ہدایت کارانہ صلاحیتوں کو اب تسلیم کیا جانے لگا تھا۔تاہم اُس نے ہدایت کاری کے میدان میں ہاتھ نہیں آزمایا تھا۔وہ فلمیں لکھتا رہا اور پرڈیوس کرتا رہا۔اُن کی فلمیں دوسرے ہدایت کار ڈائرکٹ کرتے تھے۔اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب آگے بنائی جانے والی فلمیں خود ڈائرکٹ کرے گا۔اُسکے بڑے بھائی شنکر بھائی بھٹ نے اُسے پروڈکشن کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا۔اُس نے یہ بوجھ اپنے کاندھوں پر ڈال لیا اور اپنے بھائی کو تخلیقی کاموں میں مصروف ہونے دیا۔ایک ہدایت کار کے طور پر جو اُسکی پہلی فلم تھی وہ تھی ''ڈریم لینڈ''۔یہ فلم ہالی وڈ کی فلم ''Invisible Man'' سے متاثر ہو کے بنائی گئی تھی۔اس فلم کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ اُس میں کالے دھاگے کا استعمال کر کے ٹرک فوٹو گرافی کی گئی تھی۔اس فلم کی فوٹو گرافی پینٹنگ ڈیپارمنٹ کے ایک نوجواں پینٹر نے کی تھی جو کہ بلا کی صلاحیت رکھتا تھا۔اس پینٹر کا نام بابو بھائی مستری تھا جو بعد میں فوٹو گرافی کا ایک معتبر نام بن گیا۔اس فلم کی ریلیز کے بعد بابو بھائی مستری کا کام دیکھ کر بڑے بڑے فلمساز دانتوں تلے اُنگلی دبا کے رہ گئے۔بابو بھائی مستری کی مانگ بڑھ گئی۔ہر کوئی اُسے اپنی فلم میں لے کر ٹرک فوٹو گرافی کرانا چاہتا تھا۔

اس فلم کے ریلیز کے بعد وجے بھٹ کی دو اور فلمیں ریلیز ہوئیں جن کا نام ''سٹیٹ ایکسپریس'' اور ''لیڈر فیس'' تھا۔''لیڈر فیس'' کے ستارے ماہ تاب، جے راج اور سات سال کی ایک بچی ماہ جبین ناز تھا۔وجے بھٹ چاہتا تھا کہ اس بچی کا کوئی سادا سا نام ہو اس لئے اُس نے اس بچی کا نام بے بی مینا رکھ دیا۔یہی بے بی مینا بڑی ہو کر مینا کماری بن گئی۔بڑی ہو کر اس نے بے شمار دھارمک اور ہومی واڈیا کی سٹنٹ فلموں میں کام کیا۔

1939 میں مہاتما گاندھی ولساڈ (گجرات) کے ایک آشرم میں آ کے ٹھہرے تھے۔جب وجے بھٹ کو یہ خبر ملی تو وہ باپو سے ملنے ولساڈ پہنچا۔باپو نے اُس سے کہا کہ وہ گجرات کے سنت کوی نرسی مہتا پر ایک فلم بنائے۔وجے بھٹ نے باپو کی بات کو سر آنکھوں پر لیا اور بمبئی پہنچتے ہی اُس نے پربھات اسٹوڈیو کے سنت نکارام، ویشنو پنت پگنس اور اور درگا کھوٹے کو سائن کیا۔تھوڑی تحقیق کے بعد اُس نے اس فلم کی شوٹنگ شروع کی۔اس نے یہ فلم دو زبانوں میں بنائی۔ گجراتی اور ہندی۔یہ فلم 1940 میں ریلیز ہوئی اور زبردست ہٹ رہی۔اس فلم کو ہر طرف سے کافی سراہنا ملی۔

وجے بھٹ ایک کے بعد ایک کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد اُس نے رامائن کو سلولائڈ پر پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔یہ ایک حساس سبجیکٹ تھا۔اس کے ساتھ کروڑوں لوگوں کی آستھا جڑی ہوئی تھی۔اُس نے کئی سارے تاریخ دانوں اور محققوں کو اپنے ساتھ ملایا اور وہ اس موضوع پر کام کرنے لگے۔اُس نے اسکرپٹ مکمل ہوتے ہی ستاروں کو انتخاب کر لیا۔شوبھنا سمرتھ، چندر کانت، بانڈوپت ساہنی، مدھوسدھن اور یشونت وگرے کو اس فلم کے لئے سائن کیا گیا۔اس نے یہ فلم ہندی میں ''بھرت ملاپ'' کے نام سے بنائی جب کہ مراٹھی میں اس کا نام ''بھرت بھیٹ'' رکھا گیا۔یہ فلم 1940 میں ریلیز ہوئی ۔اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ جس دن اس فلم کا پریمیر بمبئی کے میجسٹک سینما میں ہوا، اس پریمیر میں اُس وقت کے صدر سروپلی رادھا کرشنن بطور خاص موجود تھے۔

وجے بھٹ اس کے علاوہ ایک اور فلم بنا رہا تھا جس کا نام ''مالا'' تھا۔

اس کی کہانی اور مکالمے اُس زمانے کے مشہور لیکھک ڈی این مدھوک نے لکھے تھے۔ ایک دن وہ ایک نوجوان کو وجے بھٹ کے پاس لے آیا اور اُس سے اس نوجوان کو کام دینے کی سفارش کی۔ یہ نوجوان نوشاد علی تھا جس کی اس سے پہلے صرف ایک فلم ریلیز ہوئی تھی جس کا نام ''پریم نگر'' تھا۔ وجے بھٹ نے اُس کی کئی دھنیں سنیں۔ اُسے اُس کی دھنیں پسند آئیں اور اُس نے نوشاد علی کو دوسو پچاس روپے کی ماہانہ تنخواہ پر ملازم رکھا اور اُسے فلم ''مالا'' کا سنگیت دینے کی ذمہ داری سونپی۔ یہ فلم بھی 1940 میں ریلیز ہوئی۔ اسکے بعد اُس نے پرکاش پکچرس کی دو اور فلمیں کیں جن کا نام ''درشن'' اور ''اسٹیشن ماسٹر'' تھا۔ یہ فلمیں بالترتیب 1941 اور 1942 میں ریلیز ہوئیں۔

1942 سے لے کے 1948 تک وجے بھٹ کی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں جن کے نام تھے ''بھرت ملاپ'' ''رام راجیہ'' ''وکرما دتیہ'' ''سماج کو بدل ڈالو'' اور ''رام بان''۔ ان میں سے بیشتر فلمیں دھارمک موضوعات پر مبنی تھیں۔ ''رام راجیہ'' ایسی واحد فلم ہے جو مہاتما گاندھی نے دیکھی۔

اب کے بار وجے بھٹ کچھ ہٹ کے بنانا چاہتا تھا۔ اُس کے ذہن میں تان سین کو لے کر ایک میوزیکل فلم بنانے کا خیال بہت دنوں سے کلبلا رہا تھا۔ اُس نے فلم کی اسکرپٹ تیار کی اور اس فلم کا نام رکھا ''بیجو باورا''۔ بیجو کے لئے اُن کی پہلی پسند دلیپ کمار تھا اور بیجو کی محبوبہ کے لئے نرگس۔ اُنہوں نے نرگس کو دس ہزار کا سائننگ دے کر فلم کے لئے سائن بھی کیا۔ اب دلیپ کمار کی باری تھی۔ اُن کے سیکرٹری کو فون کیا گیا۔ پتا چلا کہ وہ لوکھنڈ والا (مہاراشٹر) میں شوٹنگ کر رہے ہیں۔ اُن سے رابطہ کیا گیا تو اُنہوں نے پہلے کہانی سننے کی شرط رکھی۔ جب دلیپ صاحب بمبئی لوٹے تو وجے بھٹ خود دلیپ صاحب کو کہانی سنانے گیا۔ دلیپ صاحب کو کہانی پسند آئی۔ اب معاوضے کی بات طے ہونی تھی۔ دلیپ صاحب نے سوا لاکھ کی مانگ کی۔ وجے بھٹ کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ کچھ بول ہی نہیں پایا۔ دلیپ صاحب نے اُس کی حالت دیکھ کر اُس کا دل رکھنے کے لئے اُس سے کہا کہ معاوضے کے بارے میں پھر سے بات کریں گے۔ وجے بھٹ وہاں سے مایوس ہو کے چلا آیا۔ یہاں بتا دینا ضروری ہے کہ اُنہوں نے سب سے پہلے نوشاد کو اس فلم کی موسیقی ترتیب دینے کے لئے سائن کیا تھا۔ نوشاد دلیپ صاحب سے کافی قربت رکھتا تھا۔ وجے بھٹ نے نوشاد علی سے کہا کہ وہ دلیپ صاحب سے بات کرے۔ نوشاد علی دلیپ صاحب کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کی ضد کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ اس لیے نوشاد علی نے وجے بھٹ سے کہا کہ وہ کیوں اتنے بڑے ایکٹروں کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ میری رائے ہے کہ اس میں نئے ستارے لئے جائیں۔ نئے کردار حقیقی لگیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ فیصلہ لیتے نرگس نے بھی یہ فلم چھوڑ دی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ وجے بھٹ نے نئے ستاروں کی تلاش شروع کر دی۔ مینا کماری اُن ہی کی پیداوار تھی اس لئے سب سے پہلے اُس کو سائن کیا گیا۔ اب ہیرو کا سوال تھا۔ سفید لباس میں ایک نوجوان ہمیشہ وجے بھٹ کے دفتر کے باہر کام کی غرض سے بیٹھا رہتا تھا۔ وجے بھٹ نے اُس کو اُٹھا کر ہیرو بنا دیا۔ چھ ہزار کے معاہدے پر۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ وجے بھٹ نے نوشاد علی کو یہ کہہ کر متحرک کرنے کی کوشش کی کہ یہ اُس کے لئے ایک سنہرا موقع ہے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا۔ وہ جتنی بہترین دھنیں اس فلم کے لئے تیار کر سکتا ہے، وہی دھنیں اس فلم کی کامیابی کی ضمانت ہونگی۔ نوشاد علی نے خوب محنت کی۔ جب یہ فلم 1952 میں ریلیز ہوئی تو اس فلم نے دھوم مچا دی۔ اس کے گانے سر چڑھ کے بولنے لگے۔ اس فلم نے کئی لوگوں کی قسمت بدل دی۔ مینا کماری کو بہترین اداکاری کے لئے ایوارڈ مل گیا۔ بھارت بھوشن ایک چمکتے ہوئے ستارے کی طرح چمکا۔ سب سے زیادہ پزیرائی نوشاد کی ہوئی۔ اُس نے نہ صرف سارے ایوارڈ جیت لئے بلکہ فلمی پنڈتوں کو بھی اپنی خداداد صلاحیتوں کا قائل کر دیا۔ ''بیجو باورا'' کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ یہ فلم ایک ہی تھیٹر میں سو ہفتے چلی۔ اس فلم نے وجے بھٹ کو نمبر ایک ہدایت کار بنا دیا۔

وجے بھٹ اب کے ایک سماجی فلم بنانا چاہتا تھا جس میں سماج کے لئے ایک پیغام ہو۔ دوسرے فلمساز سماج کے سلگتے ہوئے موضوعات پر فلمیں بنا رہے تھے۔ وجے بھٹ بھی اپنے پرانے ڈھرے سے ہٹ کر کچھ الگ بنانا چاہتا تھا۔ اُس نے گجرات کے ایک جانے مانے رائٹر رمن لال وسنت لال ڈیسائی کے ناول کو چنا اور اسے فلمی اسکرپٹ میں ڈھال کر اس کا نام ''پورنیما'' رکھا۔ یہ فلم وجے بھٹ کی گزشتہ فلموں سے بالکل ہٹ کے تھی۔ یہ کہانی ایک طوائف کی تھی جس کی بیٹی شادی کر کے سماج میں عزت کی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ اس کا سنگیت بھی نوشاد نے ہی دیا تھا۔

''پورنیما'' کے بعد وجے بھٹ پھر سے پرانے ڈھرے پر لوٹ آیا۔ اُس نے 1954 میں ایک اور دھارمک فلم ''شری چتنیا مہاپربھو'' بنائی۔ اسی سال اُن کی ایک اور فلم ''رامائن'' بھی نمائش کے لئے پیش کی گئی۔ 1956 میں فلم ''پٹ رانی'' سینما کی زینت بنی۔ اُس کے بعد وہ پھر سے ایک میوزیکل فلم بنانے پر سوچ بچار کرنے لگا۔ وجے بھٹ نے ایک اور گمنام ایکٹر راجندر کمار کو لے کر ایک فلم بنائی جس کا نام ''گونج اُٹھی شہنائی'' جس میں پہلی بار شہنائی وادن اُستاد بسم اللہ خان کو پیش کیا گیا۔ اس فلم کو وسنت ڈیسائی نے سنگیت سے آراستہ کیا تھا۔ یہ فلم بھی بیحد کامیاب رہی۔

وجے بھٹ نے انڈسٹری کو بہت سارے ہیرے دئے۔ سب سے پہلا نام جینت کا تھا جس نے بطور ویلن بہت نام کمایا۔ نوشاد علی کو کامیابی کی بلندی تک پہنچانے والا بھی یہی شخص تھا۔ اُس کے بعد مینا کماری کو ایک اسٹار بنانے میں بھی وجے بھٹ کا ہی ہاتھ تھا۔ اسی طرح بھارت بھوشن اور راجندر کمار فلمی اُفق پر درخشاں ستارے بن کر کئی دہائیوں تک دمکتے رہے۔ منوج کمار جو کہ ایک گمنام ہیرو تھا اُسے شہرت سے ہمکنار کرانے والا وجے بھٹ ہی تھا۔ 1962 میں ریلیز ہونے والی فلم ''ہریالی اور راستہ'' پرکاش پکچرس کے بینر تلے بنی تھی جس میں منوج کمار اور مالا سنہا کو بطور ہیرو ہیروئن پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم کو موسیقی سے شنکر جے

کشن نے آراستہ کیا تھا۔اس فلم کے ایک گانے ''ابتدائے عشق میں ساری رات جاگے ، اللہ جانے کیا ہوگا آگے'' نے فلمی شائقین کو دیوانہ بنا دیا تھا۔فلم نے زبردست کامیابی حاصل کی۔اسی جوڑی کو وجے بھٹ نے 1965 میں فلم ''ہمالیہ کی گود میں'' میں پیش کیا۔یہ فلم بھی زبردست کامیاب رہی۔اسکے بعد اُنہوں نے تین اور فلمیں بنائیں۔1967 کی ''رام راجیہ''۔1971 کی ''بن پھول'' اور آخری فلم 1977 کی ''ہیرا اور پتھر''۔

بہت کم لوگ اس بات کا یقین کریں گے کہ اپنے زمانے کے مشہور فلمساز اور ہدایت کار عبدل رشید کاردار کو پہلا بریک دینے والا کوئی اور نہیں بلکہ وجے بھٹ ہی تھا۔اے آر کاردار جو کہ فارن فلم ڈسٹری بیوٹرس کی فلموں کے پوسٹر بناتا تھا۔یہ وجے بھٹ تھا جس نے اے آر کاردار کو اداکار بنا دیا۔اُس نے اُسے اپنی فلم ''ہیر رانجھا'' میں اداکاری کروائی جو کہ رائل فلم کمپنی کے بینر تلے بنی تھی۔یہ ایک خاموش فلم تھی۔

وجے بھٹ نے رما بھٹ سے شادی کی تھی جس سے اُسکے چار بچے ہوئے۔دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔اُسکا بڑا بیٹا ارون بھٹ ایک کامیاب گجراتی اور ہندی فلموں کا ڈائرکٹر رہا ہے۔اُس نے کل ملا کر چودہ فلمیں بنائیں جن میں نو نے جوبلیاں منائیں۔چھوٹا بیٹا پروین بھٹ ایک کامیاب سینماٹوگرافر بنا۔اُس نے ''معصوم'' اور ''امراؤ جان'' جیسی فلموں کی عکس بندی کی۔پروین بھٹ کے بیٹے وکرم بھٹ نے کئی فلمیں ڈائرکٹ کیں جن میں عامر خان کی ''غلام'' اور مہیش بھٹ کی ''راز'' قابل زکر ہیں۔ارون بھٹ کا بیٹا چرنتن بھٹ ایک کامیاب سنگیت کار جس نے ٹالی وڈ سے لے کے بالی وڈ کی کئی کامیاب فلموں میں سنگیت دیا جن میں ''باس''، ''گبراز بیک''، ''EMI'' اور ''مشن استنبول'' قابل زکر ہیں۔

یہ ہے اُس بیس سالہ نوجوان کی کہانی جو اس مایا نگری میں دل میں ڈھیر سارے خواب لے کر خالی ہاتھ آیا تھا۔قسمت اُس پر ایسی مہربان رہی کہ وہ نہ صرف بے پناہ عزت و شہرت پا گیا بلکہ اُس نے کروڈوں روپے کمائے۔اتنا ہی نہیں وہ کاتب تقدیر بھی بن گیا۔وہ جس کی تقدیر چاہتا تھا بنا بھی سکتا تھا اور بگاڑ بھی سکتا تھا۔اسے کہتے ہیں قسمت۔

''مورتھوٹلے''

سن ۱۸۵۰ سندھ کے صحرا تھر پارکر کیا یک گاؤں عمرکوٹ کے حکمران راجپوت رانا رتن سنگھ سوڈھا نے راج برطانیہ کی جانب سے غریب لوگوں پر لگائے گئے ناجائز لگان کے خلاف ایک بے مثل جدوجہد کی جو راج برطانیہ کی نظر میں بغاوت ٹھہری۔وہ تھر کے صحراؤں میں چھپ کر راج برطانیہ کے خلاف اپنی کارروائیاں کرتا رہا، مگر آخر کار اس کو پکڑ کر قید کر لیا گیا۔اگرچہ ملکہ وکٹوریہ نے علاقے کے بااثر لوگوں کی سفارشات پر اس کو معاف کر کے آزاد کر دیا مگر رانا رتن اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا کہ غریب لوگوں پر اس غیر منصفانہ ٹیکس کا خاتمہ کیا جائے ورنہ وہ انگریزوں کیخلاف کارروائیاں کرنے سے باز نہیں آئے گا۔انگریزوں نے بھی رانا رتن سنگھ کے تیور اور اس کے دوررس اثرات کو سمجھتے ہوئے عظیم باغی کے انجام کو سندھ کی دھرتی کے تمام لوگوں کے لئے ایک عبرت کی مثال بنانے کا تہیہ کر لیا۔ انہوں نے عمرکوٹ کے مشہور قلعے کے بیچوں بیچ رانا رتن کو پھانسی لگانے کے لئے پھانسی گھاٹ کی تیاری شروع کر دی تا کہ تمام لوگ اس کے انجام کو دیکھ کر چپ چاپ ٹیکس دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔جب پھانسی گھاٹ تیار ہوا تو تمام آس پاس کے گاؤں میں اس بات کا اعلان کیا گیا اور رانا کو ان کے سامنے آہستہ آہستہ پھانسی گھاٹ کی اونچی سیڑھیاں چڑھا کر پھانسی کے پھندے کے نیچے کھڑا کیا گیا اور آخری خواہش دریافت کی گئی جس پر رانا نے اپنے بندھے ہاتھوں کو کھولے جانے کا کہا:

ہاتھوں کے آزاد ہوتے ہی رانا نے انتہائی اعتماد کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر ان کی نوکوں کو اوپر کی جانب کیا۔مونچھوں کو بل یا تاؤ دینا برصغیر کے لوگوں کا ایک ایسا انداز ہے جس سے اظہار کیا جاتا ہے کہ انسان کس قدر دلیر اور بے خوف ہے۔ یہ ایک انتہائی درجہ کی خود اعتمادی اور بہادری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس واقعہ پر سندھ کا مشہور لوک گیت ''مورتھوٹلے رانا'' تخلیق ہوا جس میں اس بے مثل تھر پارکر کے دلیر اور بہادر مور کی موت پر ماتم کر کے دکھ غم کا مرثیہ نہیں کہا گیا بلکہ یہ خوشی کا گیت ہے اور عموماً بچے کی پیدائش کے موقع پر گایا جاتا ہے۔اس میں آنگن میں کھیلتے ننھے بچے کو برسات میں بھیگتے مور کے رقص سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس گیت کے اہم بول میں ''ہزاروں رانا رتن جیسے دلیر اور بہادر بچے سندھ کی دھرتی پر پیدا ہونے کا ذکر کیا گیا ہے:

''رانا تو مان راج تھیندا
رانا تو مان لکھ تھیندا''

کا مطلب بھی یہی ہے کہ

رانا، تمہاری ہی حکومت ہوگی
اور تمھارے جیسے ہزاروں ہونگے

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

گلزار جاوید صاحب، آداب وتسلیم۔

چہارسو کے تازہ شمارے کا پی ڈی ایف تو مل گیا لیکن آپ کو تو معلوم ہے کہ میں اپنے تعارف کے تعلق میں تبدیل نہیں کر سکا ہوں۔ اس لیے، تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ الفاظ احساس کا ساتھ نہیں دیتے۔ ساتھ دینے کا التباس پیدا کرتے ہیں۔ یہ جانے ماننے کے باوجود اور کوئی راستہ بھی تو نہیں۔ اس لیے میں انہیں کے ذریعہ اظہار تشکر کرتا ہوں۔ ممنون ہوں کہ آپ نے ۲۰۰۴ء کی ''براہِ راست'' محبت کو زندہ رکھا۔ از حد ممنون۔ اس شمارے کی تعریف میں خودستائی کا پہلو نکلتا ہے۔ اس لیے خاموشی ہی بھلی۔ البتہ ایک بات ضرور عرض کروں گا کہ انٹرویو طویل ہو گیا۔ آپ نے سوالات کی بھی تو یلغار کر دی تھی پھر سوال کی خصلت ہی یہ ہے کہ نہ بدلتے ہیں نہ مرتے ہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں جواب بدلتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے ٹائپ میں متعدد اغلاط راہ پا گئے اور معنی کچھ کے کچھ ہو گئے مثلاً Nothing is new کی جگہ Nothing is men ہو گیا۔ بات تو ٹھیک ہے لیکن ہر سخن مقام۔۔۔ ایک بار مکرر اظہارِ ممنونیت۔

شین کاف نظام (جودھپور)

پیارے گلزار جاوید، السلام علیکم۔

وہ تو کہیے نو تھیں ملکاں سے تصور اقبال صاحب نے ''چہارسُو'' (انٹرنیٹ) کی فوٹو کاپی بھیجی ہے۔ ایک مدت کے بعد ''چہارسو'' کی جھلک دیکھی ہے بقولے دل خوشی سے بلیوں اچھلا۔ رسالے کی ''وجودیت'' کا مزہ کچھ اور ہے۔ فوٹو کاپی ہی دیکھیں تھیں اور دیپک کنول کا مضمون چیتن آنند۔ آپ نے مقطع کی سخن گسترانہ بات مجھے ثاقب سے ثابت کر دیا ہے۔ یہ بھی کیا بات ہوئی۔ آپ نے میرا خط بھی ڈالا ہو گا۔ انٹرنیٹ کے تمام اظہار کی فوٹو کاپی مشکل تھی۔ آپ جانیں میں دیپک کنول کے مضامین شوق سے پڑھتا ہوں درمیان میں ناغہ ہو گیا۔ بہرطور اب چیتن آنند سے متعلق پڑھ کر پچھلی کمی کچھ پوری ہوئی۔ غزلوں میں احباب کا کلام دیکھا۔ وہی ہیں اپنے پرانے دوست۔ جون ایلیا مخصوص قرینے کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل کی کشش خاص انداز کی ہے۔ دعا یہی ہے کہ ''چہارسو'' کی پرانی صحت بحال ہو۔ چہرے کی تازگی اور جسم کی خوبی وہی پہلے جیسی ہو۔ بہرنوع آپ نے رسالے کو اپنے خون پسینے کا آب بقا پلا رکھا ہے۔ یہ جوانِ جہاں تابندہ و پائندہ رہے گا۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

برادر مکرم جاوید صاحب، آداب ونیاز۔

چہارسو کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا حسب دستور جگہ جگہ رنگوں کی دھنک بکھری ہوئی تھی۔ یہ میری تنہائیوں کا ساتھی ہے اگرچہ موجودہ وبائی ماحول کی وجہ سے وہ لطف تو اب نہیں رہا کہ نیم دراز ہو کر کمر کو ٹیک لگا کر اور کتاب کو ہاتھ میں لے کر پڑھنے میں جو لطف آتا تھا وہ تو اب ناپید ہے اور مجھ جیسے عمر رسیدہ فرد کے لیے کمپیوٹر کی روشنی ولشکارے کی وجہ سے پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے مگر چہارسو کا جو اپنا مزہ ہے اس لیے پڑھے بغیر چین بھی نہیں آتا۔

سب سے پہلے تو یہ عرض کروں کہ نگار سجاد ظہیر صاحبہ کا تبصرہ جو کسی غازی صاحب کی کتاب ''میزان انتقاد وفکر'' پر ہے بہت زوردار ہے مگر انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ یہ غازی صاحب کون ہیں، یا یہ میری کم نظری ہے کہ میں ان کو نہیں پہچان سکا۔ دوسرے یہ کہ عجب اتفاق ہے کہ شکاف نظام صاحب سے مجھ سے دو باتیں بہت مشترک ہیں ایک تو یہ کہ میں اور وہ دونوں ''جے جے ویروں کی دھرتی راجستھان'' کے مشہور شہر جودھ پور میں پیدا ہوئے اور دوسرے یہ کہ ہم دونوں کا پیدائشی سن بھی ایک ہی ہے یعنی ۱۹۴۵ء۔ بس یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ادبی میدان میں جو معرکے انہوں نے سر کیے ہیں وہ میں نہیں کر سکا۔ ان کے کارناموں کی جو فہرست انعام الحق صاحب نے کئی صفحات پر مرتب کی ہے وہ انتہائی متاثر کن ہے۔ نظام صاحب ہندوستان میں ''شب خون'' سے لے کر پاکستان کے ''اوراق'' جیسے موقر جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کے فن پر انور سدید، کالی داس گپتا رضا اور نند کشور اچاریہ جیسے پایہ کے ادیبوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ عطیہ سکندر علی نے ان کی شاعری کے چنیدہ اشعار کو قارئین سے متعارف کروایا ہے۔ شارے میں شین کاف نظام کا مضمون ''خالق خلق'' جو کبیر کے حوالے سے ہے گہرے فلسفے کا احاطہ کرتا ہے اگرچہ میں نے پڑھا مگر وہ میرے لیے ثقیل تھا۔ ویسے بھی میں اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہندو فلسفے سے میری زیادہ واقفیت نہیں اگرچہ میں یہ جانتا ہوں کہ ہندو فلسفہ بے حد گہرائی رکھتا ہے۔

افسانوں میں رضیہ اسماعیل کے افسانے کا انداز تحریر بڑی حد تک عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم کی یاد دلاتا ہے۔ شموئل احمد کا افسانہ ''مور کے آنسو'' بھی کمال کی چیز ہے۔ میں نے اسے دو دفعہ اور بڑے غور سے پڑھا مگر اس کے انداز اور اس کی تکنیک سے میں بہت متاثر ہوا مگر چونکہ میں یونانی دیومالائی حقیقت سے زیادہ واقف نہیں ہوں اس لیے میں اسے سمجھ نہیں سکا۔ اس افسانے میں بھارتی معاشرے میں دلتوں کے ساتھ ہونے والے سلوک نے مجھے چونکا دیا۔ تابش خانزادہ کا افسانہ، نصرت شمسی، سلمیٰ صاحبہ کے افسانچے بھی اچھے ہیں۔ رینو بہل کا افسانہ ''مجازی خدا'' ایک ایسی تحریر تھی جس کا انداز بہت دلکش تھا میں نے سوچا تھا کہ میں اسے سرسری طور پر پڑھ کر پھر کبھی فرصت میں پڑھوں گا مگر یہ اس قدر دلچسپ تھا کہ میں اسے چھوڑ نہیں سکا اور پڑھتا ہی چلا گیا مگر۔۔۔ اس کا انجام جو کہ چونکا دینے والا تھا اور قاری کو ایک جھٹکا لگاتا ہے وہ کچھ زیادہ نہیں بھایا یا یوں سمجھئے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی ہیروئن جو

اتنی آئیڈیل تھی کہ وہ محبت کے دریا میں بہہ جانا چاہتی تھی۔۔۔کیا اس قدر چال باز تھی کہ اس نے وہ فارم بیچ کر بے چارے کو ایک ہی رات میں کنگال کر دیا؟

چہارسو میں ایک ناول ''خاکِ شفا'' شائع ہو رہا ہے وہ اردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل کرے گا۔ اس قسط میں شروع کے تین صفحوں پر دلّی کے کرخنداروں کی آپس کی نوک جھونک نے مزہ دے دیا مگر اس میں کہانی کو آگے بڑھانے کی کوئی بات نہ تھی مگر آخری صفحات میں کمال کی دلیری اور ہمت کے ساتھ جنسی بے راہ روی کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے وہ ذہن کو شدید جھٹکا لگاتے ہیں۔ آلِ انوار صاحب کا قلم بہت زوردار ہے اور انہیں دلّی کے اصلی باشندوں کی زبان و رہن سہن اور اچھی و بری عادتوں سے خوب آگہی ہے۔ دیپک کنول کا چیتن آنند پر مضمون معلوماتی ہے۔ آپ نے جو علمی و ادبی شمع جلائی ہے اللہ کرے ہمیشہ روشن رہے۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

برادرم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

شین کاف نظام کے قرطاسِ اعزاز والا شمارہ موصول ہوا۔ کافی دن کچھ اپنی اور کچھ لیپ ٹاپ کی خرابی کی وجہ سے یہ شمارہ ڈاؤن لوڈ نہ کر سکا۔ قسمت نے آج دونوں کے ساتھ یاوری کی اور میں نے بالآخر کافی کوشش کے باوجود تقریباً سارے کا سارا شمارہ ڈاؤن لوڈ کر کے پرنٹ بھی کر لیا۔ پھر پڑھ بھی لیا مگر اپنے گھریلو معاملات کے ساتھ ساتھ کچھ غیر ضروری مصروفیات میں اتنا ضروری مصروف ہو گیا۔ اللہ کرے ابھی اتنی تاخیر نہ ہوئی ہو کہ پرچہ مکمل ہو کر پریس جانے کے لیے تیار ہو چکا ہو۔ یاسمین حمید نمبر کے معاملے میں شاید یہی ہوا تھا، مجھے یاد تو پڑتا ہے کہ آپ کو کچھ چیزیں بھیجی تھیں مگر فہرست دیکھی تو ندارد، ظاہر ہے میری اس تاخیری عادت کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔

تازہ شمارے میں قرطاسِ اعزاز کے تحت جناب شین کاف نظام کے ساتھ آپ کی براہِ راست گفتگو بے حد عمدہ اور ادبی زرخیزی سے مالا مال لگی، سچ پوچھیے تو گذشتہ کئی شماروں کے مقابلے میں یہ گفتگو ادبی لحاظ سے بھی اور اس لحاظ سے بھی کہ یہ بیشمار ادبی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے، ایسی اہم ہے کہ میں نے یہ صفحات پرنٹ کرنے کے بعد اپنی فائل میں لگا لیے ہیں کہ کئی موضوعات پر لکھتے ہوئے اس مکالمے کے اقتباس کی ضرورت پڑے گی۔ میں شین کاف نظام کو ایک مدت سے پڑھ رہا ہوں خاص طور پر جب میں جدہ میں تھا تو وہاں ہندوستان کے رسائل بھی موصول ہوتے تھے اور ان میں سے اکثر میں ان کا نام ان کی تحریر پر جگمگا رہا ہوتا تھا۔ اب ان کی کتابیں تلاش کر کے بارِ دگر اُن کی تحریریں پڑھوں گا۔

جناب فیصل عظیم کی نعتِ رسولِ مقبولؐ پوری کی پوری ایک کیف و جذب میں ڈوبی ہوئی ہے اور اس کی زبان بھی عام شعری لہجے سے ذرا منفرد لگی۔ ڈاکٹر رؤف خیر کی حمدِ باری تعالیٰ کا یہ شعر حاصلِ حمد لگا اگرچہ پوری حمد ہی اچھی ہے:

ہمارے ہاتھ میں چابی ہے اسمِ اعظم کی
وہ کوئی در ہو ، کھُلا لا اِلٰہ اِلّا اللہ

ڈاکٹر فیروز عالم کا افسانہ 'مجھے کیا بُرا تھا مرنا' اگرچہ مختصر تھا مگر بے حد بھرپور اور تادیر تاثر چھوڑنے والا۔ پردیس میں ایک تنہائی زدہ ضعیف عورت اپنے فلیٹ میں مر جاتی ہے تو تین دن تک ہمسایوں کو خبر ہی نہیں ہوتی، اور آخر جب اس کے فلیٹ سے بدبو پھیلنے لگی تو تب ایمرجنسی کے عملے نے آ کر اس کی لاش برآمد کی۔ مجھے سعودی عرب کے شہر جدے کا ایک سچا واقعہ یاد آ گیا (ان دنوں میں پاکستان میں تھا)، ایک بہت فعال ریڈیو سے منسلک پاکستانی شاعر کی فیملی پاکستان شفٹ ہو گئی تھی اور وہ اپنے فلیٹ میں ایسی ہی تنہا زندگی گزار رہے تھے، اور اسی ضعیفہ کی طرح ان کی وفات کی خبر بھی تین چار دن کے بعد بو پھیلنے سے ملی۔ حالانکہ اُن کے کچھ قریبی دوست اُسی فلیٹ کے ساتھ والے فلیٹوں میں رہتے تھے اور اُن سے مرحوم کا قریبی میل جول بھی تھا، مگر! بس ہمارا معاشرہ ہی اتنا مصروف اور اتنا بے حس ہے کہ موبائل پر تو دنیا بھر کی خبر رکھتا ہے مگر خود اپنے اِرد گرد کے بارے میں وہ لاعلم رہتا اور باخبر نہیں رہنا چاہتا۔

دوسرا افسانہ جناب تابش خانزادہ کا تھا جس کا عنوان ''کوڑا کباڑ'' پڑھ کر میں سمجھا وہ ان دنوں جن دیگر موضوعات پر لکھ رہے ہیں یہ بھی انہی میں سے ایک ہو گا، مگر پڑھا تو حیرت ہوئی کہ انتہائی مختصر افسانے میں انہوں نے کتاب کی اہمیت پر بڑے سلیقے سے روشنی ڈالی اور افسانے کی ٹریٹمنٹ بھی عام افسانوں سے یکسر مختلف تھی اس لیے پڑھنے میں بھی ایک تجسس کی کیفیت برقرار رہی۔

آخر میں کچھ غزلوں کے اچھے شعر بھی لکھ رہا ہوں اگرچہ مجھے احساس ہے کہ خط کچھ طویل ہو گیا ہے (مگر سابقہ نانغے کا حساب بھی تو پورا کرنا ہے!):

ترے اس حال پر ہے سب کو حیرت
تجھے بھی اس پہ حیرت ہے؟ نہیں تو
ہم آہنگی نہیں دنیا سے تیری
تجھے اِس پر ندامت ہے؟ نہیں تو

(جون ایلیا مرحوم)

جینا مشکل ہے حکومت والو
بھاؤ چیزوں کے گھٹائے جائیں

(آصف ثاقب)

فقیری میری فطرت ہے فقیرانہ لبادہ ہے
یہ کچھ اللہ کی قدرت ہے کہ سلطانی نہیں جاتی

(پرتپال سنگھ بیتاب)

اس سے مل کر بھی ہمیں اچھا نہیں لگتا ہے اب
جھوٹے لفظوں سے ہم اُس کی کیسے دلداری کریں

(اشفاق حسین)

آخر چپ کا روزہ رکھنا پڑ جائے گا
آخر کتنا شور مچایا جا سکتا ہے

(واصف حسین واصف)

یہ کائنات کی گردش کہیں تھمی تو نہیں
کوئی ستارہ کہیں صبح و شام چل رہا ہے
(نبیل احمد نبیل)

اک دودھیا ہتھیلی پہ رنگِ حنا کا عکس
انگشت میں لگن کی نشانی ٹنگی ہوئی
(شکیل جعفری)

جب مصائب میں تھے بوسیدہ مکانوں کے مکیں
حوصلہ بن کر پھر ان کے پاس آیا کون تھا
(نوید سروش)

سوچنا بھی فضول عادت ہے
سوچتا ہوں کبھی کبھی تو میں
(اسد شوکت)

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

گلزار صاحب، السلام علیکم۔

تاخیر سے آپ کو لکھ رہا ہوں، معافی چاہتا ہوں۔ شین کاف نظام کے نام قرطاس اعزاز نظر سے گزرا۔ آپ یہ خاص نمبر ز نکالنے کے لئے جتنی محنت کرتے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ سریتا جوشی کا مضمون پاپا جی بہت پسند آیا۔ انہوں نے اپنے پاپا جی کو شین کاف نظام سے الگ کر کے دیکھا اور ہمیں دکھایا۔ ''برہمن'' کے بارے میں ہم بہت کچھ جانتے تھے، لیکن نظام صاحب کی زبانی برہمن کی خاص تعریف و تشریح معلوم ہوئی۔ نظام صاحب ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کے اشعار زندگی سے بھرپور ہیں:

پہلے زمین بانٹی تھی پھر گھر بھی بٹ گیا
انسان اپنے آپ میں کتنا سمٹ گیا

فیروز عالم کا افسانہ ''مجھے کیا بُرا تھا مرنا'' امریکہ میں ضعیف لوگوں کی عام کہانی ہے۔ امریکہ کیا، اب تو پاکستان ہندوستان کی بھی یہی کہانی ہے۔ تابش خانزادہ کا افسانہ ''کوڑا کباڑ'' پسند آیا۔ ہم اسی غم میں گھلے جا رہے ہیں کہ ہمارے بعد ہماری کتابوں کا کیا ہوگا۔ نئی نسل تو اردو سے بے بہرہ ہے۔ ضرور یہ کتابیں ری سائیکل میں چلی جائیں گی۔

چہارسو کے ذریعے اپنا سفر جاری رکھیے۔ اللہ مددگار ہو۔

جمیل عثمان (یو ایس اے)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

تازہ چہارسو (جلد ۳۰، شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۲۱ء) پرچہ اپنی ادبی روایت کے ساتھ آن لائن مطالعے کے لیے دستیاب ہوا۔ خطوط کے بعد ''براہِ راست'' کا پڑھنا واجب ٹھہرا۔ میرا شین کاف نظام سے پہلا تعارف ہے اور اس کا فریضہ اور اعزاز بھی آپ ہی کے نام۔۔۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے تیز و منفرد سوالات کے شین کاف نظام صاحب نے بڑی وضاحت سے جوابات دیے ہیں۔ اُن کی شاعری کی ہیئت، تکنیک یعنی بحر، وزن، ماترائیں وغیرہ اردو، ہندی اور انگریزی ادب اور علم نجوم کا مطالعہ وسیع ہے جو اُن کے جوابات اور اُن پر لکھے گئے مضامین سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شین کاف نظام کی تنقید پر مضمون پڑھنے اور ان کی فکر و فن کے تجزیے کے بعد یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ ان کے ہاں عمرانی تنقید کا عکس نمایاں ہے وہ اپنے عہد میں رہ کر ادب اور ادیب کے حالات پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ نظام صاحب کی صاحب زادی سریتا جوشی نے اپنے والد کا خاکہ پاپا جی۔۔۔ سچائی، بے تکلفی اور فراخ دلی سے تحریر کیا ہے پڑھ کر لطف آ گیا ہے۔ محمد انعام الحق آنے ''اڑانوں کے منظر'' کے عنوان سے صاحبِ قرطاس کا خاکہ ادبی کامیابیوں اور کتابوں کی اشاعت کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید مرحوم کی ابتدائی تحریر نظام صاحب کے فکر و فن کو دریا کو کوزے میں بند کرنے والی بات ہے۔ عطیہ سکندر علی نے ''زیست کا آنگن'' میں نظام صاحب کی غزلوں کا انتخاب لاجواب کیا ہے

مرے اندر جو اندیشہ نہیں ہے
تو کیا میرا کوئی اپنا نہیں ہے
نگاہوں پر نگہبانی بہت ہے
نوازش ظلِ سبحانی بہت ہے
پکڑنا انہیں کچھ ضروری نہ تھا
پرندے سبھی آشیانوں کے تھے

مجھے نظام صاحب کی نظموں نے زیادہ متاثر کیا۔ زوہا عمار نے انتخاب بھی خوب کیا ہے ''دُعا میں سے نکلتا ہے''، ''آمد''، ''سوت کا سکوت'' اور ''سمندر'' کے حوالے سے نظمیں دل میں اُترتی محسوس ہوتی ہیں۔ اشراق الاسلام ماہر، مخمور سعیدی اور عادل رضا منصوری کے مضمون ہی پڑھ سکا ان تحریروں سے نظام صاحب کی تنقید، شعری نظریہ اور ادبی فکر کی تفہیم ہوتی ہے۔

رینو بہل کا افسانہ ''مجازی خدا'' پُر اثر ہے۔ پورے افسانے میں قاری محو نہیں رہتا ہے مگر اختتام میں دھچکا بلکہ دھکا لگتا ہے وہ اپنا دل پکڑ کر رہ جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے زندگی میں۔۔۔ بہت خوب۔ شموئل احمد کا افسانہ ''مور کے آنسو'' دل کو زخمی اور روح کو بے چین کر گیا۔ نہ جانے ایسا ظلم کب تک ہوتا رہے گا۔ فیروز عالم تو کمال کے لکھاری ہیں ہر تحریر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ''مجھے کیا بُرا تھا مرنا'' موضوع پر گرفت اور بیان کی سادگی لاجواب ہے۔ رضیہ اسماعیل صاحبہ نے ''زبیدہ آپا'' کا مظلوم کردار بیان کر کے خواتین پر ہونے والے ظلم کی ترجمانی کی ہے بامحاورہ زبان نے الگ لطف دیا۔ نصرت شمسی کا افسانہ ''کفارہ'' بھی متاثر کرتا ہے۔

اشفاق حسین، احمد سوز، فریاد آزر، نبیل احمد نبیل، ڈاکٹر ریاض احمد، ڈاکٹر انیس الرحمان، ڈاکٹر نزہت شاہ، انجم جاوید، زیبا سعید، اسد شوکت کی

غزلوں کے اشعار گہرے مشاہدے اور جدید فکر کے آئینہ دار ہیں۔

منفرد ہونے کی تھوڑی سی اداکاری کریں
ایک فتویٰ ہم بھی اپنے عشق کا جاری کریں
(اشفاق حسین)

سارے معروضے کالعدم ٹھہرے
انکشافات کا زمانہ ہے
(احمد سوز)

بات دونوں کے درمیاں تھی جب
کیسے اہلِ جہاں تک پہنچی
(انجم جاوید)

سوچنا بھی فضول عادت ہے
سوچتا ہوں کبھی کبھی تو میں
(اسد شوکت)

ناول کی دوسری قسط کیا ہے معلومات کا خزانہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے اور جملوں نے ادبی تاریخ کے واقعات یاد دلائے ہیں۔ پھر بامحاورہ زبان اور روزمرہ نے کیا لطف دیا کیا رنگ جمایا ہے کچھ داستانی انداز بھی دل کو بھا رہا ہے۔ خلیفہ عبدالرشید، نواب شبّن مرزا، خلش دہلوی، بانکے مرزا، نوروچائے والا، قاضی صاحب کے کردار پر خاصی محنت کی گئی ہے۔ حاجرہ اور چھوٹے پیر صاب، قاضی صاحب کے حجرے والا واقعہ کسی حقیقت نگاری سے رقم کیا ہے آخری فقرے دیکھئے۔

''معصوم حاجرہ چھوٹے پیر صاب کو مخاطب کر کے بولی، اب پھلاؤتا۔۔۔!'' (ص ۸۷)

زبان اور لہجے پر گرفت اور علاقوں کی ثقافت کا علم دیکھئے

''پنجابی کا معدہ، گجراتی کی جیب اور دلی والے کی زبان جب تک تر نہ ہو اُس وقت تک اُس کا دماغ آمادۂ کار نہیں ہوتا۔'' (ص۔۹۴)

ڈاکٹر رؤف خیر کی ''حمد'' اور فیصل عظیم کی نعتِ رسولؐ عقیدت کے ساتھ حقیقی مقصد کی ترجمان ہیں۔

مقصدِ پیش و پس، ہر نفس کیا ہے، بس!

عبداللہ جاوید کی ''موئن جوڈارو'' اور ایوب خاور کی نظم ''عارضی دنیا کے ٹھیکے داروں کے لیے'' تاریخی پس منظر میں خوب صورت تخلیق ہیں جو دعوتِ فکر دے رہی ہیں اور یہ فکر انسان کی بقا اور دنیا کی بہتری کی ہے۔

نوید سروش (میرپور خاص)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب، سلام۔

شین کاف نظام صاحب کا انٹرویو دلچسپ تھا مگر خاص کر سچے فنکار کے لیے جو مثال انھوں نے میلے میں بچھڑے بچے کی دی، وہ دل میں اتر گئی۔ ان کی غزلیں خوب ہیں اور وہ شعر کہ ''لبِ دریا زباں سے تر کریں گے/ ابھی تلوار میں پانی بہت ہے''، کیا مضمون آفرینی ہے۔ اور جو انتخاب ان کا کالی داس گپتا رضا صاحب نے مضمون کے آخر میں دیا ہے، پڑھ کر لطف آ گیا۔ نظام صاحب کا بھگت کبیر پر مضمون بہت وقیع اور معلومات افزا ہے۔ اس میں کبیر میں اوروں کے اور اوروں میں کبیر کے خوب خوب رنگ جھلکتے نظر آئے۔ ایک بات بحیثیت طالب علم پوچھنا چاہتا ہوں کہ ''عام و عوام'' جو بار بار انھوں نے لکھا، یہاں ''عام'' اور ''عوام'' میں واحد اور جمع کے علاوہ کیا فرق ہے کہ اس اصطلاح کی ضرورت پیش آئی اور کیا یہ ان کی ایجاد ہے؟

افسانوں میں رضیہ اسماعیل کا ''یا وحشت'' اچھا تھا مگر اختتام باقی افسانے کا ساتھ نہ دے سکا۔ شموئل احمد کا ''مور کے آنسو'' سماج کی خوب تصویر کشی کرتا علامتی افسانہ ہے۔ وحشی سعید کا ''ہمارے شہر کا چوک'' بھی کچھ اسی قبیل کا افسانہ ہے، گوزاویے مختلف ہیں۔ تابش خانزادہ کا ''کوڑا کباڑ'' خوب تھا، اختتام اچانک ہوا اور اچھا ہی ہوا۔ مشتاق اعظمی کا ''فیوز'' بھی زبردست موڑ پہ ختم ہوا۔ سلمیٰ صنم کے بعض افسانچے بھی اچھے تھے۔ امّید ہے یاسر رسول نے ''ڈھول کا پول'' سخت طنز کے پیرائے میں ہی لکھا ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ بہت لوگ اسے اس کے متن ہی کے تناظر میں نہ سمجھ بیٹھیں۔ جون ایلیا کی غزل ''۔۔۔نہیں تو'' پہ تعریف میں کیا کہا جائے۔ اس بار غزلوں کے کئی اشعار اچھے لگے جن میں فریاد آذر، شیوشرن بندھو، ڈاکٹر نزہت شاہ، نوید سروش اور انجم جاوید صاحبان کی غزلیں اور زیبا سعید اور اسد شوکت کے بعض اشعار شامل ہیں۔ نظموں میں جناب ستیہ پال آنند کی ''شہرِ شورانگیز'' اور جاناں ملک کی ''نظم کا کچھ بھی نام نہیں'' اچھی تھیں۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

گلزار بھائی، السلام علیکم۔

گرمیوں کے الوداعی دنوں کی ابتداء ہوئی ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کی آمد ہے ایسے میں دل چاہتا ہے کہ شام کا وقت ہو چائے کی پیالی ہاتھ میں ہو اور کوئی بہترین تصانیف سے مزین معیاری رسالہ ہمارے ہاتھ میں ہو اور ہم نظریں جمائے دنیا و مافیا سے بے خبر اچھی اچھی تحریروں سے لطف اندوز ہوں ابھی انہی ریشمی خیالوں کی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف تھے کہ پی ڈی ایف کی صورت میں چہارسُو کا تازہ شمارہ آنکھوں کے سامنے تھا بس پھر کیا تھا چائے بنائی، آئی پیڈ لیا اور بیک یارڈ کا رُخ کیا کُرسی سنبھالی ٹیبل پہ چائے کا کپ رکھ کر چہارسُو کی پی ڈی ایف کھولی خوبصورت سرِ ورق پہ نظر پڑی شام کے ڈھلتے سائے کے پس منظر کے ساتھ ایک بارعب، پُر جوش، باوقار اور چہرے پہ تفکرات کے نقش لیے چہرہ نظر آیا آگے تفصیل پڑھنے پر پتہ چلا کہ شین کاف نظام کی اعلیٰ شخصیت کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کے لیے یہ بزم آرائی ہوئی ہے یہ نام میرے لیے نیا تھا اگرچہ محترم ادب کی دنیا کے جائے مانے اور پہچانے ہوئے ہیں اور ایک نامی گرامی شخصیت کے مالک ہیں لیکن ہماری ہی کم علمی کہ ایک علم و ادب کی نامور ہستی سے محروم رہے مگر جوں جوں آگے پڑھتے گئے ہم جیسے ناقص العلم کے سامنے نظام صاحب کی گراں قدر ادبی خدمات کے بیش بہا انکشافات رونما ہوتے رہے آپکے

بارے لکھنے والوں نے دل کھول کر اظہارِ رائے کا استعمال کیا اور بہترین مضامین سے بزمِ چہارسُو کو سجایا لیکن سُریتا جوشی کا مضمون پاپا جی تو لاجواب ہی رہا اور اسی طرح گُلزار بھائی کا مضمون براہِ راست تو براہِ راست ہی دل پہ اثر کرتا ہے اتنا بہترین مواد پڑھنے کو ملا کے پڑھتے پڑھتے وقت کا پتہ ہی نہیں چلا اور ہم نے می رقصم سے لیکر لسانی زاویے تک پورا کا پورا شمارہ پڑھ ڈالا ہر مصنف اور شاعر نے شاہکار تحریر رقم کی تمام لکھنے والوں کو مجھ ناچیز کی جانب سے بہت بہت دلی مبارک باد اور گُلزار بھائی کا تہہ دل سے شکریہ کہ جن کی بدولت میں بھی چہارسُو کے قارئین سے متعارف ہوئی اور ہر ماہ پابندی سے مجھے رسالہ ارسال فرماتے ہیں۔

ڈاکٹر نزہت شاہ (نیویارک)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ اردو اور ہندی غزلوں کے مشہور شاعر اور نقاد شین کاف نظام سے موسوم ہے جو اس حوالہ سے ہندو پاک میں یکساں مقبولیت رکھتے ہیں۔ آپ نے ان کی ادبی خدمات کے پیشِ نظر خصوصی شمارہ شائع کر کے انہیں جو خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

شمارہ اچھے افسانوں، مضامین اور خوبصورت شاعری سے مزین کیا گیا ہے۔ رضیہ اسماعیل صاحبہ نے ''یاوحشت'' کے عنوان سے افسانہ لکھ کر معاشرہ میں کچھ افسوس ناک حالات اور واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ بڑے دکھ کی بات ہے کہ وطنِ عزیز کے شہروں اور دیہاتی علاقوں میں بعض مجبور اور غریب لوگ جعلی اور ناتجربہ کار معالجوں دائیوں وغیرہ کے ہاتھوں اپنی جان گنوا بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح عورتوں کے ساتھ گھریلو تشدد کے واقعات عام ہیں اور ان کی دادرسی یا عوامی آگاہی کا کوئی موثر طریقہ نظر نہیں آرہا۔

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب نے وطن سے دور دیارِ غیر میں حالات اور واقعات پر آپ بیتی کی طرح تحریر رقم کر کے دونوں صورتوں کا ایک تقابلی جائزہ بیان کیا ہے۔ ہماری روایات اور اخلاقیات پر مغربی ممالک میں قائم رہنا خصوصاً اگلی نسل کے لیے ایک نہایت مشکل مسئلہ ہے۔ بہت سے لوگوں کو سالوں بعد یہ کہتے سنا ہے کہ کاش ہم اپنا وطن یوں مستقل طور پر نہ چھوڑتے۔ صرف اعلیٰ تعلیم یا مجبوری کی صورت میں ہی وطن سے دور جانا مناسب ہے۔ یہاں بزرگ والدین کو زیادہ توجہ اور خلوص ملتا ہے جبکہ مغرب میں اولاد انہیں Old Homes میں چھوڑ آتی ہے اور مہینوں کے بعد کہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے چکر لگاتے ہیں۔

رینو بہل کا افسانہ ''مجازی خدا'' دلچسپ پیرایہ میں تحریر کیا گیا ہے۔ فیس بک پر ایک جذباتی صاحب نے جو شادی شدہ اور دو بچوں کے معمر بات بھی تھے ایک خوبصورت نوجوان غیر شادی شدہ لڑکی سے دوستی کر لی اور نوبت شادی تک آ پہنچی جس کے لیے انہوں نے پہلی بیوی سے دباؤ اور پھر کچھ شرائط مان کر رضامندی حاصل کی لیکن شادی کی پہلی رات ہی جو ڈرامہ ہوا اس کے بعد وہ کفِ افسوس ملتے رہ گئے اور جو پاس تھا وہ بھی کھو بیٹھے۔ اس میں ایک سبق یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنی حیثیت اور حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غیر ذمہ دارانہ رویوں سے پرہیز کرنا چاہیے اور کبھی بھی سرخ لکیر عبور نہیں کرنی چاہیے۔

''خاکِ شفا'' انوار زادہ صاحب کی تحریر انتہائی دلچسپ پیرایہ میں آگے بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے اگلی قسط کا انتظار رہتا ہے۔ دلی کی اردو عوامی محاورے، اشارات وغیرہ کے علاوہ قاضی صاحب، پیر صاحب، خلیفہ صاحب، بانکے مرزا کے کردار بھی کہانی کو خوب متحرک رکھتے ہیں۔

''کفارہ'' میں نصرت شمسی صاحب نے اپنے وطن اور مغربی ممالک میں وطن سے دور رہنے والوں کی زندگی اور حالات کا منظر نامہ بہت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ تابش خانزادہ صاحب کا افسانہ ''کوڑا کباڑ'' مختصر مگر دلچسپ اور سبق آموز تحریر ہے۔ کہتے ہیں ''علم بڑی دولت ہے'' مگر بڑے زمیندار تاجر وغیرہ دولت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں اور علم کی قدر و قیمت سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں علم کی کتابیں محض کوڑا کباڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کہانی میں ایسا ہی ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

شاعری میں بھی عمدہ کلام شامل کیا گیا ہے۔ خصوصاً رؤف خیر، فیصل عظیم، افق فریدی، ارشد سعید، انیس الرحمٰن، نیاز جیراجپوری، فہیم اختر، رئیس صدیقی، پرتپال سنگھ بیتاب، عبداللہ جاوید اور یوسف خاور کا کلام متاثر کن ہے۔

اس سارے ادبی مواد کو ترتیب دے کر ایک خوبصورت صورت میں قارئین کی نذر کرنے پر آپ بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

شین کاف نظام صاحب کے نام اور کام کو کون نہیں جانتا لیکن آج میں اعتراف کرنا چاہوں گی کہ ''براہِ راست'' میں آپ کے انوکھے سوالات اور ان لاجواب جوابات نے ذہن و دل کو روشن کر دیا۔ دیر تک میں اُس کے سحر میں گرفتار رہی۔ دل سے صرف ایک بات نکلی کہ جو کچھ بھی اس کے بارے میں لکھا جائے گا وہ ناکافی ہوگا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے مجھے بے آواز کر دیا۔ اسی طرح اُن کا کبیر پر لکھا مضمون پڑھ کر بھی اُن کے مطالعے، تحقیق اور ذہانت کی داد دیے بنا نہیں رہ سکتی۔ اُن کی گرفت اردو زبان ہی نہیں، ہندی اور سنسکرتی پر بھی بہت مضبوط ہے۔ انہوں نے قدیم روایتوں کو ماننے والے براہمن پریوار میں آنکھیں کھولیں اور جس مذہبی ماحول میں پرورش پائی اور اُس کے باوجود اردو ادب کی دنیا میں نہ صرف اپنا لوہا منوایا بلکہ اپنے والد صاحب کو بھی قائل کر لیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ کالی داس گپتا رضا صاحب نے بھی اپنے مضمون میں اعتراف کیا ہے کہ راجستھان کے صحرا کا ادب گُل بُوٹوں میں بدلنے میں نظام صاحب کا ہاتھ سب سے زیادہ ہے۔ مخمور سعیدی صاحب نے بھی اپنے مضمون میں نظام صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو پر روشنی ڈالی ہے البتہ سریتا جوشی کا لکھا ''پاپا جی'' پڑھ کر تشنگی رہ گئی۔ بیٹی چونکہ باپ کے لیے سب سے قریبی رشتہ ہوتی

ہے ان کے بارے میں اُن کی شخصیت کے بہت سے روپوش پہلو کو روشناس کر سکتی تھیں۔ اُن پر لکھے باقی مضامین اور شاعری بھی قابل داد ہے۔ غرض یہ کہ نظام صاحب کو پہنچانتی تو بہت پہلے سے تھی مگر بھرپور گوشہ نکالنے اور اُسے پڑھنے کے بعد وہ ستارے کی مانند کیوں چمکتے ہیں، کیوں انہیں قائل کرنا مشکل ہے کیوں ان سے داد وصول کرنا دشوار ہے۔ اُن کے معیار تک پہنچنے کے لیے ابھی ہمیں بہت لمبا سفر طے کرنا ہوگا۔ گلزار صاحب آپ کا شکریہ آپ کی خواہش کی بدولت ہمیں ایک اور صفِ اوّل میں کھڑی ہستی سے متعارف کرانے کا۔

اس شمارے میں شامل سبھی افسانے دلچسپ ہیں۔ رضیہ اسماعیل کا افسانہ ''یاوحشت'' مردوں کے ظلم اور عورتوں کی بے بسی کی کہانی بیان کرتا ہے تو فیروز عالم صاحب کی کہانی بیرون ملک میں گئے لوگوں کی اپنی مٹی سے جڑا ہونے کی تکلیف اور تنہائی اور وہاں کے بزرگوں کی بدحالی کو بڑے دردمند انداز میں دل کو چھو جاتا ہے۔ شموئل احمد کا ''مور کے آنسو'' ملک کی بدحالی اور دلت لوگوں سے بدسلوکی کی حقیقی صورت حال بیان کرتی ہے۔ کہانی کی شروعات ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ مشتاق اعظمی کی ''فیوز'' کا اختتام پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دیر تک اُس کہانی کو میں اپنے ذہن سے نہیں نکال پائی۔ جو کہانی ذہن اور دل پر نقش چھوڑ جائے یقیناً وہ کہانی قابلِ ذکر اور قابل داد ہوتی ہے۔ جڑوں سے بچھڑ جانے کا درد بلراج بخشی کی ''اے اے او'' اور ''کفارہ'' میں نصرت شمسی نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ کشمیر کے حالات سے جڑی وحشی سعید کی کہانی بھی پڑھ کر دل اُداس ہو گیا۔ بہت کم افسانچے ایسے پڑھنے کو ملتے ہیں جو بامعنی اور بھرپور ہو مگر سلمیٰ صنم کے تینوں افسانچے دلچسپ ہیں اور سانپ کو میں لاجواب کہہ سکتی ہوں۔

''خاکِ شفا'' کی بابت ایک شبہ سا ہے۔ اس ناول کا اندازِ بیان گلزار جاوید صاحب کی طرح ہی ہے۔ پہلے تو اسے پڑھ کر شک ہوا مگر پھر ادیب کا نام اور جگہ دیکھ کر یقین کرنا پڑا۔ دوسری قسط میں کہانی دھیمے دھیمے آگے بڑھ رہی ہے۔ اندازِ بیان ڈرامائی اور دلچسپ ہے، محاوروں کا استعمال بھی کثرت سے ہے اور زبان بھی بڑی کمال کی استعمال کی گئی ہے۔ کہانی کے اہم کردار چھوٹے پیر صاحب کی مدرسے میں کی گئی حرکت اور جس انداز سے اس باب کا اختتام کیا ہے وہ لاجواب ہے۔ اگلی قسط پڑھنے کا اشتیاق بڑھ گیا ہے۔

شاعری کے حصے میں حسبِ معمول ڈاکٹر ریاض، نوید سروش، فرخندہ شمیم، سبھاش گپتا اور دیگر شاعرات کی غزلیں پڑھ کر اچھا لگا۔ ستیہ پال آنند صاحب کی نظم ایک عرصے بعد چہارسو میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ نیاز جیراجپوری اور وشال کھلر کی نظمیں پڑھی نہیں گئیں (بیک گراؤنڈ ڈارک ہونے کی وجہ سے) اور سبھی نظمیں کمال کی ہیں۔

ایک بات اور بتائیے، آپ فلر کہاں کہاں سے تلاش کر کے لاتے ہیں؟ فلر دلچسپ بھی ہوتے ہیں اور معیاری بھی۔

چیتن آنند اور کچھ مضامین پڑھنے ابھی باقی ہیں۔ اس پر پروین شیر کی غیر حاضری بھی اچھی نہیں لگی۔ ایک بات کہتی چلوں کہ چہارسو اپنے نام پر کھرا اترا ہے اور اس کی خوشبو چہارسو پھیل چکی ہے۔ دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ آپ اسی طرح لگے رہیں اور بھرپور ادبی اور معیاری رسالہ پڑھنے کو دیتے رہیں۔

رینو بہل (چندی گڑھ)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو ہمیشہ کی طرح اجالا پھیلاتا ہوا ہمیں سکرین پر نظر آیا اور دنیا میں چہارسو پھیلے ہوئے ہمارے ادیبوں کی کہانیاں اور غزلیں، نظمیں اور مضامین پڑھنے کو ملے۔ آیئے ان پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ سب سے پہلے بڑی ادبی شخصیت اور دانشور شین کاف نظام سے تعارف حاصل ہوا۔ ہمارے علم میں اضافے کا باعث بنا۔ بے شمار کتابوں کے مصنف سے آپ نے جو سوالات کیے ان کے جوابات ہمارے بہت سے سوالوں کا جواب تھے خاص طور سے اردو ہندی کے بارے میں۔ انہوں نے جس طرح خود اعتمادی سے جواب دیا ہمیں بھی حوصلہ ہوا کہ اردو قائم رہنے والی زبان ہے۔ برہمن ذات کے بارے جو تشریح انہوں نے کی وہ ہمارے لیے نئی معلومات نہیں۔ ان کی نظم سمندر بہت خوبصورت ہے۔ یہ ایک خوبصورت سلسلہ ہے بڑے دانشور اور مصنفوں سے ملاقات کا۔

اب آتے ہیں ناول ''خاکِ شفا'' کی طرف ابھی دوسری قسط ہے۔ پڑھنے میں قاری کی دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے۔ دلّی والے اپنی زبان بھولتے جا رہے ہیں مگر مصنف نے اس زبان کو انتہائی مہارت سے پیش کیا ہے۔ مدرسے جو ہماری نئی نسل کو پروان چڑھانے میں مؤثر کردار ادا کرنے کے لیے بنائے گئے تھے گھٹیا قسم کے قاضی جیسے لوگوں کی زیرِ قیادت آ کر تباہ و برباد ہو کر رہ گئے۔ معصوم نسلوں کے اندر گندگی کا زہر بو دیا۔ یوں ناول میں یہ سب دکھا کر مصنف ایک مقصد کی طرف بڑھ رہا ہے۔

تمام افسانے اپنی جگہ بہت اچھے ہیں۔ رینو بہل کا افسانہ ''مجازی خدا'' معاشرہ میں ہونے والے ایک جرم کی کہانی تھی جس کا شکار ہو کر لوگوں نے عزت، دولت اور اپنا خاندان تک کھو دیا۔ بات نئی نہیں مگر اندازِ بیان نے اسے خوبصورت سبق آموز بنا دیا۔ وہ ایک اچھی مصنفہ ہیں۔ فیروز عالم کا افسانہ ''مجھے کیا بُرا تھا مرنا'' یہاں کی زندگی کا تکلیف دہ روپ پیش کیا ہے۔ بہت سارے لوگوں کی حقیقت یہی ہے۔ ''یاوحشت'' خوف زدہ عورت ہمیشہ دکھ اور وحشت کا شکار رہتی ہے مگر اس حصار سے نکلنا مشکل ہے۔ رضیہ اسماعیل کا اچھا افسانہ ہے۔ ''کوڑا کباڑ'' اور ''مور کے آنسو'' اچھے افسانے ہیں۔ سارے افسانے پڑھ نہیں سکی۔ ''کفارہ'' اچھی کہانی تھی مگر اتنی آسانی سے ایک عورت اپنے شوہر کو چھوڑ کر واپس نہیں جاتی۔

ایک صدی کا قصہ حسبِ معمول دل چسپ اور معلوماتی رہا۔ غزلیں بھی پسند آئیں۔ جمیل عثمان نے جو رابندر ناتھ ٹیگور کا اردو ترجمہ کیا ''مندر مت جاؤ'' پسند آیا۔

رعنا کوثر (نیویارک)

..... غنیمت کے اختصارے .....

اکرم کنجاہی صاحب ہمارے عہد کے انتہائی فعال اور اہم ادیب اور شاعر ہیں۔اُن کے چار شعری مجموعے ''ہجر کی چتا''، ''بگولے رقص کرتے ہیں''، ''محبت زمانہ ساز نہیں'' اور ''دامن صد چاک'' تحقیق وتنقید کے باب میں ''راغب مرادآبادی، چند جہتیں''، ''نسائی ادب اور تانیثیت''، ''لفظ زبان اور ادب''، ''غزل کہانی''، ''مابعد جدیدیت اور چند معاصر متغزلین'' اور ''بس جدیدیت (لہجے اور اسلوب)''، فنِ تقریر کے حوالے سے ''اُصول تقریر''، ''فنِ خطابت'' جب کہ ترتیب وتدوین، فکروفن اور شعری مجموعہ وغیرہ پانچ کتابیں اشاعت کے مراحل میں ہیں۔

نئی کتاب ''غنیمت کے اختصارے'' پیش نظر ہے کتاب میں اکرم کنجاہی صاحب کے وہ تبصرے اور مختصر تجزیے شامل ہیں جو انہوں نے ''غنیمت'' (رسالے) میں مدیر اور مبصّر کی حیثیت سے نذرِ قرطاس کیے ہیں۔کتاب ''غنیمت'' سلسلہ نمبر 1 (جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء) سے لے کر ''غنیمت'' ۲۵۔۲۶ (جنوری تا جون ۲۰۱۹ء) میں جو نظم ونثر کی کتابوں پر تبصرے اور تجزیے تنقیدی صداقت سے تحریر کیے وہ کتاب میں شامل ہیں۔

اکرم کنجاہی صاحب نے جن نظم ونثر کی اہم کتابوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی تعداد ایک سو چالیس (۱۴۰) ہے اس سے ہم اُن کے مطالعے اور ادبی فعالیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔جب کہ تخلیقی وتنقیدی کام بھی جاری ہے۔ان تبصروں کو جنہیں مصنف نے کتابی صورت میں ''اختصارے'' کا نام دیا ہے ہم بہت سی اہم کتابوں کے موضوع اور مغز سے واقف ہوتے ہیں۔

رسالہ ''غنیمت'' گجرات کے فارسی و پنجابی کے معروف شاعر محمد اکرم غنیمت کی یاد میں زمان کنجاہی نے ۱۹۷۰ء میں لاہور سے جاری کیا۔رسالے کی اشاعت میں تسلسل نہیں رہا۔اب محمد اکرم کنجاہی اسے کراچی/گجرات سے اس کی اشاعت کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔محمد اکرم کنجاہی کی یہ کتاب بہت اہم ہے۔

..... نوید سروش

اشاعت:۲۰۲۱ء، دستیابی: رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی

..... پہلی صورت .....

طارق ارسلان طارق اپنی ''پہلی صورت'' لئے پنجہ آزمائی کرتے آپ کے سامنے ہیں۔میں نے کہا ''خالق'' اور ''مخلوق'' میں حد فاصل ہے،اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہماری جتنی بھی صورتیں ہوں ''ازلی خالق'' کی ''پہلی صورت'' کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔

طارق کی ''پہلی صورت'' ان کا تعارف ہے جس میں فن کے اسرار ورموز کے حوالے سے یقیناً کہیں کہیں کمی نظر آئے گی۔مگر محنت، ریاضیت اور اخلاص سے وہ فن کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زن ہوں گے تو تمام نقص خود بخود دور ہوتے جائیں گے۔اور ایسا ہونا امکان میں ہے ضرورت اس امر کی ہے طارق پورے خلوص سے آگے بڑھتا جائے تو وہ دن دور نہیں کہ اسے وہ مقام حاصل ہو جائے جو ہمارا مقصود ہے۔

سرِدست ''پہلی صورت'' میں کئی اشعار متاثر کرنے کی صلاحیت سے بھرپور اور کچھ اشعار اپنے اندر حیرت کی دنیا آباد کیے ہوئے ہیں جبکہ کچھ اشعار موزونیت اور معقولیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔میری دعا ہے کہ ''پہلی صورت'' اہلِ نظر میں اپنے قد کو ثابت کرے اور آگے چل کر طارق کے لیے حوصلہ بخش ثابت ہوتا کہ اس سے اس کی نئی نئی ''صورتیں'' تازہ سخن لیے منصۂ شہود پر آئیں۔(آمین)

..... اقرار مصطفیٰ

اشاعت:۲۰۲۱ء، قیمت:۳۵۰ روپے، دستیابی: کمال پبلشرز، لاہور۔اوکاڑہ۔کمالیہ

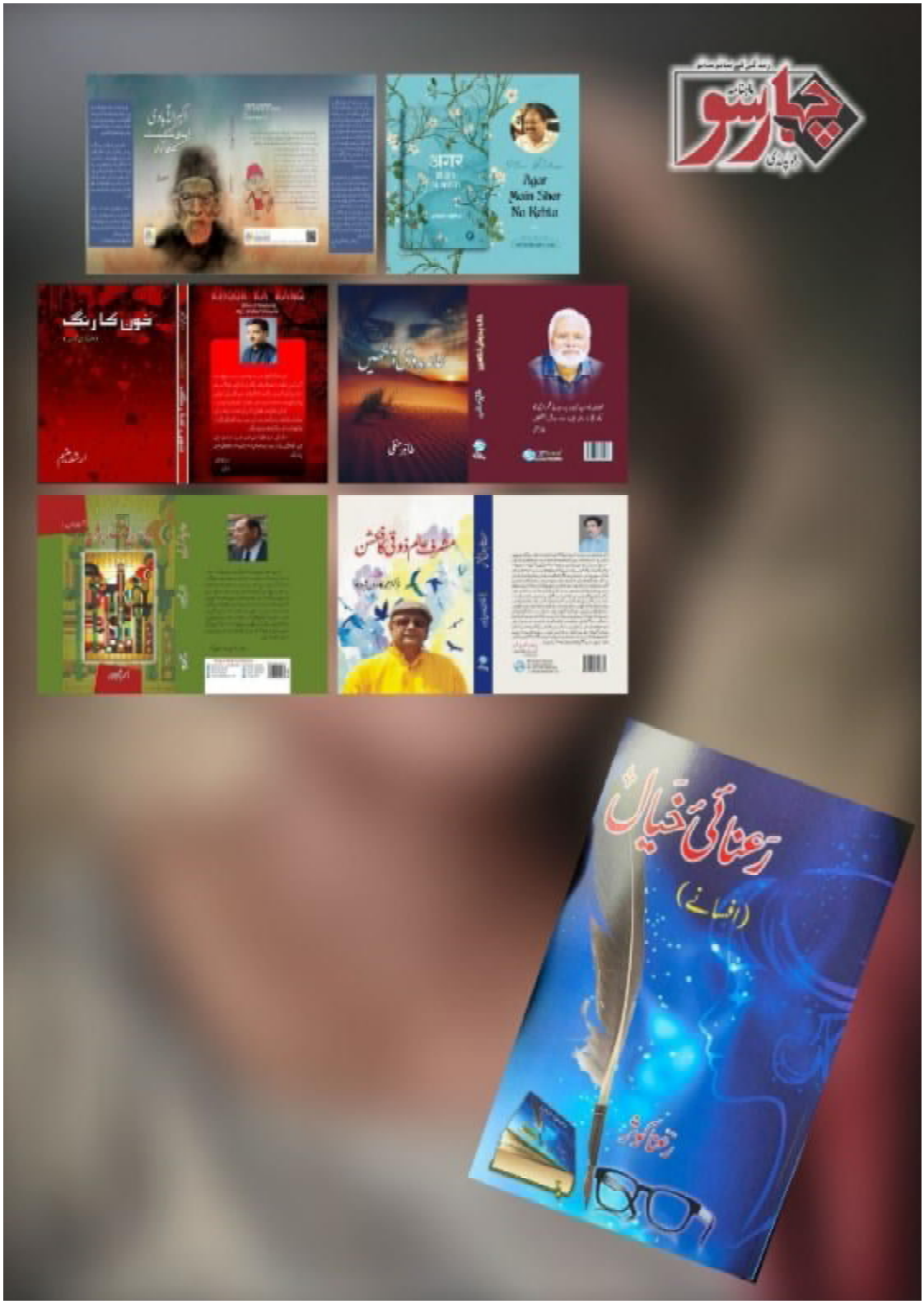

چہارسو
Agar
Main Sher
Na Kehta
خون کا رنگ
رعنائی خیال
(افسانے)